حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ 120 خطبات کا مجموعہ

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

۵

مرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق زیر نگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

خطباتِ حکیم الاسلام

جلد — ۵

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر۔ کراچی۔ پاکستان

شانِ بعثت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَـاوَسَنَدَنَـا وَمَوْلَانَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـــا بَعْـــدُ!فَقَدْقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَۃً، وَلَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا ①. وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا . ②وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ .اَوْکَمَا قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ③

حرفِ آغاز......بزرگانِ محترم !اس وقت میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تین حدیثیں آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہیں، ان تینوں احادیث میں تین بنیادی مقاصد ارشادفرمائے گئے ہیں۔پہلی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شان بیان فرمائی گئی ہے۔کہ آپ کس رنگ کے ساتھ مبعوث کیے گئے۔کون سی شان لے کرآپ دنیا میں تشریف لائے۔تو ایک بعثت کی شان اوراس کی صفت کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔دوسری دو روایتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض وغایت بیان فرمائی گئی ہے کہ آپ کوکیوں مبعوث کیا گیااوروہ کیامقاصد تھے،جن کو لےکرآپ دنیامیں تشریف لائے۔اس تقریر کاموضوع دواجزاء پر مشتمل ہے۔پہلا جزشان بعثت کہ آپ کارنگ کیاہے؟ دوسراجزیہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے کیامقاصد متعین تھے؟وہ جبھی صحیح طور پر سامنے آسکیں گے جب ان کی اصل اور بنیاد پر روشنی ڈالی جائے،اس واسطے ابتدامیں بطورتمہید کے میں چندکلمات گزارش کروں گااس کے بعداحادیث کی تفسیران کاموضوع اوران کامعنی انشاءاللہ واضح ہوجائیں گے۔

کلماتِ تمہید......حق تعالیٰ شانہ،سارے کمالات کاسرچشمہ ہیں۔ساری برکات اورساری نعمتیں انہی کی ذات میں ہیں۔انہوں نے دنیامیں تمام نعمتوں کوبھیجا۔حق تعالیٰ کی صفات دوقسم کی ہیں:ایک جلالی صفات ہیں اورایک جمالی۔جلالی صفات جیسے شانِ قہر،شانِ غضب،شانِ انتقام یہ تمام جلالی صفات کہلاتی ہیں اور جمالی صفات جیسے

① الصحیح لمسلم،کتاب البر والصلۃ والآداب، باب النھی عن لعن الدواب وغیرھا، ج:۴ ص:۲۰۰۶ رقم:۲۵۹۹. ② السنن لابن ماجہ، المقدمۃ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم ج:۱ ص:۲۶۵.
③ السنن الکبریٰ للبیھقی،کتاب الآداب، باب بیان بیان مکارم الاخلاق ومعالیھا، ج:۱۰ ص:۱۹۱.

رزاقی، انعام واکرام اور تربیت، یہ تمام جمالی شانیں کہلاتی ہیں، غرض صفات خداوندی دو نوع میں منقسم ہیں۔ ایک جلالی شانیں اور ایک جمالی شانیں ہیں۔

جمالی شانوں کا سرچشمہ رحمت ہے اور جلالی شانوں کا سرچشمہ غضب ہے تو ساری صفات مل کر دو نوع میں آجاتی ہیں، ایک رحمت کے نیچے ایک غضب کے نیچے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے''۔

حدیث میں ہے کہ عرش عظیم کے اوپر اللہ نے ایک لوح رکھی ہوئی ہے، جس کی بڑائی زمینوں اور آسمانوں کے برابر ہے، اس پر ''اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ'' ① میری رحمت میرے غضب کے اوپر غالب ہے میری رحمت میرے غضب پر سابق ہے، جب رحمت اور غضب کا مقابلہ ہوتا ہے تو رحمت آگے آگے چلتی ہے اور غضب پیچھے رہ جاتا ہے، تو عرش عظیم کے اوپر یہ بطور دستاویز کے لکھ کر رکھ دیا ہے۔

تختِ شاہی...... عرش عظیم وہ تخت شاہی ہے۔ احکام خداوندی عرش سے جاری ہوتے ہیں جس کو فرمایا گیا: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ ② ''کہ تمام امور کی تدبیر عرش سے ہوتی ہے، اس لئے عرش تخت شاہی ہے اور ساری کائنات اس کے نیچے''۔

اس کائنات کو دیکھا جائے یہ زمینیں، آسمان، جنتیں ان سب سے اوپر جا کر عرش کا سلسلہ ہے تو مخلوقات عرش تک جا کے ختم ہو جاتی ہیں۔ عرش کے اوپر کسی مخلوق کا وجود نہیں ہے، بجز اس تختی کے جو اوپر رکھی گئی ہے، جس پر لکھ دیا گیا ہے کہ:

دستاویزِ رحمت...... ''اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ'' صرف اس مخلوق کے سوا اوپر تجلیات ربانی ہیں اور صفات الٰہیہ کا وہ مرکز ہے تو عرش عظیم گویا پایہ تخت خداوندی ہے جس سے دنیا میں تدبیر امر ہوتی ہے اور احکام چلتے ہیں۔ اس عرش پر رحمت کو غالب کر دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام احکام میں رحمت کا غلبہ ہے اور اللہ نے اپنے بندوں سے جو تعلق قائم فرمایا ہے وہ شان رحمت سے قائم کیا ہے، اگر کہیں شان غضب سے تعلق قائم کرتے تو مخلوق کا وجود باقی نہ رہتا مخلوق پامال ہو جاتی، غضب اور قہر کے سامنے کیا چیز ٹھہر سکتی تھی تو بندوں سے جو رشتہ قائم فرمایا، وہ صفت رحمت سے قائم فرمایا صفت غضب سے نہیں۔

غضب تو تنبیہ کرنے اور سزا دینے کے لئے ایک وقتی چیز ہے، لیکن دوامی چیز جو تمام باتوں پر چھائی ہوئی ہے وہ رحمت کی شان ہے۔ اسی واسطے فرمایا گیا: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی.﴾

''رحمٰن عرش کے اوپر چھا گیا''۔ اور عرش ساری کائنات پر چھایا ہوا ہے اور عرش کے اوپر رحمٰن چھایا ہوا ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ساری کائنات پر رحمٰن شان رحمت سے چھایا ہوا ہے۔ یعنی ساری کائنات کے اوپر رحمت غالب

① الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب وکان عرشه علی الماء وهو رب العرش العظیم: ج:٦ ص: ٢٧٠٠ رقم: ٦٩٨٦. ② پارہ: ١١، سورۃ یونس، الآیۃ: ٣.

ہے، یہ نہیں فرمایا کہ:

"اَلْجَبَّارُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی یا" " اَلْقَهَّارُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی."

اس کا مطلب یہ ہوتا کہ کائنات پر غضب چھایا ہوا ہے، اگر غضب چھایا ہوا ہوتا تو کائنات کا وجود ہی باقی نہ رہتا بلکہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی رحمٰن عرش کے اوپر چھایا ہوا ہے، یعنی صف رحمت عرش کے اوپر چھا گئی اور عرش ساری کائنات کے اوپر چھایا ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ عرش پوری کائنات پر اس طرح سے ہے جس طرح ایک قبہ ہوتا ہے جس طرح خوان بنا کر اس کو آپ خوان پوش سے ڈھانپ دیں اور وہ سارے خوان پر چھا جائے۔ اس طرح سے پوری کائنات پر مثل قبہ کے چھایا ہوا ہے اور اس پر رحمت چھا گئی ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ رحمت ساری کائنات پر چھا گئی ہے، تو رحمٰن عرش پر چھا گیا اور عرش کے اوپر دستاویز لکھ کر رکھ دی کہ میری رحمت میرے غضب کے اوپر غالب ہے۔

محلِ عرش...... پھر عرش کو کس چیز پر قائم کیا؟ حدیث میں بھی موجود ہے اور قرآن کریم میں بھی فرمایا گیا ہے:

﴿وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ﴾ ① "عرش کو پانی کے اوپر قائم کیا ہے"۔

حدیث میں ہے کہ وہ ایک عظیم سمندر ہے، جس کی ایک ایک موج زمینوں اور آسمانوں کے برابر ہے اس سمندر پر عرش قائم ہے، اگر رحمت کو مجسم بنایا جائے تو پانی کی شکل اختیار کرے گی۔ جس طرح غضب کو اگر جسم دیا جائے تو وہ آگ کی صورت بن جائے گا۔

جب کوئی شخص مہربان ہوتا ہے اور رحم وکرم کرتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ: فلاں شخص پانی پانی ہوگیا، یعنی اس پر شان رحمت غالب آگئی۔ اور محبت غالب آگئی اور اگر کوئی غضب ناک ہوتا ہے اور غصہ میں ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں آدمی آگ بگولہ ہوگیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غضب کو آگ سے مناسبت ہے اور رحمت کو پانی سے نسبت ہے تو عرش کو اللہ تعالیٰ نے پانی کے اوپر قائم فرمایا۔ اگر آگ پر قائم فرماتے تو معلوم ہوتا کہ غضب زمین ہے اس کے اوپر عرش کو قائم کیا۔ پانی کے اوپر قائم کیا اور پانی شان رحمت کی صورت مثالی ہے تو گویا عرش کے نیچے بھی رحمت ہے اور اوپر بھی رحمت ہے، عرش پانی پر قائم ہے اور پانی شان رحمت کی صورت ہے۔ تو عرش رحمت کے اوپر قائم ہوا۔ عرش پر رحمٰن چھا گیا یعنی صفت رحمت چھائی ہوئی ہے، عرش کے اوپر تختی لکھ کر رکھ دی کہ میری رحمت غضب پر غالب ہے تو دستاویز بھی رحمت کی ہے گویا عرش کے اوپر بھی رحمت نیچے بھی رحمت۔

قیامت میں غلبہ رحمت...... حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: حق تعالیٰ نے اپنی شان رحمت سے سو رحمتیں عالموں کے لئے پیدا فرمائیں، جن میں ایک رحمت اس دنیا میں اتاری ہے۔ اس رحمت کا اثر ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں پر رحم کھاتے ہیں جانور اپنے بچوں پر رحم کرتے ہیں، دوست دوست پر رحم کرتا ہے۔

---

① پارہ: ۱۲، سورة الهود، الآية: ۷.

عزیز عزیزوں پر رحم وکرم کرتے ہیں۔ یہ صرف ایک رحمت کا اثر ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اپنی مخلوق پر رحم وکرم فرماتا ہے۔ رزق دے رہا ہے، بارشیں آ رہی ہیں، نعمتیں مل رہی ہیں۔ یہ سب ایک رحمت کا اثر ہے، ننانویں رحمتیں جو ہیں ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ: وہ اپنے عرش کے نیچے چھپا کر رکھی ہوئی ہیں۔ قیامت کے دن ایمان والوں پر وہ رحمتیں کی جائیں گی تو اندازہ کیا جائے کہ قیامت کے دن کتنی رحمتیں ہوں گی جب ایک ہی رحمت کا اثر یہ ہے جو پوری دنیا میں نمایاں ہے تو ان ننانوے رحمتوں کے آثار کیا ہوں گے جو قیامت کے دن ایمان والوں پر کی جائیں گی، حیلوں پر مغفرت کی جائی گی، ذرا ذرا سے بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نجات دی جائے گی، گناہ گاروں پر شفقتیں کی جائیں گی، وہ ننانویں رحمتیں وہاں کام آئیں گی تو حاصل یہ نکلا کہ عرش کے اوپر بھی رحمت، نیچے بھی رحمت، پانی رحمت کی صورت مثالی اور ننانویں رحمتیں عرش کے نیچے چھپائی ہوئی ہیں۔ تو عرش گویا رحمت سے ڈھانپا ہوا ہے۔ اوپر سے نیچے تک رحمت ہی رحمت چھائی ہوئی ہے۔ اور "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" اور اللہ شان رحمت سے عرش کے اوپر چھا گیا ہے تو ساری کائنات پر رحمت غالب ہے۔

شانِ رحمت کا اثر...... اور اس شان رحمت کا اثر شان ہدایت ہے، اللہ کی رحمت متوجہ ہوئی تو بندوں کی ہدایت کا سامان کیا۔ بندوں کے لئے راہنمائی فرمائی کہ خیر کی طرف چلیں اور شر سے بچیں، بھلائی کی طرف آئیں اور برائی سے اپنے آپ کو بچائیں۔

یہ اسی شان رحمت کا اثر ہے، اگر بندوں کے اوپر رحمت وشفقت نہ ہو تو بھلائی کی طرف راہنمائی کیوں کریں؟ اگر کسی سے دشمنی کا تعلق ہو تو دشمن کو کون اچھا راستہ دکھلاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ اور جا کے جہنم میں جھک جائے جلدی سے ہلاک ہو۔ جب دشمن ہی ٹھہرا، دوست کو راہنمائی کی جاتی ہے کہ کسی برائی میں مبتلا نہ ہو۔ ماں باپ اپنے بچے کے دوست ہوتے ہیں اس کی راہنمائی کرتے ہیں کہ بیٹا یہ کام کرو اور یہ مت کرو۔ یہ تمہارے لئے بھلائی کی بات ہے اور یہ برائی کی بات ہے۔ یہ رحمت وشفقت ہی کا اثر ہوتا ہے استاد اگر اپنے شاگردوں کو پڑھاتا ہے تو اسی شان شفقت کا اثر ہوتا ہے اگر استاد کو طالب علموں سے دشمنی ہو جائے وہ طالب علموں پر کیوں محنت کرے گا؟ نہ کتاب پڑھائے گا، نہ راہنمائی کرے گا، نہ مسائل بتائے گا تو شفقت اور رحمت کا اثر ہوتا ہے، جو راہنمائی کی جاتی ہے۔ سب سے بڑا رحمت کا ظہور ہدایت ہے کہ سیدھی اور بھلائی کی راہ بتلا دی جائے۔

سب سے بڑی دعاء...... اسی شان ہدایت کے تحت حق تعالیٰ شانہ، نے انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں بھیجا۔ وہ اللہ کی ہدایت ہیں جو اسباب کے ذیل میں نمایاں ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا ہدایت کرنا، یہ اللہ کا ہدایت کرنا ہے۔ یہ اس کی رحمت کا ظہور ہے۔ تو ہدایت سب سے بڑی چیز ہے۔

سورہ فاتحہ جس کو قرآن عظیم فرمایا گیا ہے اور نماز کی ہر رکعت میں اس کو پڑھا جاتا ہے اس سورہ کا نام "سُوْرَةُ

الْمَسْئَلَةِ'' بھی ہے، یعنی سوال کرنے کی سورت۔ اس میں سوال کیا گیا ہے؟ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ [1] ''ہدایت دے دیجئے، سیدھے راستہ کی''۔ یہ ہے سب سے بڑی دعاء جو سورۂ فاتحہ میں منگوائی گئی ہے۔

سورۂ فاتحہ کی ابتداء میں حق تعالیٰ شانہ، کی صفات کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ رب العٰلمین ہے۔ ''رَحْمٰنٌ وَ رَحِيْم ہے۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' ہے، معبود ہے جس کی عبادت کی جاتی ہے۔ آگے بندگی کی شان فرمائی گئی ہے کہ بندہ کا کام یہ ہے کہ معبود کے آگے جھکے، بھیک مانگے، سوال کی دعا یہ بتلائی گئی کہ: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ گویا بندے مکلف اور مامور کئے گئے ہیں کہ پانچوں نمازوں میں یہ دعا کریں۔ جب فاتحہ پڑھیں گے یہ دعا آئے گی۔ فرائض کے بعد سنتیں پڑھے تو پھر فاتحہ کے ذریعہ یہ دعا مانگے۔ نفلیں پڑھے یا تہجد پڑھے یہ دعا مانگے غرض جتنی نمازیں فرض، واجب، سنت اور نفل، یہ دعا سب میں لازم ہوگی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑی اہم دعا ہے، ہدایت کا مانگنا کوئی بہت اہم چیز ہے۔

بظاہر ایک سوال ہوتا ہے کہ فاتحہ جس کو ''سورة المسئلة'' کہا گیا ہے۔ اس میں کوئی ذرا اونچی دعا منگوائی جاتی کہ یا اللہ! ہمیں جنت عطا کر دیجئے، یا اللہ ہم سے راضی ہو جایئے، اپنی رضا عطا کر دیجئے، ہمیں اپنے عرش کے سائے میں جگہ دیدیجئے، یہ تو معمولی سی دعا ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو ساری دعاؤں کی جڑ بنیاد یہی دعاء ہے اس واسطے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیدھا راستہ دکھلا دیجئے تو جب سیدھا راستہ مل گیا تو آدمی اس پر چل پڑا، رضا خود بخود حاصل ہوگئی۔ بے راہ رو کو رضا حاصل نہیں ہوتی سیدھے راستہ پر پڑ گئے تو جنت خود بخود حاصل ہوگئی، بے راہ چلتے تو جنت نہ ملتی سیدھے راستہ پر پڑ گئے تو جنت خود بخود حاصل ہوگئی، بے راہ چلتے تو جنت نہ ملتی سیدھے راستہ پر چل پڑے تو عرش کے سائے میں بھی جگہ خود بخود مل گئی۔ اگر آدمی بدراہ ہوگا۔ عرش کا سایہ نہیں ملے گا، تو جتنی بڑی سے بڑی دعا ہو سکتی تھی، اور جتنا بڑے سے بڑا مقصد ہو سکتا تھا وہ سب اس دعا سے حل ہوتا ہے اصل میں ہدایت ہے، ہدایت ہوگئی تو رضا بھی ملی جنت بھی ملی عرش کا سایہ بھی ملا اور انبیاء علیہم السلام کی مرافقت بھی ملی۔ ساری نعمتیں دستیاب ہوگئیں۔ اور اگر خدانخواستہ ہدایت نہ ملے تو نہ جنت نہ عرش اگر آدمی ضلالت اور گمراہی پر ہو تو کہیں سے کوئی نعمت دستیاب نہیں ہو سکتی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ سب سے بڑی نعمت ہدایت ہے۔ اس لئے سورہ فاتحہ میں دعا منگوائی گئی کہ ہدایت کی دعا مانگو کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھلا دیجئے دل کی کلیں درست ہوگئیں، دل کا راستہ درست ہوگیا، تو دنیا و آخرت کی ہر نعمت مل گئی۔

ثمرۂ دعاء...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ.''

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جو صنوبری شکل کا ہے، اگر وہ درست ہے تو سارا انسان درست

[1] سورة الفاتحة.

ہے اگر وہ غلط ہے تو سارا انسان غلط ہے اور وہ گوشت کا لوتھڑا ''دل'' ہے اگر دل درست ہے تو سارا انسان درست ہے اور اگر دل خراب تو سارا انسان خراب ہے۔ اور دل کب درست ہوتا ہے جب دل کی کلیں درست ہوں، دل کا راستہ درست ہو دل میں ہدایت موجود ہو، دل میں ضلالت اور گمراہی موجود نہ ہو، تب دل درست ہوتا ہے، تو سارے انسان کی درستگی قلب کی ہدایت پر موقوف نکلی۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کوئی بہت بڑی عظیم نعمت ہے اس لئے یہاں دعا منگوائی گئی کہ: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ ''ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت دے دیجئے''۔

اور وہ صراط مستقیم کونسا ہے؟ ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ''جن پر آپ نے انعام کیا، ان کا راستہ''۔ اور وہ کون ہیں، جن پر انعام کیا گیا؟ وہ انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صلحاء ہیں تو ان کا راستہ مطلوب ہے۔ ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ ''جن پر آپ کا غضب وقہر نازل ہوا ان کا اور گمراہوں کا راستہ ہمیں نہیں چاہئے''۔ ان کا راستہ چاہئے جن پر آپ کا انعام ہوا، وہ آپ کی رحمت کے نیچے ہیں۔

تو سب سے بڑی دعا جو فاتحہ میں منگوائی گئی وہ ہدایت کی دعا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت اتنی بڑی نعمت ہے کہ ساری نعمتیں اس کے تابع ہیں اور ضلالت سب سے بڑی گمراہی ہے کہ ساری مصیبتیں اس کے تابع ہیں، اس لئے فاتحہ جو قرآن کریم کا خلاصہ ہے اس میں ہدایت کی دعاء رکھی گئی جو فاتحہ کا خلاصہ ہے، تو سارے قرآن کا خلاصہ ہدایت نکل آتی ہے۔

نعمتِ عظمٰی...... اسی واسطے سورہ بقرہ سے جب قرآن کریم کا آغاز کیا گیا اور کہا گیا کہ: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ ① ''وہ کتاب ہے جس میں کوئی کھٹکا نہیں''۔

اس کی شان یہ فرمائی گئی کہ: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ ''یہ کتاب متقین کے لئے ہدایت ہے''۔ یہ تو سب سے بڑی نعمت کتاب اللہ ہے، کتاب اللہ کی سب سے بڑی نعمت جو بنیاد ہے وہ ہدایت ہے۔ تو فاتحہ میں ہدایت مانگی گئی ہے۔ جو حق تعالیٰ شانہ، کی رحمت عرش پر چھائی ہوئی ہے۔

اور رحمت کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ بندوں کی ہدایت کا سامان کر دیا۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام وہ ہدایت لے کر آئے۔ انبیاء علیہم السلام کا بھیجا جانا خود مستقل ایک انعام نکلا۔ اس سے بڑھ کر عالم میں کوئی نعمت نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر انبیاء علیہم السلام دنیا میں نہ آئیں، آدمی کو آدمی بننا میسر نہیں ہو سکتا، انسان کو انسان انبیاء علیہم السلام نے بنایا ہے۔ ورنہ انسان تو گھوڑوں اور ڈنگروں کا ایک مجموعہ ہے، جو آپس میں ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ ایک دوسرے کے درپے آزار ہوتا ہے۔ جانور، جانور کے ساتھ وہ بدسلوکی نہیں کرتا، جو انسان انسان کے ساتھ کرتا ہے، تو انسان اگر انسانیت پر نہ آئے تو سب سے بڑا درندہ یہ ہے، سب سے خونخوار غضبناک بھی یہ ہے اس کو جو جانور کی حد سے نکال کر انسانیت میں داخل کیا ہے وہ انبیاء علیہم السلام ہی نے تو کیا ہے انہی کی

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۔

تعلیمات کا تو اثر ہے کہ آدمی آدمی بنتا ہے، جب ان کی تعلیمات کسی جگہ ختم ہو جاتی ہیں، وہیں انسان گھوڑوں اور ڈنگروں میں شامل ہو جاتے ہیں، جہاں تعلیمات آئیں وہیں آدمیت آجاتی ہے، تو آدمی کی آدمیت ہدایت پر موقوف ہے، اور ہدایت انبیاء علیہم السلام کے آنے پر موقوف ہے۔ تو نبیوں کا آنا ایک عظیم نعمت نکلی اور کل انبیاء علیہم السلام میں سے بھی سب سے بڑی نعمت جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مبعوث ہونا ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں، افضل الانبیاء ہیں اور افضل البشر ہیں۔

نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ...... حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی نبوتوں کا فیض بھی درحقیقت نبوّت محمدی سے چلا، حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ: ''اَنَانَبِیُّ الْاَنْبِیَآءِ'' ''میں نبیوں کا نبی ہوں''۔

اور انبیاء امتوں کے نبی ہیں۔ اسی واسطے انبیاء علیہم السلام پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، انبیاء کرام سے عہد لیا گیا: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ ①

''یاد کرو اس وقت جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب وہ رسول عظیم الشان آئے جن کو بھیجنا ہے اور تمہیں میں نبوت اور کتاب دے دوں اور پھر وہ رسول آئیں گے تو تم اس کے اوپر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو، اگر تم میں سے کوئی اس کا زمانہ پائے تو خود مدد کرے، ورنہ اپنی اقوام کو ہدایت کرو کہ وہ خاتم النبیین کی مدد کریں''۔

اس نبی کی کیا شان ہوگی؟ ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ﴾ وہ رسول عظیم، جو کچھ تمہیں علم دیا گیا ہے، اس کی تصدیق کرنے والا ہوگا۔

جامع الہدایات ...... تصدیق، اس کی دلیل ہوتی ہے کہ جس چیز کی وہ تصدیق کرتا ہے وہ اس کے اندر موجود ہے، جس علم کی تصدیق کوئی کرے گا تو پہلے اس کا علم ہونا چاہئے۔ جاہل تصدیق نہیں کر سکتا، عالم تصدیق کرے گا، تو سارے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ جو علم سارے انبیاء کو دیا گیا تھا، وہ علم اس نبی عظیم میں موجود ہوگا تو آپ تمام علوم انبیاء کے جامع ہوں گے۔ اس لئے آپ سارے انبیاء کی تصدیق کریں گے، جو کچھ جسے ملا ہے میں کہتا ہوں کہ وہ حق ہے وہی سچ ہے۔ یہ وہی کہہ سکتا ہے جس کے پاس حق موجود ہو۔ وہ علم اس کے پاس موجود ہو تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین اور جامع العلوم بنائے گئے تو اگر انبیاء کا دنیا میں آنا رحمت ہے تو خاتم النبیین کا آنا سب سے زیادہ رحمت ہے۔ جو جامع ترین نعمت لے کر آئے۔ اگر اور انبیاء علیہم السلام مختلف رنگوں کی ہدایت لے کر آئیں تو آپ ساری ہدایتوں کا مجموعہ بن کر آئے۔ تو خاتم النبیین کا مطلب یہ ہے کہ آپ جامع الہدایات ہیں۔ جامع العلوم اور جامع الکمالات ہیں تو ایک ایک کمال کا آنا اگر نعمت اور رحمت ہے تو سارے کمالات کے مجموعے کا آنا سب سے بڑی نعمت ہے۔ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آنا نعمت ہوگی

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۱۔

اور سب سے بڑی نعمت آپ کی بعثت ہوگی۔

افضل الشئون...... اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو شان ہوگی، وہ ساری شانوں سے افضل ہوگی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم ہیں تو خاتم الشئون بھی ہونگے، ساری شانیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوں گی، تو جامع ترین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ہونی چاہئے۔

تمام انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کے کمالات کا مظہر بن کر آئے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جامع الکمالات ہیں اس لئے حق تعالیٰ شانہٗ کے کمالات کا مظہر اتم ہیں تو حق تعالیٰ شانہٗ کی شانیں جس قوت اور کمال کے ساتھ آپ میں آئی ہیں، دوسروں میں نہیں آئیں۔

شانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں غلبہ رحمت...... ابھی آپ نے سنا کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی شان یہ ہے کہ ان کی تمام صفات دو نوع میں ہیں۔ صفات جمال اور صفات جلال، صفات جمال کا منشاء رحمت ہے اور صفات جلال کا منشا غضب ہے۔ اور رحمت اللہ کے غضب پر غالب ہے۔ تو جو اللہ کا سب سے بڑا مظہر اتم ہے اس میں بھی رحمت ہی غالب ہونی چاہیئے اس لئے آپ کی شان فرمائی گئی کہ: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ ① جیسے اللہ کے ہاں شان رحمت غالب ہے تو خاتم النبیین میں بھی ساری شانیں ہیں، مگر سب پر جو شان غالب ہے تو وہ رحمت کی شان ہے آپ کو رحمت مجسم بنا کر بھیجا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: "اَنَا رَحْمَةٌ مُّهْدَاةٌ". ②

میں ایک رحمت ہوں جو بطور ہدیہ کے مخلوق کو دی گئی ہوں، یعنی میں اللہ کا ایک ہدیہ ہوں جو مخلوق کو عطا کیا گیا، ایک تحفہ ہے جو اللہ نے بنی آدم کے لئے بھیجا ہے اور وہ میں ہوا اور میں کون ہوں؟ ''رَحْمَةٌ مُّهْدَاةٌ'' ایک رحمت مجسم ہوں جس کو بطور ہدیہ کے عطا کیا گیا، تو اللہ نے اپنی مخلوق کے لئے عظیم ہدیہ بھیجا۔ وہ ہدیہ رحمت ہے۔

تو جیسے حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں کہ: میری شانوں میں رحمت کی شان غالب ہے یہی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ہے کہ آپ پر شان رحمت کا غلبہ ہے، شان غضب غالب نہیں ہے، جب آپ حق تعالیٰ شانہٗ کے نمائندے اور مظہر ہیں۔ تو شان غضب بھی موجود ہے۔ اس غضب کا اثر یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں حدود بھی ہیں۔ قصاص بھی ہیں۔ کفارات بھی ہیں۔ تعزیرات اور سزائیں بھی ہیں، جہاد بھی ہے۔ جو شان غضب کا مظہر ہیں، مگر ان سب کے اندر بھی اگر غلبہ ہے تو شان رحمت کا غلبہ ہے۔ غضب بھی چلتا ہے تو وہ بھی رحمت ہی سے چلتا ہے۔

اگر باپ بچے کو مارتا بھی ہے۔ اس کا منشاء دشمنی نہیں ہوتی۔ محبت منشا ہوتی ہے۔ محبت ہی سے مارتا ہے تاکہ اس کو ہدایت ہو۔ حق تعالیٰ شانہٗ بھی اگر کسی فرد یا قوم پر غضب فرماتے ہیں تو اس کا منشا رحمت ہوتا ہے۔ تو نبی کریم

① پارہ: ۱۷، سورة الانبياء، الآية: ۱۰۷. ② سنن الدارمي، باب كيف كان اول شأن النبي ﷺ ج: ۱ ص: ۱۷.
حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحيحة ۴۹۰۔

صلی اللہ علیہ وسلم بھی اگر کسی پر غضب یا غصہ فرمائیں اس کا منشا بھی رحمت ہی ہے، ہدایت اور تنبیہ اس کا منشا ہوتی ہے۔ تو غضب کا منشا بھی فی الحقیقت رحمت ہے تو رحمت غالب آ گئی۔ کہیں بلا واسطہ رحمت کا ظہور ہے۔ کہیں غضب کے واسطہ سے رحمت کا ظہور ہے غضب میں بھی سو رحمتیں چھپی ہوئی ہیں۔ دشمن اگر غصہ کرے تو یہ غصہ ہے اور باپ اگر غصہ کرے تو اس کے اندر رحمت چھپی ہوئی ہے۔ دشمنی چھپی ہوئی نہیں۔ تو اللہ اپنی کائنات پر اور مخلوق پر ماں باپ سے زیادہ شفیق ہے۔ تو اس کے غصہ میں بھی ہزاروں رحمتیں چھپی ہوئی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت پر ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصہ بھی فرمائیں گے تو اس کا منشاء رحمت اور محبت ہی ہوگا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم شانِ رحمت اور رحمت مجسم بن کر آئے ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں شانِ رحمت ...... اسی لئے آپ کی شریعت میں رحمت کا غلبہ ہے۔ ایک ایک حکم کے اندر رحمت کا غلبہ ہے، ہر ہر حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ شفقت ٹپکی پڑتی ہے۔ بندوں کو ہدایت دے رہے ہیں۔ اس میں بھی شانِ رحمت کا غلبہ ہے۔

اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ جیسے رحمت مجسم ہیں تو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی تربیت شانِ رحمت سے ہی فرمائی۔ اس لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان یہ فرمائی گئی کہ: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ①

رحمت اور کرم ان کے اندر مخفی ہے، رحمت و کرم کے ان کے اندر رچا ہوا ہے اگر کفار پر شدت ہے تو ان کی ذوات پر نہیں ان کے کفر پر ہے۔ رحمت وہاں بھی چھپی ہوئی ہے کہ کسی طرح وہ بھی ایمان قبول کر لیں کسی طرح یہ ہدایت پر آ جائیں۔

رحیم اُمت ...... صحابہ میں سے بھی اَجل صحابہ، اکمل صحابہ رضی اللہ عنہم اور افضل صحابہ رضی اللہ عنہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا کہ: انبیاء کے بعد اگر کوئی شخصیت ساری کائنات پر افضل ہے تو وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شان فرمائی گئی: "اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَكْرٍ" ②

"صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر رحمت کا غلبہ ہے"۔

حدیث میں واقعات آتے ہیں کہ: صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب اپنے مکان سے مسجد نبوی کی طرف چلتے تھے گویا دربارِ خلافت میں پہنچتے تھے تو رحمت کا غلبہ اس درجہ پر تھا اور اس درجہ مخلوق اس رحمت سے آپ کی طرف متوجہ ہوتی تھی کہ چھوٹے چھوٹے سینکڑوں بچے آپ کے پیچھے ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یَا اَبَتَا! اے باپ! اور کوئی کہتا

① پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹.

② السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب معاذ بن جبل مزید بن ثابت... ج: ۱۲ ص: ۲۶۲. صحیح ابن حبان، کتاب اخبارہ ﷺ عن مناقب الصحابة، باب ذکر البیان بأن معاذ بن جبل کان من اعلم الصحابة بالحلال والحرام، ج: ۱۶ ص: ۷۴ رقم: ۷۱۳۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحیحة ۱۲۲۴۔

کہ اے چچا! اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں کہ کسی بچے کو کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں، کسی کو گود میں لئے ہوئے ہیں، کسی کے سر پر ہاتھ ہے، بیسیوں بچے پیچھے پیچھے ہیں اور امیر المومنین دربارِ خلافت میں جا رہے ہیں۔ یہ رحمت کا غلبہ تھا۔ ''اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَکْرٍ''

سب سے رحیم القلب اور سب سے زیادہ شفیق صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو فرمایا گیا تو اللہ کے یہاں شانِ رحمت غالب ہے تو سب سے زیادہ بڑے نائب اور اللہ کے وزیرِ اعظم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ان کو رحمت مجسم فرمایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتوں میں جو سب سے زیادہ باکمال ہیں اس کو ارحم کہا گیا کہ سب سے زیادہ رحیم ہیں۔ تو رحمت اوپر سے لے کر نیچے تک چھائی ہوئی ہے اور رحمت کا ایک سلسلہ چلا جو پہلے انبیاء میں آیا۔ اکمل ترین حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں آیا۔ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم میں آیا کہ ''رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ'' اکمل ترین صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں آیا غرض رحمت غالب ہے اور رحمت کا سرچشمہ وہ فی الحقیقت ہدایت ہے۔ تو سارے صحابہ رضی اللہ عنہم ہادی ہیں۔

طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ'' (1) ''میرے تمام صحابی (رضی اللہ عنہم اجمعین) ستاروں کی مانند ہیں، جس کی روشنی میں راستہ طے کرو گے ہدایت پا جاؤ گے''۔ ہر ایک ہادی اور مہدی ہے گویا صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی وہ شان ہے کہ قرآن نے من حیث الطبقہ کسی کو مقدس کہا ہے تو وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے اوروں میں افراد کی تعریف کی گئی ہے، لیکن طبقے کے طبقے کو مقدس کہنا یہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے۔ ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ (2)

سابقین اولین مہاجرین ہوں یا انصار ہوں اور جو بعد میں ان کے ساتھ ملتے گئے ان سب کے مجموعے کو کہا کہ اللہ ان سب سے راضی وہ اللہ سے راضی تو اللہ طبقہ سے راضی۔ افراد کا نام نہیں لیا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے راضی یا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے راضی۔ ﴿مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ﴾

مہاجرین اولین ہوں، انصار اولین ہوں یا بعد میں ان کے ساتھ لاحق ہونے والے ہوں، سب کو کہا گیا اللہ ان سب سے راضی اور وہ اللہ سے راضی جس طبقے میں طبقے کی حیثیت سے کھوٹ ہو۔ اللہ کبھی ان سے راضی نہیں ہوسکتا۔ رضا کا اعلان دلیل ہے کہ طبقے میں کھوٹ نہیں۔ طبقہ بہت مقدس ہے۔

---

(1) علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ البیهقی و اسنده الدیلمی عن ابن عباسؓ بلفظ: اصحابی بمنزلة النجوم فی السماء بأیهم اقتدیتم اهتدیتم. دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۱۳۲. اس حدیث کے بارے میں نہایت عادلانہ کلام حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تصنیف ''التلخیص الحبیر'' میں کیا ہے دیکھئے: التلخیص الجیر، باب ادب القضاء ج: ۵ ص: ۴۹۸.

(2) پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۰.

دوامی رضا کا اعلان...... پھر رضا کا بھی اعلان کوئی ہنگامی اور وقتی نہیں۔ یہ رضامندی کا اعلان قرآن میں کیا گیا اور قرآن قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔ اس کا حاصل یہ کہ کوئی دقیقہ بیچ میں ایسا نہیں گزرے گا کہ اللہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ناراض ہو۔ جو رضا ابتدا میں ہے وہی وسط میں ہے، وہی انتہا میں ہے۔ قیامت تک وہ رضا باقی رہے گی اور قیامت کے بعد بھی رہے گی۔ قیامت کے بعد قرآن اسی طرح موجود ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ جنت میں حافظ سے کہا جائے گا کہ: رَتِّلْ وَارْتَقِ (۱) قرآن پڑھتا جا۔ اور جہاں تک تیری طاقت میں ہے ترقی کرتا جا۔ تو وہاں بھی تلاوت ترقیات کا ذریعہ بنے گی۔ قرآن قیامت تک ختم نہیں ہوگا اس کے بعد بھی قرآن ہی کا دور حکومت ہے، جنت میں بھی قرآن ذریعہ ترقی بنتا جائے گا اور جب تک قرآن ہے: ﴿رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ﴾ کا نعرہ موجود ہے تو مطلب یہ نکلا کہ اب جب صحابہ رضی اللہ عنہم (نزول قرآن کریم کے وقت) موجود ہیں۔ اب بھی ہم ان سے راضی، ان کی وفات کے بعد بھی ان سے راضی، قیامت میں بھی ہم ان سے راضی، اس کے بعد جنت میں بھی ان سے راضی یعنی ابدالاباد تک ان سے راضی ہیں۔ تو جس طبقے کے بارے میں رضا کا اعلان کیا جائے کہ علی الاطلاق ہم ان سے راضی ہیں اور وہ علی الاطلاق ہم سے راضی تو وہ طبقہ یقیناً بحیثیت طبقے کے مقدس ہے، یہ نہیں ہے کہ ایک دو فرد مقدس ہیں۔ باقی میں معاذ اللہ، معاذ اللہ کچھ کھوٹ ہے، بلکہ پورا طبقہ مقدس ہے۔

کتب سابقہ میں شان صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر...... پھر یہ کتب کہ سابقہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان بیان کی گئی، تورات میں بیان کی گئی۔ حدیث میں ہے کہ: صحابہ رضی اللہ عنہم کی شانیں اور صفات دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خواہش کی اور کہا کہ اے پروردگار! یہ امت مجھے عطا کر دیجئے فرمایا گیا کہ: یہ امت محمد ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ: پھر اس امت ہی میں مجھے داخل کر دیجئے۔

تو گویا ایسی شان بیان کی گئی کہ انبیاء نے تمنائیں کیں کہ اس امت کے ذیل میں ہمیں شمار کر لیا جائے۔ تو اس امت میں سب سے زیادہ مقدس طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ کتب سابقہ میں بھی اس طبقہ کے مقدس ہونے کی شہادت دی گئی اور قرآن میں شہادت دی گئی تو ازل سے ان کا تقدس چلا اور ابد تک چلتا رہا تو اول سے لے کر اخیر تک یہ طبقہ مقدس ہے اور طبقات کے تو افراد کو نام لے کر مقدس کہا گیا ہے یا بلا نام کے۔ اور اس پورے طبقے کی تقدیس کر دی گئی۔

اصنافِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... پھر اس طبقے کے نام لے لے کر قرآن کریم نے الگ تقدیس کی: ﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ﴾ (۲) ''اللہ ان مومنوں سے راضی

(۱) السنن للترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فیمن قرأ حرفا من القرآن ماله من الاجر: ج:۵ ص:۱۷۷ رقم:۲۹۱۴. (۲) پارہ:۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ:۱۸.

ہوگیا جن سے آپ نے شجرۃ الرضوان کی بیعت لی ہے۔ حدیبیہ میں بیٹھ کر بیعت لی، ان سے اللہ راضی‘‘۔

وہ ڈیڑھ ہزار کے قریب صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ تو ایک صنف بتلائی گئی اس پر پھر رضا کا اعلان کیا گیا۔ تو مجموعہ سے رضا کا اعلان اور اسکی اصناف سے رضا کا اعلان۔ اصحاب بدر سے رضا کا اعلان، اصحاب احد سے رضا مندی کا اعلان پھر پورے رضا کے نیچے آجاتے ہیں۔ پورے صحابہ کی تقدیس و تقدس کا قرآن کریم اعلان کررہا ہے اور شہادت دے رہا ہے، یہ اللہ کی شہادت ہے اصل اور مضبوط ترین شہادت ہے تو طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہ کو بحیثیت طبقہ مقدس قرار دے دیا گیا۔

مقاماتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... پھر ان کے اعمال کی تقدیس الگ کی گئی، ان کے اخلاق کی تقدیس الگ کی گئی، پھر ان کے مقامات کو مقدس الگ بتلایا گیا۔

ایک موقع پر فرمایا گیا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ① ’’جو لوگ اللہ کے رسول کے ساتھ ہیں، ان کی شان یہ ہے کہ کفر کے بارے میں شدید ہیں اور ایمان اور مومن کے بارے میں رحیم اور رقیق القلب ہیں‘‘۔ یہ ان کے مقامات کو سراہا گیا کہ ان کے قلبی مقامات میں سے دو مقام یہ ہیں کہ ایمان کے روبرو واٹل اور مظبوط اور کفر کے بارے میں بہت شدید ہیں۔ کفر کا چھوٹے سے چھوٹا جزیہ بھی آجائے۔ اس کے سامنے جھک نہیں سکتے کفر کی ہر چیز کو رد کریں گے، کفر کی چیز سے رضا مندی کا اعلان نہیں کرسکتے، تو یہ ان کے قلبی مقامات کو سراہا گیا آگے فرمایا گیا:

اعمالِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقدیس...... ﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ پہلے قلبی مقامات تھے، اب بتلاتے ہیں کہ عمل کیا ہے؟ جب دیکھو رکوع اور سجود میں ہیں۔ اللہ کی رضا اور اس کے فضل کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ جب دیکھو عبادت اور طاعت میں ہیں: ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ ② جب کوئی ظرف بھر جاتا ہے تو بھر کر چھلکنے لگتا ہے۔ بھر کر وہ شی اس کے اوپر آجاتی ہے۔ تو اس درجہ صحابہ کے قلوب میں ایمان بھر چکا ہے کہ چھلک کر ان کی پیشانیوں پر نمایاں ہوگیا۔ سجدے کے آثار ان کی پیشانیوں پر ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ ان کی پیشانی ہر وقت اللہ کے سامنے جھکی رہتی ہے۔ ہر وقت یہ حق تعالیٰ کے سامنے ناک رگڑتے ہیں۔ یہ تو عمل بتلا دیا گیا۔ ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ﴾ ③ ان کی شانیں تو راۃ وانجیل میں بیان کردی گئی ہیں تو پہلے سے انبیاء انہیں سراہتے ہوئے آرہے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام نے ان کو الگ سراہا۔ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو الگ سراہا۔ حق تعالیٰ نے قرآن میں الگ سراہا اور دوامی رضا کا اعلان کردیا کہ یہ طبقہ یقیناً کھوٹ سے بری ہے، نیتوں کی خرابی سے بری ہے۔

خطاءِ فکری...... کوئی اجتہادی خطا اور غلطی ہوجائے وہ ہوسکتی ہے خطاء اجتہادی تو انبیا سے بھی ممکن ہے وہ فکری خطا

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹۔ ② پارہ: ۲۶ سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹۔ ③ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹۔

ہوتی ہے اس کو معصیت نہیں کہتے فرق اتنا ہے کہ نبی اگر خطاء اجتہادی کرتے ہیں تو حق تعالیٰ انہیں فوراً صواب تک پہنچا دیتے ہیں۔ غیر نبی اگر خطا اجتہادی کرے وہ اس کے اوپر باقی رہ سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ صواب پر آئے۔ مگر اس کی خطا پر بھی اسے اجر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ فکر کی خطا ہوتی ہے۔ نیت اور ارادے کی خطا نہیں ہوتی۔ صورت عمل کی خطا ہوتی ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام کی نیتیں پاک اور مقدس ہیں۔ اسی طرح سے صحابہ کرام کے بارے میں بھی فرمایا گیا کہ عمل بھی پاک اور قلبی مقامات بھی پاک، کوئی ان میں کھوٹ نہیں ہے نیتیں بھی مقدس ہیں، ارادے بھی مقدس ہیں، فکری طور پر یا اجتہادی خطا واقع ہو یہ بڑے سے بڑے کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ یہ کوئی معصیت نہیں، کوئی برائی نہیں۔

اس سے تو زیادہ سے زیادہ مخلوقیت ثابت ہوتی ہے۔ علم الٰہی ہے جو ہر قسم کی خطا سے بری ہے لیکن مخلوق کے علم میں خطا کا آجانا ممکن ہے۔ تو مخلوق ہونا تو کوئی برائی کی بات نہیں ہے، انبیاء بھی مخلوق ہیں، ملائکہ بھی مخلوق ہیں۔ اولیاء بھی مخلوق ہیں، تو مخلوق ہونا عیب نہیں ہے۔ تو اتنا تو ہے کہ وہ بے شک مخلوق ہیں، لیکن مخلوق ہونے کے بعد ان کا ظاہر و باطن ان کا قلب و قالب مقدس ہے۔

تقدیسِ قلب..... ممکن تھا کوئی یوں کہتا کہ دلوں کے اندر خرابی ہوگی یہ تو ظاہری اعمال ہیں۔ تو قرآن کریم نے اس کا بھی رد کر دیا، فرمایا: ﴿ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ﴾ ① ''اللہ نے پہلے ہی ان کے قلوب کا امتحان کر لیا تھا۔ تقویٰ کے معیار پر انکے قلوب کو جانچ لیا تھا۔ یہ پختہ نکلے۔'' ﴿ أُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ﴾۔ ''یہ سب کے سب بزرگ اور مقدس ہیں۔ رشد و ہدایت لئے ہوئے ہیں۔'' ﴿ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ﴾ ''یہ اللہ کی طرف سے اس کا فضل ہے اور اس کی بڑی نعمت ہے''۔

تو قلب کو الگ سراہا گیا۔ قالب کو الگ سراہا گیا۔ قلبی مقامات، قالب کے افعال کو الگ سراہا گیا اور طبقے کو الگ۔

شرفِ صحابیّت...... اس وجہ سے اہل السنّت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ ''اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ'' سارے صحابہ متقن پاکباز اور مقدس ہیں۔ امت میں کوئی بڑے سے بڑا قطب، شیخ، ولی اور کامل گزرے مگر صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جو رفعت مقام ہے۔ وہ بڑے سے بڑے قطب اور غوث کو نصیب نہیں۔ اس واسطے کہ صحابی وہ ہے جس نے اپنی آنکھ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کیا ہے۔ اپنے کانوں سے بلاواسطہ کلام مقدس کو سنا ہے یہ شرف غیر صحابی کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ تو بلاواسطہ آفتاب نبوت کا نور جس طبقے نے لیا ہے۔ جو تیزی اس میں ہوگی بالواسطہ نور میں وہ تیزی نہیں ہو سکتی۔ وسائط کے سبب سے کچھ نہ کچھ پھیکا پن ضرور آئے گا، سب سے پہلے ایمان کا اثر اور نقش جو پڑا ہے۔ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلب پر پڑا ہے بلاواسطہ کسب فیض کیا، اور فیض صحبت حاصل کیا۔ تو نگاہیں بھی مقدس تھیں ان کے کان اور ساعتیں اور زبانیں بھی مقدس ہوگئیں اور ان کی ترقی قلوب ہوگئی۔

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳۔

ان کی کیفیت یہ ہوگئی کہ انہوں نے اپنی ہر قوت کا مصرف یہ سمجھا کہ ان کے ذریعہ اللہ کے رسول کے ساتھ رضامندی کا اظہار کرتے جائیں یہی ان کا دین یہی ان کا ایمان ہے۔

عشقِ صحابہ رضی اللہ عنہم..... حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوئی تو ایک صحابی ہیں، وہ عوام صحابہ رضی اللہ عنہ میں سے ہیں، یعنی خواص میں سے نہیں ہیں کہ فقہاء وعلماء صحابہ میں سے ہوں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ تو اس دور میں عوام میں تھے مگر صحابی ہیں تو کھیت میں ہل چلا رہے تھے، تو کسی خبر دینے والے نے خبر دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، ایک دم ہل روک کر ششدر اور حیران رہ گئے! کہا: وفات ہوگئی؟ کہا کہ: ہاں! وفات ہوگئی۔ بس ہل چھوڑ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور کہا کہ: ''اے اللہ! یہ آنکھیں اس لئے تھیں کہ تیرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کریں یہ کان اس لئے تھے کہ تیرے مقدس رسول کی آواز سنیں اور جب رسول دنیا میں نہیں تو میری بنیائی بھی ختم کردے اور میری سماعت بھی ختم کردے اب میں نہ کسی کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں، نہ کسی کی آواز سننا چاہتا ہوں''۔

مستجاب الدعوات تھے۔ اسی وقت دعا قبول ہوگئی اور اسی وقت نابینا ہوگئے اور اسی وقت بہرے ہوگئے کہ کوئی لفظ سن نہیں سکتے تھے، یہ گویا انتہائی محبت تھی کہ انہوں نے اپنی آنکھوں کا مصرف دیدار نبوی سمجھا ہوا تھا۔ کانوں کا مصرف یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنیں، اور کوئی مصرف نہ تھا۔

یہ انتہائی کمال ولایت اور قرب مع اللہ اور نسبت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ تمام اعضاء وقوی بدن کی آخری۔ غایت اللہ اور اس کا رسول رہ جائے، کان ہوں تو ان کا مصرف یہ ہے کہ اللہ ورسول کی باتیں سنیں، آنکھ ہو تو اس کا مصرف یہ ہو کہ اللہ کے رسول کا دیدار کرے، ہاتھ اس لئے ہوں کہ اس سے اللہ اور رسول کے آثار کو چھوئیں، قرآن پر ہاتھ رکھیں حدیث پر ہاتھ رکھیں دینی کتابیں اور دینی مکانات پر ہاتھ رکھیں۔ بیت اللہ کے پردوں پر ہاتھ رکھیں گویا ہاتھ کا مصرف یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کو چھوئیں جو اللہ ورسول کے نام لگی ہوئی ہیں۔

وہ کسی عارف نے کہا ہے کہ:

نازم بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است ۔۔۔ افتم بپائے خود کہ بکوئے تو رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دستِ خویش را ۔۔۔ او دامنت گرفتہ بسوئے ام کشیدہ است

عارف کہتا ہے کہ: مجھے اپنی آنکھ پر ناز ہے، مگر اس لئے ناز نہیں کہ میری آنکھ ہے، اس لئے ناز ہے کہ وہ تیرا جمال دیکھنے والی ہے، نہ اس لئے کہ وہ میری آنکھ ہے اس لئے کہ وہ تیری دیدار کنندہ ہے، اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنے قدموں پر سر رکھ دوں۔ اپنے قدموں کی تعظیم کروں نہ اس لئے کہ میرے قدم ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ قدم مجھے تیرے کوچے کی طرف کھینچ کر لے گئے ہیں۔ تیری مسجد اور بیت اللہ کی طرف دینی احکامات کی طرف، دینی چیزوں کی طرف، یہ قدم مجھے کھینچ کر لے گئے ہیں۔ تو میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے قدموں میں اپنا سر ڈال دوں۔ مجھے

قدموں سے محبت ہوگئی ہے، یہ تجھ تک پہنچنے کا واسطہ بن گئے ہیں۔

اور میرا جی چاہتا ہے کہ ہر دم اپنے ہاتھوں کو چومے جاؤں، نہ اس لئے کہ میرے ہاتھ ہیں، بلکہ اس لئے کہ تیرا دامن پکڑ کر تجھے میری طرف لے آتے ہیں اور قرب کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ تو کمال ولایت یہ ہے کہ آدمی اپنی ہر قوت کو ہر عضو کو ہر ملکے کو حق تعالیٰ تک پہنچنے کا اور اللہ کے رسول تک پہنچنے کا واسطہ بنائے۔ صحابہ میں عوام صحابہ کو یہ مرتبہ نصیب تھا۔ صحابہ کے بعد پچاسوں برس کی محنت اور ریاضت کے بعد کہیں یہ مسئلہ آدمی کے سامنے حل ہوتا ہے کہ میرے جسم اور میری روح کی غرض و غایت اللہ اور اس کا رسول ہے۔ بیسیوں برس کی محنت ترک لذات اور مجاہدوں کے بعد کہیں اس مقام تک پہنچتا ہے، مگر صحابہ کی یہ بات ہے کہ عوام صحابہ پہلے ہی قدم پر اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں کہ دنیا تو دنیا اگر ہماری ذات کا بھی مصرف ہے تو اللہ و رسول ہے۔ اس کے سوا کوئی چیز نہیں، غرض اس طبقے کی تقدیس فرمائی گئی۔ اور اس طبقہ کو مقدس ترین طبقہ کہا گیا۔

معیار ایمان وعمل...... اسی واسطے اہلسنت والجماعت کا یہ مذہب ہوگیا کہ: "اَلصَّحَابَةُ کُلُّهُمْ عُدُوْلٌ." "سارے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین متقن، عادل اور پاکباز ہیں۔"

اور ہماری ہر تنقید سے بالاتر ہیں۔ ہماری ہر حالت سے اونچے ہیں۔ ہمارا فرض ہوگا کہ ان کو سامنے رکھ کر اپنے ایمانوں کو پرکھیں۔ اگر ان کے ایمان کے مطابق ہو جائے تو ہمارا ایمان درست ہے۔ ورنہ غلط ہے ہم ان کے اعمال کو کسوٹی کے طور پر سامنے رکھیں اگر ہمارا عمل ان کے عمل پر منطبق ہوگیا تو سیدھا۔ ورنہ ہمارے عمل میں کھوٹ ہے وہ ہمارے عمل کے حق و باطل کو پرکھنے اور پہچاننے کے معیار اور کسوٹی ہیں۔ اسی طرح ہمارے ایمانوں کو پہچاننے کا معیار ہیں۔ اس لئے کہ سب سے پہلے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے راوی ہیں اگر ان میں معاذ اللہ کوئی خرابی ہے تو پھر ہمارے دین کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر بنیاد میں خرابی پڑے تو ہم پھر صحیح ایمان نہیں لا سکتے۔ ہمارا ایمان تو انہی کے قدموں کے صدقے ہے اگر وہ صحیح ایمان لائے ہیں تو ہمارے پاس صحیح ہے اگر انہوں نے کوئی معاذ اللہ غلطی کی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ بعد والوں کے ایمان درست ہوں۔ تو درحقیقت وہ ہمارے ایمان کے پہچاننے کے لئے ایک کسوٹی ہیں۔ ہمارے علم اور عمل کے صحیح اور درست ہونے کے لئے۔ اس لئے کہ علم کی روایت بھی انہوں نے اللہ کے رسول سے کی ہے اور عمل کی روایت بھی انہوں نے ہی کی ہے۔

اسوۂ علم وعمل...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے یہ فرمایا گیا کہ: آپ اللہ کی طرف سے علم لے کر آئے ہیں۔ سچا اور قطعی علم لا کے امت کے سامنے پیش کیا۔ اسی طرح عمل کے نمونے بھی اللہ کی طرف سے آپ ہی لے کر آئے ہیں۔ ان نمونوں کو دیکھ کر امت نے عمل کا نمونہ سیکھا، اگر علم محض دے دیا جاتا اور عمل کا نمونہ سامنے نہ آتا تو جس شخص کا جیسا جی چاہتا عمل کا نمونہ اختیار کر لیتا۔ نماز کا حکم دے دیا جاتا، مگر نماز کا ڈھنگ عمل کر کے نہ بتلایا جاتا تو میں اپنی ڈھنگ کی نماز پڑھتا۔ آپ اپنی روش کی نماز پڑھتے۔ ایک نماز کی لاکھوں نمازیں بن جاتیں، لیکن اللہ کے

رسول نے جہاں علم دیا، جہاں نماز کا آرڈر دیا وہاں نماز کا نمونہ بھی دیا۔ اسی واسطے آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ: "صَلُّوْا" اے لوگو! نماز پڑھا کرو، یہ فرمایا کہ: "صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ" ① "نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو"۔

یعنی نماز کے صحیح ہونے کا نمونہ میں ہوں اسی ڈھنگ کی پڑھو۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ: "تَوَضَّؤُا" اے لوگو وضو کر لیا کرو، جس طرح تمہارا جی چاہے۔ وضو کا آرڈر بھی دیا اور وضو کر کے بھی دکھلایا کہ یوں کرو۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو تمام اعضاء کو ایک ایک دفعہ دھویا، فرمایا: هٰذَا وُضُوْءٌ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ الصَّلٰوةَ إِلَّا بِهٖ. ② "یہ وہ وضو ہے جس کے بغیر نماز ہی نہیں قبول ہوگی"۔

یعنی اگر ایک دفعہ بھی اعضاء وضو نہ دھوئے جائیں تو وضو نہیں ہوتا تو پھر نماز کیسے ہوتی۔ یہ تو وہ وضو ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوگی۔

اس کے بعد دوبارہ وضو کیا اور ہر عضو کو دو مرتبہ دھویا۔ ہاتھ بھی دو مرتبہ دھوئے، کلی بھی دو مرتبہ کی، ناک میں پانی دو مرتبہ اور منہ بھی دو مرتبہ دھویا فرمایا کہ: یہ وہ وضو ہے جو نور علی نور ہے۔ ایک نور ایک دفعہ دھونے میں دوسرا نور دوسری دفعہ کے دھونے میں۔

پھر تیسری دفعہ وضو کیا اور اس میں تمام اعضاء وضو کو تین مرتبہ دھویا اور فرمایا کہ: هٰذَا وُضُوْءِيْ وَوُضُوْءُ الْأَنْبِيَآءِ مِنْ قَبْلِيْ. "یہ میرا وضو ہے اور میرے سے پہلے سارے پیغمبروں کا یہی وضو ہے"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آرڈر نہیں دیا کہ وضو کرو، یعنی جیسے تم علم میں مختار نہیں ہو کہ جب چاہو تم اپنی طرف سے گھڑ لو، عمل کے نمونے میں بھی آزاد نہیں کہ جیسا چاہو نمونہ بنا لو اس میں بھی اللہ کے رسول کی پابندی کرنی پڑے گی۔

اسوۂ نبی کی احتیاج...... حدیث میں واقعہ آتا ہے، حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ کا، جو صحابی ہیں، رمضان شریف کے بارے میں آیت نازل ہوئی: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ﴾ ③

فرمایا گیا کہ: "کھاؤ اور پیو جب تک کھل کر نمایاں نہ ہو جائے، سیاہ ڈورا سفید ڈورے سے یعنی متمیز نہ ہو جائے اور الگ پہچان نہ ہو جائے، اس وقت تک کھانے پینے کی اجازت ہے۔" مطلب یہ ہے کہ رات جب جانے لگے، سپیدی کا تاگہ جب نمودار ہو جائے اور صبح صادق ہو گئی اب کھانا پینا بند کر دو، روزے کی نیت کر لو۔ رات میں کھانے کی اجازت ہے اور جہاں پو پھٹی اب کھانا پینا ممنوع ہو گیا۔ تو "خیط ابیض" یعنی سفید ڈورا صبح صادق کی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة ج: ۳ ص: ۷ رقم: ۵۹۵.

② السنن الکبری للبیهقی، کتاب الطهاره، باب فضل التکرار فی الوضوء، ج: ۱، ص: ۸۰، رقم ۳۸۴. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحیحة باب ۲۶۱، ج: ۱ ص: ۲۶۰. ③ پارہ: ۲، سورة البقرة، الآیة: ۱۸۷.

لکیر کو کہا گیا ہے اور سیاہ ڈورا رات کی لکیر کو کہا گیا۔

حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ نے ایک دوڑا تو سفید رکھا اور ایک ڈورا سیاہ رنگوایا اور تکیہ کے نیچے رکھ لئے اور کھانا پینا جاری ہے، تکیہ اٹھا کر دونوں کو دیکھ لیتے ہیں کہ جب یہ ڈورے الگ پہچانے جائیں گے، تب کھانا پینا بند کروں گا، تو صبح صادق کب کی ہوگئی، چاندنا بھی ہوگیا مگر اتنا چاندنا نہیں ہوا تھا کہ ڈورے الگ نمایاں ہو جائیں، تو صبح صادق گزر رہے ہوئے بیس منٹ گزر گئے اور یہ اپنا کھا پی رہے ہیں کہ جب تک ڈورے الگ الگ نمایاں نہیں ہوں گے، کھانے پینے کی اجازت سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ اطلاع ہوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم کیا کرتے ہو؟ روزے کی نیت کب کرتے ہو؟

انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ: کھاؤ پیو جب تک سفید ڈور کی سیاہ ڈورے سے الگ پہچان نہ ہو جائے۔ یا رسول اللہ! میں نے دو ڈورے تکئے کے نیچے رکھ رکھے ہیں، ایک کالا ڈورا ایک سفید ڈورا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِیْضٌ'' '' تیرا تکیہ بڑا المبا چوڑا ہے'' کہ کالا ڈورا اور سفید ڈورا دونوں تیرے تکئے کے نیچے آگئے، یعنی رات اور دن دونوں تیرے تکئے کے نیچے آگئے، تیرے تکئے کی بڑائی کا کیا ٹھکانہ ہے؟

بندۂ خدا! کالے ڈورے سے مراد، رات کی سیاہی ہے اور سفید سے مراد صبح صادق کی لکیر ہے، تو تیرا تکیہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے نیچے صبح صادق بھی آگئی اور رات بھی آگئی۔ تب واضح ہوا کہ کالے ڈورے سے مراد خداوندی رات ہے اور سفید ڈورے سے مراد خداوندی صبح صادق ہے تو لغت کے لحاظ سے وہ یہ مطلب سمجھے اور لغت کے لحاظ سے وہ مطلب صحیح تھا، مگر مراد اللہ کی یہ نہیں تھی۔

اب اگر اللہ کا رسول اس مراد کو بیان نہ فرمائے۔ تو عمر بھر وہ اسی غلطی میں مبتلا رہتے، ایک روزہ بھی ان کا صحیح نہ ہوتا، اس لئے واضح ہوا کہ قرآن وحدیث میں ایک لغوی معنی ہوتے ہیں اور ایک ارادی معنی جن کا اللہ ورسول نے ارادہ کیا ہے۔ ایک اس کا ترجمہ ہے اور ایک اس کا مطلب ہے یعنی جیسے تم علم میں مختار نہیں کہ جو چاہو اپنی طرف سے گھڑ لو۔ عمل کے نمونے میں بھی آزاد نہیں ہو کہ جیسا چاہو نمونہ بنالو۔ اس میں اللہ کے رسول کی پابندی کرنی پڑے گی۔

علم وعمل کی مطابقت......اسی واسطے قرآن کریم میں جہاں یہ فرمایا گیا کہ: یہ قرآن ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ہے، ہر چیز کے لئے یہ تبیان ہے، تبیان دعوی مع الدلیل کو کہتے ہیں، یعنی اس میں احکام بھی ہیں اور احکام کے دلائل بھی ہیں، یعنی مدلل دعووں اور مدلل مسائل کا مجموعہ ہے۔

اس طرح سے فرمایا کہ: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ① تو قرآن نے جتنے علم کے نمونے

① پارہ ۲۱، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۲۱.

پیش کئے۔ اللہ کے رسول نے اتنے ہی عمل کے نمونے پیش کئے۔ قرآن میں جو چیز قال کی صورت میں ہے اللہ کے رسول میں وہی چیز حال کی صورت میں ہے۔ وہاں قول ہے یہاں عمل ہے تو قول اور عمل دونوں مطابق ہیں آپ جو کچھ عمل کرتے ہیں، قرآن وہی کچھ کہتا ہے، جو کچھ قرآن کہتا ہے وہی آپ عمل کرتے ہیں۔ تو علم و عمل کی مطابقت ہے۔

اتباعِ محض ...... یہی وجہ ہے کہ صحابہ میں اختلافات بہت کم ہیں، اس لئے کہ جہاں کسی آیت کے مضمون میں انہیں اشکال ہوا وہ اللہ کے رسول کے عمل کو دیکھ لیتے تھے اشکال حل ہو جاتا تھا۔ معلوم ہو جاتا تھا کہ اس علم کا مصداق یہ ہے کہ اس عمل کی ہیئت عمل یہ ہے جو اللہ کے رسول نے کر کے دکھلائی۔ تو جتنی چیزیں قرآن میں علم کی صورت میں ہیں وہ سب چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں عمل کی صورت میں ہیں۔ تو آپ نے جہاں یہ فرمایا کہ: ''یہ کرو اور یہ نہ کرو'' وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھلا دیا کہ جو کرنے کی چیز ہے اس کی ہیئت یہ ہے اور جو بچنے کی صورت ہے تو بچنے کی یہ ہیئت ہے، تو وضو کر کے دکھلایا۔ نماز کو کر کے دکھلایا جہاد کو کر کے دکھلایا۔ روزے کو کر کے دکھلایا۔ شادیاں کر کے دکھلائیں کہ یہ نمونہ ہے۔ اور غمی کو کر کے دکھلایا کہ یہ نمونہ ہے، دوستوں سے یہ معاملہ ہے، دشمنوں سے یہ ہے، صلح کا یہ طریقہ ہے، جنگ کا یہ طریقہ ہے۔ اصول بتلا دیئے اور ان اصولوں کے مطابق اپنے عمل کا نمونہ پیش کر دیا۔

تو خلوت ہو یا جلوت، انفراد ہو یا اجتماع، جماعتی زندگی ہو یا فردی، سب کے عمل کے نمونے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھلا دیئے۔ اس واسطے امت کے لئے اتباع ہی اتباع ہو گیا تجویز باقی نہیں رہی تجویز تو تب کریں جب کوئی نمونہ نہ دکھلایا گیا ہو۔ سارے نمونے موجود ہیں آگے اتباع رہ جاتا ہے۔ گھڑنا یا بنانا یا ساخت کرنا نہ علم کے درجے میں باقی۔ علم پورے کا پورا لا کر پیش کر دیا۔ شریعت جامع ہے۔ اس شریعت پر پورا پورا عمل کر کے دکھلایا تو اتباع باقی رہ جاتا ہے، تجویز امت کا کوئی درجہ باقی نہ رہا۔

تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے سب سے پہلے اتباع کیا، سب سے زیادہ متبع سنت وہی ہیں۔ سب سے زیادہ متبع شریعت وہی ہیں۔ انہوں نے ہر نمونے کو اللہ کے رسول سے روایت کیا۔ تو قرآن کریم کی عملی روایت بھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے چلی اور اس کی روایت بھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے چلی۔ عمل بھی کر کے دکھلاتے رہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم پھر تابعین اس کے بعد تبع تابعین۔

فرائضِ رسالت ...... قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چار وظیفے ہیں: ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ① اللہ نے رسول بھیجا۔ اس کی کیا شان ہے؟ اللہ کے رسول نے چار کام کئے، پہلے تلاوت آیات کی یعنی بلا کم و کاست، وحی کے الفاظ جو اللہ نے آپ کے قلب مبارک پر نازل کئے پڑھ کر سنا دیئے۔ اس کے بعد تعلیم دی۔ تعلیم تلاوت

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲.

سے الگ ہے، تلاوت کا تعلق لفظوں سے ہوتا ہے۔ تعلیم کا تعلق معانی سے ہوتا ہے، یعنی پہلے لفظ سنائے، پھر معانی سمجھائے کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے۔ اس کے بعد پھر تعلیم حکمت کی اور حکمت سے مراد یہاں اسوہ حسنہ ہے، یعنی کر کے دکھلایا۔ اس لئے کہ حکمت کی دو قسمیں ہیں ایک حکمت نظری اور ایک حکمت عملی۔ حکمت نظری تو تعلیم میں آ گئی کہ نظر وفکر کی چیز تھی علمی صورت میں آپ نے بتلا دی، اب عملی صورت رہ جاتی تھی۔ اس کو حکمت سے تعبیر کیا کہ عمل کا نمونہ پیش کر دیا تو علم بھی سکھلایا اور عمل کا نمونہ بھی دکھلایا۔

تزکیۂ قلوب...... اس کے بعد چوتھی چیز بتلائی "وَيُزَكِّيهِمْ" دلوں کے مانجھنا اور ان کو صاف کرنا یہ بھی آپ کا ایک وظیفہ ہے، امت کا تزکیہ فرمانا اور ان نفوس میں استقامت پیدا کرنا، زیغ کجی اور ٹیڑھ نکال دیں، فہم کی ایسی سلامتی پیدا کریں کہ جب اللہ کی آیات پڑھی جائیں تو آدمی ٹھیک وہ مطلب سمجھے جو اللہ کی مراد ہے۔ دل صحیح راستہ پر پڑ جائے۔

اس واسطے کہ اگر دل میں ٹیڑھ رہ جاتی ہے تو صحیح سے صحیح کلام کا مطلب بھی ٹیڑھا سمجھتا ہے۔ سمجھ کا دارومدار دل پر ہے اور دل کا راستہ غلط ہو تو ہر مکتوب غلط ہو جائے گا۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص کے دل میں خدانخواستہ یہودیت بھری ہوئی ہے وہ قرآن کو پڑھے گا تو ساری آیتوں میں سے یہودیت نکالنا شروع کر دے گا، اسے یوں معلوم ہوگا کہ سارا قرآن یہودیت سکھلانے کے لئے آیا ہے۔ نصرانی ذہنیت ہے تو ہر آیت میں سے اسے نصرانیت نکلتی ہوئی معلوم ہوگی۔ اگر قادیانی ذہنیت ہے تو ہر آیت میں سے اسے قادیانیت نکلتی ہوئی معلوم ہوگی۔ کوئی اور نظریہ مکتب فکر لے لیجئے۔ جو مکتب فکر بنا ہوا ہوگا ویسا ہی آدمی ہر آیت ہر روایت سے مطلب سمجھے گا تو سمجھنے کا دارومدار دل پر ہے۔ اگر دل میں صحیح سلامتی پیدا کی جائے تو آدمی ٹھیک مطلب سمجھے گا اور اگر دل ٹیڑھا ہے تو ہر چیز ٹیڑھی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقط تعلیم ہی نہیں دی۔ فقط مطالب ہی نہیں بتلائے بلکہ دلوں کا رستہ بھی سیدھا کیا تا کہ سیدھا مطلب سیدھے دل میں اتر جائے گھر کر جائے۔ اگر دلوں میں ٹیڑھ رہ گئی تو یقیناً مطلب بھی ٹیڑھا بن جائے گا۔

عمل کی نگرانی...... تو آپ نے تزکیہ بھی کیا اور عمل کی نگرانی بھی کی۔ ایک طرف مسائل سکھلائے اور ایک طرف عمل دیکھتے تھے کہ آیا صحابہ کا عمل اس کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو نگرانی فرماتے تھے۔

(1) حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نگرانی کرتے ہوئے گھومے تو آپ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مکان سے گزرے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تلاوت میں مشغول تھے اور اتنی آہستہ تلاوت کر رہے تھے کہ کان لگا کے سنا جائے تو سننے میں آتی تھی ورنہ سننے میں نہیں آتی تھی۔ آپ آگے پہنچے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مکان سے گزرے وہ اتنے زور زور سے قرآن پڑھ رہے تھے کہ سارا محلہ گونج رہا تھا۔

صبح کو جب یہ حضرات دربار نبوی میں جمع ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! تم اتنا آہستہ

---

(1) السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی رفع الصوت بالقراۃ فی صلوٰۃ اللیل، ج: ۲ ص: ۳۷ رقم ۱۳۲۹۔
حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح ابی داؤد ج: ۳ ص: ۳۲۹ رقم: ۱۳۲۹۔

کیوں پڑھتے تھے کہ کوئی دوسرا نہ سن سکے' کان لگائے تو مشکل سے سننے میں آئے عرض کیا، یا رسول اللہ میں اسے سنا رہا تھا جو نہ بہرہ ہے نہ مجھ سے غائب ہے، یعنی اللہ رب العزت، تو مجھے زور زور سے پڑھنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو میرے دل کی کھٹک سے بھی واقف ہے: ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ''مجھے ضرورت نہیں تھی کہ میں زور زور سے آواز اٹھاؤں''۔ ''لَاتَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَآئِبًا.'' تم جو پکار رہے ہو نہ بہرے کو پکار رہے ہو نہ غائب کو پکار رہے ہو وہ تو ہر وقت حاضر و ناظر ہے اور شنوا و بینا اور سمیع و بصیر ہے۔ اس واسطے میں آہستہ پڑھتا تھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم اتنا زور زور سے کیوں پڑھ رہے تھے؟ عرض کیا: ''اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاُطَرِّدُالشَّيْطَانَ''

زور زور سے پڑھ کر سوتے ہوؤں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا، کہ اس کوچے میں نہ آنے پائے قرآن کی آواز سن کر دور سے بھاگ جائے۔ تو دونوں کے پاس ایک حجت تھی اور دونوں کے قلب کا ایک مقام تھا۔ اپنے مقام کے مطابق ہر ایک کا عمل سچا اور حق تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! تم ذرا آواز کو پستی سے بلند کردو اور، اے عمر! تم ذرا رفعت سے پستی کی طرف آؤ، تاکہ اعتدال قائم ہو جائے۔ دونوں نقطہ اعتدال پر آجاؤ، ظاہر بات ہے کہ یہ نگرانی تھی، یہ قلب کی راہیں درست کرنا تھا۔

غرض مجاہدہ...... یہ کوئی جائز و ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا، آہستہ پڑھنا بھی جائز ہے اور پکار کر پڑھنا بھی جائز ہے، یہاں جائز و ناجائز کی بحث نہیں تھی۔ یہاں قلب کو راہ اعتدال پر لانے کی بحث تھی۔ یہ چیز قلبی مقامات سے متعلق ہے، مسائل سے نہیں بلکہ مقامات باطن سے متعلق تھی تو جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم سکھلایا۔ مسائل بتلائے وہاں دلوں کو مانجھا بھی اور صاف بھی کیا۔ مجاہدے اور ریاضتیں کرا کر اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت بھری، تاکہ دنیا کی محبتیں قلب سے نکل جائیں تو کہیں جہاد، کہیں مجاہدہ اور کہیں راتوں کے تہجد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس قدر راتوں کو تہجد میں راسخ القدم بن کے اتنا کھڑے رہتے تھے کہ پیروں پر ورم آجاتا تھا، یہ محنتیں اور مجاہدے کس لئے تھے؟ تاکہ نفس کی مرغوبات ختم ہو کر روح کی مرغوبات سامنے آجائیں، قلب کے اندر محبت الٰہی جاگزیں ہو جائے اور راسخ ہو جائے، اب دنیا کا کام بھی کریں تو اللہ کے لئے کریں، نفس کے لئے نہ کریں، تو نفس کی راہوں کو بند کر کے قلب اور روح کی راہیں ان کے سامنے کھول دیں کوئی عمل بند نہیں کیا۔

فرق عمل...... اعمال جو ایک عامی آدمی کرتا ہے، وہی ایک ولی بھی کرتا ہے، فرق ہوتا ہے قلب کے راستے میں اس کا کرنا لوجہ اللہ ہوتا ہے، اور اس کا لوجہ النفس ہوتا ہے، عمل دونوں کا برابر ہے۔ کھاتا یہ بھی ہے اور ایک ولی بھی کھاتا ہے، بازار میں یہ بھی جاتا ہے اور ایک ولی کامل بھی بازار جاتا ہے، صورت عمل میں تو فرق نہیں مگر نیت عمل اور غرض وغایت عمل میں فرق ہے تو باطن کا فرق ہوتا ہے آپ نے قلوب کو صاف کر کے باطن کو مانجھ دیا کہ جو کچھ کریں لوجہ النفس نہ رہے، لوجہ اللہ ہو جائے۔ دوستی ہو یا دشمنی، محبت ہو یا عداوت خالص اللہ کے لئے ہو جائے۔

اخلاص عمل...... حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ سیر کی کتب میں مشہور ہے کہ آپ نے غزوہ بدر میں ابوجہل کو پچھاڑ

دیا اور ارادہ کیا کہ خنجر لے کر اسے ذبح کر دیں۔ اس نے غصہ میں آکر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منہ پر تھوک دیا، بس خنجر چھوڑ کر کھڑے ہو گئے قتل سے باز آ گئے کہ اب نہیں قتل کروں گا۔

ابوجہل نے کہا: اے علی! میں تو تم کو دانشمند سمجھتا تھا۔ میں تمہارا بھی دشمن، تمہارے رسول کا بھی دشمن اور تمہارے دین کا بھی دشمن۔ ایک منٹ کے لئے میں نہیں چاہتا کہ تمہارا دین اس دنیا میں باقی رہے تم یا تمہارے رسول باقی رہیں اتنے بڑے دشمن پر قابو پا کر اسے چھوڑ دینا یہ کونسی دانشمندی ہے؟ تم نے کیوں نہیں مجھے قتل کیا۔

فرمایا کہ: میں تجھے اللہ کے لئے قتل کرنے بیٹھا تھا۔ میری کوئی ذاتی لڑائی تجھ سے نہیں، کوئی ذاتی بغض نہیں۔ اللہ کی وجہ سے عداوت تھی اور یہ ساری لڑائی بھڑائی اللہ کی وجہ سے تھی۔ جب تو نے میرے منہ پر تھوکا تو میرے نفس میں غصہ پیدا ہو گیا، اب اگر میں قتل کرتا تو نفسانی جذبات سے قتل کرتا تو میری عبادت شرک میں بدل جاتی۔ میری توحید، توحید باقی نہ رہتی۔ اس واسطے میں قتل سے باز آ گیا۔ اس لئے کہ یہ قتل وغارت نفسانی جذبے سے نہیں رحمانی جذبے سے ہے۔ جب نفس میں غضب پیدا ہو گیا۔ تو اب قتل کرنا نفس کی راہنمائی سے ہوتا خدا کی راہنمائی سے نہ ہوتا۔ لوجہ اللہ نہ ہوتا، لوجہ النفس ہوتا۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کا جو کچھ عمل تھا وہ اللہ کے لئے تھا، نفس کے لئے نہ تھا۔

حقیقتِ ولایت...... یہ دولت حضرات صحابہ کرام کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تزکیہ سے نصیب ہوئی۔ آپ نے ریاضتیں اور مجاہدے کرا کر دلوں کو مانجھا اور دلوں کی راہ درست کی نیتیں بھی صاف۔ منزلیں بھی صاف، غرض وغایت بھی درست، ہر عمل کھانا پینا، سونا جاگنا اللہ کے لئے ہو گیا۔ ان کی جوتیوں کی برکت ہے کہ اولیاء کرام میں بھی یہ چیزیں آئیں۔ ولایت کہتے ہی اس کو ہیں کہ قلب کا راستہ درست ہو جائے۔ ولایت کے یہ معنی نہیں کہ آدمی کھانا چھوڑ دے، لباس چھوڑ دے، گھر بار ڈھادے، گھر میں رہنا سہنا ترک کر دے، ولی کے معنی یہ ہیں کہ گھر میں رہے مگر حظِ نفس کے لئے نہیں۔ خدا کی رضا کے لئے، کھانا کھائے مگر نفس کی لذت کے لئے نہیں، رضائے خداوندی کے لئے۔ ایک ولی اور عامی میں یہی فرق ہوتا ہے تو عمل ولی اور عامی کا ایک ہوتا ہے، مگر قلب کا فرق ہے۔ نیتیں الگ الگ ہوتی ہیں، قلب کے مقامات کا فرق ہوتا ہے، تو اولیاء میں یہی چیز ہوتی ہے کہ وہ ہر بات لوجہ اللہ کرتے ہیں۔

حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ...... سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ یہ اولیائے کاملین میں سے ہیں اور بڑے اونچے رتبے کے اولیاء میں ہیں، حتی کہ اس درجہ کے لوگوں میں ہیں کہ خود سہل بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ: وہ جو حق تعالیٰ نے عالمِ ازل میں عہد لیا تھا "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟" آدم علیہ السلام کی کمر سے ان کی ساری اولاد نیک وبد نکالی گئی اور سب کو سامنے کر کے حق تعالیٰ نے عہد لیا۔ ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟﴾ "کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟" سب نے وہاں عہد کیا کہ بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ ہمارے پروردگار ہیں۔ یہ سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ اس درجے کے لوگوں میں ہیں فرماتے ہیں کہ: "مجھے آج تک وہ عہد یاد ہے۔ اور وہ مقام بھی یاد ہے جہاں یہ عہد لیا گیا تھا"۔

اس درجہ ان کی روح صاف ہے اور جلا لئے ہوئے ہے کہ عالم ازل کا نقشہ پیدائش کے بعد بھی ان کے ذہن میں تھا۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ مجاہدین کی ایک جماعت جا رہی تھی۔ تو ان کا ارادہ ہوا کہ میں بھی جہاد میں شریک ہوں کہ مفت میں ایک اتنی بڑی عبادت ملتی ہے تو ان کے نفس میں تقاضا پیدا ہوا کہ میں جہاد میں شریک ہو جاؤں، لیکن جب نفس میں تقاضا پیدا ہوا تو بیٹھ گئے اور کہا کہ یہ نفس کیوں چاہتا ہے کہ جہاد میں شریک ہوں۔ نفس کو تو جہاد سے بچنا چاہئے تھا نفس چاہے کہ میں عبادت کروں تو نفس تو اس درجے کی چیز نہیں وہ تو عبادت سے روکنے والی چیز ہے۔ ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ ①

نفس تو برائی کا امر کرتا ہے، نہ یہ کہ امر کرے کہ تم نماز پڑھو اور جہاد کرو اور اللہ کی راہ میں جان دے دو۔ نفس کو تو بچنا چاہئے۔ تو نفس میں کیوں یہ تقاضا ہے؟ کوئی مکر پوشیدہ ہے اور نفس کے اندر کوئی کھوٹ ہے غرض بیٹھ گئے اور بیٹھ کر سوچنا شروع کیا کہ آخر نفس کے لئے جہاد کے اندر کیا لذت کا سامان ہے کہ یہ نفس کہہ رہا ہے کہ جہاد میں چلو۔

تو ذہن میں یہ بات آئی کے مجھے چالیس برس روزے رکھتے ہوئے گزر گئے ہیں اور ایک دن بھی چالیس برس میں افطار نہیں کیا اور جہاد میں روزہ رکھ کر شریک ہونا مکروہ ہے، اگر رمضان بھی ہے تو بھی مستحب یہ ہے کہ افطار کرے تا کہ قوت سے جہاد کر سکے۔ بھوکا آدمی جہاد نہیں کر سکے گا۔ تو نفس کی مکاری یہ چھپی ہوئی تھی کہ چالیس برس سے مجھے بھوکا مار رکھا ہے۔ جہاد میں جاؤ گے تو دن میں کھانے کو روٹی تو مل جائے گی۔ یہ مکر پوشیدہ تھا۔ اب کھڑے ہوئے اور کہا اے نفس! میں جہاد میں جاؤں گا اور روزہ رکھ کر جاؤں گا۔ آج (افطار کرنے کے) مستحب کو انجام نہیں دوں گا چاہے مکروہ ہو مگر تجھے ستانا ہے اور تیرا مقابلہ کرنا ہے لہٰذا جہاد بھی کروں گا تو روزہ رکھ کر کروں گا۔ تجھے کھانے کو وہاں نہیں ملے گا۔ اس پر بھی نفس نے کہا تم چلو جاؤ جہاد میں، میں تیار ہوں۔

پھر بیٹھ گئے کہ یا اللہ! یہ نفس میں جہاد کا کیوں تقاضا ہے؟ یہ تقاضا قلب اور روح میں ہونا چاہئے یہ نفس کیوں تقاضا کر رہا ہے اسے تو جہاد سے بچنا چاہئے پھر بیٹھ گئے، غور اور مراقبہ کیا کہ آخر کونسا مکر نفس کے اندر پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے یہ کہہ رہا ہے کہ: جہاد کرو۔

تو سوچتے سوچتے ذہن میں یہ بات آئی کہ چالیس برس سے میں خلوت میں ہوں، آدمی کے نفس کا تقاضا لوگوں سے ملنا جلنا، انس و موانست حاصل کرنا ہوتا ہے۔ انسان کو مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے۔ یہ جانوروں کی طرح بھٹوں میں وحشت زدہ ہو کر الگ الگ نہیں رہتا۔ بستیاں بنا کر رہتا ہے۔ میل جول سے رہتا ہے تا کہ انس و موانست پیدا ہو۔ یہ تو انس کا بندہ ہے۔ اور اسی واسطے انسان کو انسان کہتے ہیں کہ انسان کا مادہ اُنس ہے جس میں انس نہ ہو وہ انسان ہی نہیں۔ تو انسان کا جبلی تقاضا انسیت و موانست ہے کسی عرب کے شاعر نے کہا ہے کہ:

وَمَا سُمِّيَ الْاِنْسَانُ اِلَّا لِاُنْسِهٖ وَمَا الْقَلْبُ اِلَّا اَنَّهٗ يَتَقَلَّبُ

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۵۳.

انسان کو انسان کہا ہی اسی لئے گیا ہے کہ اس میں انسیت اور موانست کا مادہ موجود ہے۔ جیسے قلب کو قلب اس لئے کہتے ہیں کہ قلب کے معنی لوٹنے پوٹنے کے ہیں۔ قلب میں چوں کہ ہر وقت کا لوٹ پوٹ ہوتا رہتا ہے کبھی یہ جذبہ، کبھی یہ خیال، کبھی یہ ارادہ، اس لئے قلب کو قلب کہتے ہیں۔ تو انسان انسان بنا ہی اس لئے کہ اس میں انس ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ چار آدمیوں کے ساتھ مل کر رہے۔ تنہائی میں اسے وحشت اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ تو چالیس برس سے سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ خلوت میں رہتے تھے۔ نفس چاہتا تھا کہ لوگوں سے مل جل کر رہیں، مگر بچتے تھے۔ تو نفس میں تقاضا جہاد کا ہوا کہ جب جہاد کریں گے تو چار آدمیوں سے ملاقات تو ہوگی۔ یہ جو تنہائی میں مجھے گھوٹ رکھا ہے۔ جہاد میں جا کے یہ تنہائی کی وحشت کچھ تو کم ہوگی۔ ایک خیمہ میں جب جمع ہونگے نو دس آدمی ہوں گے اور تو کچھ بات چیت کرنے کا موقع ملے گا، کسی میدان میں جمع ہوں گے تو ایک دوسرے کے ساتھ موانست حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آئے گا۔ تو یہ جو تنہائی کی وحشت کے ساتھ چالیس برس سے مجھے مار رکھا ہے۔ یہ مار تو ختم ہو جائے گی۔ اس لئے جہاد کا تقاضا پیدا ہوا۔

یہ گویا مکر تھا جو چھپا ہوا تھا۔ تو سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ پھر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ: ''اے نفس! اگر میں جہاد کو بھی جاؤں گا تو کسی شخص کی طرف نہ دیکھوں گا، نہ انس حاصل کروں گا، نہ کسی سے گفتگو کروں گا۔ تجھے خلوت ہی میں رکھوں گا اور تجھے اسی طرح مارنا ہے''۔

نفس نے کہا کہ: یہ بھی منظور ہے اگر تم جہاد کے لئے چلو، اب پھر بیٹھ گئے کہ یا اللہ کون سی ایسی مکاری چھپی ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ نفس جہاد کا تقاضا کر رہا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ سے دعاء کی کہ: اے اللہ! اس نفس میں ایسا باریک مکر ہے، جو مجھ پر منکشف نہیں ہوتا تو مجھ پر کھولے گا تو واضح ہوگا کہ کیا خباثت ہے اور کیا مکاری ہے جو چھپی ہوئی ہے کہ نفس چاہتا ہے کہ میں شریعت کے اعمال سرانجام دوں۔

ادھر سے الہام ہوا اور اب اصلیت کھلی اور وہ یہ کہ چالیس برس ریاضت اور مجاہدے میں گزر گئے تھے گویا نفس کو مار رکھا تھا "مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا." مرنے سے پہلے اسے مار دیا تھا۔ اس کی خواہشات کو کچل دیا تھا۔ اس کی مرضیات کو فنا کر دیا تھا تا کہ مرضی حق حاصل ہو۔ نفس پر یہ چیزیں شاق تھیں، تو نفس میں جہاد کا تقاضا اس لئے تھا کہ میدان میں جائے ایک دفعہ گولی لگے گی تو روز روز کی جھک جھک کا تو خاتمہ ہو جائے گا، بس ایک دفعہ ختم ہو جائیں گے۔ یہ جو روز کی موت ہے، یہ تو ختم ہوگی۔ جو ہونا ہوگا ایک دفعہ ہو جائے گا، ایک دفعہ تلوار پڑے گی، ختم ہو جائیں گے۔ یہ مکر پوشیدہ تھا۔

سہل ابن اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے توبہ کی اور کہا کہ یا اللہ میری نیت درست کر دے، جب نیت درست ہوئی تو جا کر مجاہدین میں شریک ہوئے اور جہاد کے لئے گئے۔

عمل بلا تزکیہ...... یہ کیا چیز تھی؟ یہ وہی تھا کہ نفس مانجھ کر اس درجہ صیقل بنالیا تھا اور حقیقی معنوں میں رضاء خداوندی

کا ادراک اور احسان جب تک نفس میں صفائی نہ ہو نہیں ہوسکتا، بعض دفعہ ایک عادت بصورت عبادت ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں عبادت کر رہا ہوں اور وہ نفس کی پرستش ہوتی ہے ایک صاحب باطن بتاتا ہے کہ اس کے اندر کھوٹ ملا ہوا ہے۔ یہ عبادت صحیح نہیں بنی۔ اس سے رضائے حق تعالیٰ حاصل نہیں ہوگی۔ تو اس کا ادراک ہو جانا اور اس کی سمجھ پیدا ہو جانا کہ نفس کی کیا خواہش ہے اور حق تعالیٰ کی کیا مرضی ہے کس جانب کو مجھے جانا چاہئے اور کس جانب کو ترک کرنا چاہئے؟

تو نفس کی باریک باریک خواہشیں اور مکاریاں ہوتی ہیں یہ اس وقت تک منکشف نہیں ہوسکتیں۔ جب تک نفس کے اندر صفائی نہ پیدا ہو۔ جب تک جلاء نہ پیدا ہو اور نورانیت نہ پیدا ہو اور یہ نورانیت بغیر مجاہدے اور بغیر ریاضت کے نہیں آسکتی۔ اس واسطے مجاہدے اور ریاضتیں کراتے ہیں تاکہ نفس میں استقامت پیدا ہو سیدھا پن پیدا ہو سلامتی قلب پیدا ہو تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو مجاہدے کرائے گئے ریاضتیں کرائی گئیں۔ اس کے ذریعے سے ان کے نفوس سے جو شرک کے نزغے تھے۔ وہ نکل گئے۔ وہ جو کج راہی تھی وہ نکل گئی۔ وہ جو غیر اللہ کی محبت میں سرشار تھے۔ وہ محبت ختم ہوئی۔

کمالِ استقامت...... اب انکی محبت تھی تو اللہ کے لئے، عداوت تھی تو اللہ کے لئے، دینا تھا تو اللہ کے لئے، لینا تھا تو اللہ کے لئے۔ کمال ایمان کمال استقامت سے پیدا ہوتا ہے جس کی حدیث میں ایک موقع پر فرمایا گیا: "مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ" "جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے کی، عداوت باندھی تو اللہ کے لئے، کسی کو دیا تو اللہ کیلئے کسی سے ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے، اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا"۔

تو دنیا میں آدمی جو کچھ بھی عمل کرتا ہے یا بچتا ہے تو اس کا منشاء یا محبت ہوتی ہے یا عداوت۔ جس کام کو آپ کرتے ہیں اگر رغبت ہوگی جب ہی تو آپ کریں گے، اگر نفرت ہوگی تو کیسے کریں گے تو کسی چیز کی رغبت ہونا اس کے کرنے کی دلیل ہے، کرنا اس سے محبت اور مرغوب ہونے کی دلیل ہے جس چیز سے عداوت ہوگی، اس سے آپ بھاگتے ہیں۔

تو کسی چیز کو نہ کرنا اس سے نفرت کی دلیل ہے تو فرمایا گیا کہ: جس نے رغبت کی تو لوجہ اللہ کی۔ نفرت کی تو لوجہ اللہ کی۔ رغبت اور نفرت کا تعلق نفسانی جذبات سے باقی نہ رہے۔ دیا کسی کو تو اللہ کے لئے، نہ دیا تو اللہ کے لئے، جب ہر حرکت اور سکون لوجہ اللہ بن جائے۔ تب کہا جائے گا کہ: نفس کامل ہو گیا۔ اس کا ایمان کامل ہو گیا۔

تفویضِ مطلق...... اس کے معنی اسلام کے ہیں یہی حقیقی اسلام ہے کہ جو کچھ ہو اللہ کے لئے ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا گیا تھا: ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ﴾ "اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ"۔

مسلم بننے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ معاذ اللہ اب تک آپ غیر مسلم تھے، اب اسلام قبول کریں، آپ تو پیغمبر ہیں، مسلم ہونے کے کیا معنی؟ یعنی گردن جھکا دو۔ جو کچھ کرو، ہمارے لئے کرو۔ اپنے نفس کے لئے کچھ مت کرو۔

مسلم بننے کے یہ معنی تھے یعنی تفویض کرنا، اپنے نفس کو سونپ دینا، اللہ کے حوالے کر دینا کہ جس طرح اس کی شریعت الٹ پلٹ کرے، اس طرح الٹ پلٹ ہو جاؤ تمہاری اپنی کوئی مرضی یا تدبیر باقی نہ رہے، تم ایسے بن جاؤ ''کَالْمَیِّتِ فِیْ یَدِالْغَسَّالِ'' جیسے مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جدھر کو کروٹ دے دے، مردہ یہ نہیں کہتا کہ: مجھے ادھر کو کیوں پلٹ دیا، جدھر کو بٹھا دے، لٹا دے، کروٹ دے دے، میت نہلانے والے کے اختیار میں ہے۔ اس طرح سے آدمی اپنے ارادہ و اختیار سے شریعت کے ہاتھ میں ہو۔ غیر ارادی طور پر تو اب بھی انسان اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ اسی کی مرضی سے اس کی حرکت اور سکون ہے، لیکن ارادے سے اپنے آپ کو سونپ دے کہ جدھر کو آپ چاہیں گے ادھر ہی کو میرا ارادہ متوجہ ہو جائے گا۔ یہ اسلام ہے۔ اس کو کہا گیا کہ۔ ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ﴾ ① ''اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ''۔ یعنی اپنے کو ہمارے حوالے کر دو جس طرح ہم الٹیں پلٹیں تم تیار رہو۔ ﴿قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② ''اے اللہ! میں مسلم بن گیا''۔

یعنی میں نے اپنے کو حوالے کر دیا۔ جس طرح سے آپ کا جی چاہے مجھ میں تصرف کریں۔ میری محبت ہوگی تو آپ کے لئے ہوگی۔ عداوت ہوگی تو آپ کی خاطر ہوگی نفس کی خاطر کچھ نہیں ہوگا۔

فرمایا کہ: جب تم مسلم بن گئے اور مان لیا تو دوسری جگہ فرمایا گیا کہ: اب اس اسلام کا اعلان کرو۔ وہ اسلام کیا ہے؟ ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ ③ ''اے ابراہیم! اعلان کر دو کہ میری نماز اور میرا حج میرا مرنا اور میرا جینا سب اللہ کے لئے ہے، میرے اپنے لئے کچھ نہیں''۔

جس کا کوئی شریک نہیں ہے تو میرے ان اعمال میں کوئی شریک نہیں، ایک ہی کی رضا کے لئے کر رہا ہے، چند کی رضا کے لئے نہیں، اور اسی کا مجھے امر کیا گیا ہے اور میں آج کے دور میں اول مسلم ہوں۔

تو اسلام کے معنی یہ نکل آئے کہ نماز بھی ہے تو اللہ کے لئے ہے، حج ہے تو اللہ کے لئے، مرنا ہے تو اللہ کے لئے، جینا ہے تو اللہ کے لئے، یعنی تفویض محض، اپنے آپ کو حوالے کر دینا ہے۔ اسلام کے یہی معنی ہیں کہ آدمی اپنے کو حوالے کر دے کہ نہ اس کی اپنی مرضی باقی رہے نہ اس کی اپنی رضا باقی رہے، رضا ہو تو اللہ کی ہو، ارادہ ہو تو اللہ کا ہو۔

فناءِ کلی ...... کسی غلام سے کسی نے پوچھا: تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا کہ: جو آقا کھلا دے۔ کہا: تو کیا پہنے گا؟ اس نے کہا: جو آقا پہنا دے۔ کہا: تو کام کیا کرے گا؟ کہا: آقا جو کام لے لے۔ اس نے کہا کہ: آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا: اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو میں غلام ہی کیوں بنتا!

پھر میں آقا ہی نہ بن جاتا۔ میرے غلام ہونے کے یہ معنی ہیں کہ میری مرضی بھی غلام میری رائے بھی غلام،

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱. ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱.

③ پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۶۲-۱۶۳.

میری خواہش بھی غلام،

اگر خواہش ہے تو آقا کی مرضی ہے تو آقا ہی کے لئے، ارادہ ہے تو آقا کا ہے۔ تو ایک انسان جب غلام بن کر اپنے کو دوسرے کے اس درجے حوالے کر دیتا ہے، حالانکہ دوسرا انسان اس کا خالق نہیں اس کا مالک نہیں، پھر بھی ذرا سے احسان کی بدولت حوالے ہوگیا۔ تو جو محسن حقیقی جو اللہ رب العزت ہیں، جس کا دعویٰ کیا ہے کہ میں اس کا غلام اور بندہ ہوں۔ اس کا بندہ بھی بنے اور تجویز بھی اپنی پیش کرے۔ اس کا بندہ بھی بنے اور اس کے سامنے پھر رائے بھی رکھے۔ یہ بندگی نہیں، دعویٰ بندگی ہے اور وہ غلط ہے۔ بندگی یہ ہے کہ کَالْمَیِّتِ فِیْ یَدِ الْغَسَّالِ مرضی حق کے تابع ہونا ہے۔

مرضی حق...... آج دنیا میں لوگ اللہ کو اپنے تابع کرنا چاہتے ہیں۔ خود اس کے تابع ہونا نہیں چاہتے۔ مرضی سوچ لیتے ہیں کہ ایسا ہو، استفتاء بھی کریں گے تو اس نیت سے کہ ہماری مرضی کے مطابق فتویٰ ہو اگر رائے بھی پوچھیں گے تو اس نیت سے کہ جو ہم چاہیں گے وہ تو اپنی جگہ قائم رہے اور دعاء بھی ہو تو اسی کے تابع ہو فتویٰ بھی ہو تو اسی کے تابع ہو۔ یہ تو اللہ کو تابع بنانا ہے۔ تو دعویٰ تو اپنے تابع ہونے کا ہے اور آدمی متبوع بن گیا اور چاہتا ہے کہ خدا اس کے تابع ہو تو یہ چلنے والی بات نہیں۔ تفویض کے بھی خلاف ہے اور اسلام کے بھی خلاف ہے مسلم ہونے کے تو یہ معنی ہیں کہ میں تابع ہوں مرضی حق کے میری مرضی کوئی چیز نہیں۔ فنائے مرضی ہی کا نام اسلام ہے فنائے خواہش ہی کا نام اسلام ہے اگر ہم میں ہماری مرضی زندہ ہے تو مسلم کب ہیں؟ اور اگر خواہش زندہ ہے تو حقیقی معنی میں مسلم کب ہیں؟ اس لئے فرمایا گیا کہ: اسلام یہ ہے کہ اپنے کو سونپ دو اور حوالے کر دو، یہ زندگی اگر صحیح معنی میں دیکھی گئی تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دیکھی گئی، اگر ان کی آنکھ اس چیز کو دیکھ رہی ہے اور اللہ و رسول اس کو کوئی اور چیز کہلوانا چاہیں تو آنکھ کو بے تکلف جھٹلانے پر تیار تھے مگر مرضی حق کو جھٹلانے کو تیار نہ تھے۔

① حدیث میں ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ: "اَیُّ یَوْمٍ ھٰذَا؟" "یہ کون سا دن ہے؟"۔

سب جانتے تھے کہ ۹ ذی الحج ہے۔ عرفہ کا دن ہے۔ حج میں جمع ہیں۔ تو سیدھا جواب یہ تھا کہ یوم عرفہ ہے، جواب کیا دیتے ہیں: "اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ" اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "اَیُّ بَلَدٍ ھٰذَا؟" "مکہ مکرمہ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ کون سا شہر ہے؟"۔

سب جانتے تھے کہ مکہ ہے، جواب یہ ہوتا کہ "مکہ" ہے مگر جواب کیا دیتے ہیں: "اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ" "اللہ و رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ کون سا شہر ہے"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَیُّ شَھْرٍ ھٰذَا؟" "یہ کون سا مہینہ ہے؟"۔ سب جانتے تھے کہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے جواب دے دیتے کہ ذی الحجہ ہے، مگر جواب میں یہ عرض کیا:

① الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب الخطبة ایام منی، ج: ٦ ص: ٢٢٨.

"اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ" "اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سا مہینہ ہے"۔

تابعین میں سے ایک شاگرد نے ان صحابی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ: یہ جواب آپ نے کیوں دیا۔ آپ کو قطعی علم تھا کہ یہ مکہ ہے۔ ذی الحجہ کا مہینہ ہے، نویں تاریخ ہے، تو نام لے کر بتاتے کہ فلاں شہر ہے، فلاں مہینہ ہے، فلاں تاریخ ہے، یہ کہنا کہ "اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ" یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں، آپ نے یہ کیوں کہا؟

حقیقتِ اسلام..... اس صحابی رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تفویض اسے کہتے ہیں۔ وہ صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ہم نے اس لئے کہا کہ:

اگر اس دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما دیتے کہ: یہ مکہ نہیں، مدینہ ہے۔ تو ہم کہتے کہ ہماری آنکھوں نے غلط دیکھا، بلاشبہ یہ مدینہ ہے، اللہ کا رسول غلط گو نہیں ہو سکتا اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما دیتے کہ یہ ذی الحجہ نہیں، محرم کا مہینہ ہے، ہم سب کہہ دیتے کہ ہم سب ایمان لائے، بلاشبہ محرم کا مہینہ ہے، ہمارا علم غلط تھا کہ ہم اسے ذی الحجہ سمجھ رہے تھے۔

اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیتے کہ یہ نویں تاریخ نہیں بلکہ ذی الحج کی بارہویں تاریخ ہے، ہم کہتے کہ بلاشبہ یہ بارھویں تاریخ ہے، ہم سے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے کہ یہ نویں تاریخ ہے۔

تو **تفویض مطلق** اسے کہتے ہیں کہ پیغمبر کی خبر کے مقابلے میں آنکھوں کو جھٹلانے کے لئے تیار ہو جائے، کانوں کو جھٹلانے کے لئے تیار ہو جائے کہ میرا کان غلطی کر سکتا ہے، میری آنکھ غلطی کر سکتی ہے، مگر خدا کا رسول تبلیغ حق میں غلطی نہیں کر سکتا۔ اس کو تفویض مطلق کہتے ہیں۔ اور فی الحقیقت یہ اسلام ہے۔

آج ہم اللہ و رسول کو اپنی خواہشات کا تابع بنانا چاہتے ہیں کہ اپنی مرضی پہلے متعین کر لی اور مسئلے کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کے مطابق کرنا چاہا۔ گویا خدا اور رسول کو اپنے تابع بنا رہے ہیں حالانکہ تابع بننے کا صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ درجہ حاصل کیا ہے کہ آنکھوں تک کو جھٹلانے کے لئے تیار ہیں۔ ہم تو خدا اور رسول کو اپنے خیال کا تابع بناتے ہیں، وہ مشاہدے کا بھی تابع نہیں بناتے۔ مشاہدے کو بھی اللہ و رسول کے تابع کرتے تھے کہ آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے اگر اللہ کے رسول اس کے خلاف فرما دیں گے، حق وہ ہوگا، آنکھ حق پر نہیں ہوگی۔ آنکھوں کی تکذیب کے لئے تیار ہیں۔

اللہ کے نام کے مقابلہ میں مشاہدہ کی تکذیب..... اور یہ تو یہ ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا بھی یہ طریقہ ہے کہ وہ اللہ کے نام کی وجہ سے اپنے مشاہدے کی تکذیب کر دیتے ہیں۔ سیر کی روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک چور کو دیکھا کہ وہ چوری کر رہا ہے اور دن میں دیکھا کہ وہ چوری کر رہا ہے، اور چیز اٹھا رہا ہے۔ آنکھوں سے دیکھ لیا، اس کو بلا کر پکڑ کر فرمایا: "ظالم! یہ دن دھاڑے چوری کرتا ہے تجھے شرم نہیں آتی"۔ اس نے کہا: "وَاللّٰہِ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ مَا سَرَقْتُ" "قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے میں نے چوری نہیں کی"۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: "صَدَّقْتُ رَبِّیْ وَکَذَّبْتُ عَیْنِیْ." "میں اپنے پروردگار کے نام کی تصدیق

کرتاہوں اوراپنی آنکھوں کوجھٹلاتاہوں۔'' بے شک تو نے چوری نہیں کی، جب تو نے اللہ کے نام پر حلف دیا تو اللہ کا نام سچا ہے۔ میں اس کی تکذیب نہیں کرسکتا۔ یہ اتباع کامل کا درجہ ہوتا ہے کہ جب اللہ کا نام بھی آ جائے۔ حالانکہ چور اس نامِ پاک کوغلط استعمال کررہاہے،مگر جرات نہیں کرتے کہ تکذیب کریں کہ خدا کا نام آگیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ خادم کوگوشت خریدنے کے لئے بھیجتے جب وہ لے کرآتا تو گوشت کی بوٹیاں گن لیتے تھے۔مثلاً ایک پیسے میں چھ بوٹیاں آنی چاہئے تھیں تو یہ چھ لایاہے یاپانچ لایاہے۔خادم کہتا کہ مجھ پر کیا اعتماد نہیں؟

فرمایا:اعتماد ہے،اپنے قلب کی تسکین اورتیرے ساتھ حسن ظن باقی رکھنے کے لئے میں یہ کام کرتا ہوں کہ گن لیتا ہوں۔ کسی نے کہا کہ: یہ خادم دھوکہ کرتا ہے اور یہ کم لے آتا ہے اور پیسے آپ سے زیادہ لے جاتا ہے،فرمایا کہ: وہ خادم اللہ کا نام لے کرکہتا ہے کہ میں پوراپورا لے کرآیاہوں۔اس نے کہا: وہ غلط نام لیتا ہے اورغلط حلف اٹھاتا ہے اورکم لے آتا ہے اورآپ کو دھوکہ دیتا ہے۔

فرمایا: ''مَنْ خَدَعَنَا فِی اللہِ اِنْ خَدِعْنَالَہٗ.'' ''جواللہ کانام لے کردھوکہ دے گا،ہم ضرور اس کے دھوکہ میں آئیں گے اللہ کے نام کو ہم نہیں جھٹلا سکتے''۔

عِلم،محبت اوراخلاق کا وظیفہ......اس کا تعلق عظمت سے ہے۔ جب اللہ کے نام کی اس درجہ عظمت پیدا ہو جائے کہ اس کے سامنے آنکھ بھی بے کار،کان بھی بے کار،باتیں بھی بے کار،اللہ ہی اللہ سامنے ہے،وہ حقیقی معنی میں قلب کی تفویض کا اوراسلام کا مقام ہے،یہ مقام حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اورتزکیہ سے دیاگیا تھاعلم کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسائل بتلائے اورتزکیہ کے ذریعے سے قلوب کاراستہ سیدھا کیا۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میری بعثت کی غرض وغایت کیا ہے؟''اِنَّمَابُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' ''میں معلم بناکربھیجا گیا ہوں،تاکہ علم کے ذریعے سے امت کوصحیح راستہ دکھلادوں''۔اور''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ'' ''میں بھیجا گیاہوں تاکہ اخلاق کو مکمل کرکے پیش کروں''

ان کواخلاق کریمانہ کامکمل نمونہ بنادوں اخلاق عمل کی قوت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ علم سے تو میں راستہ دکھلاتا ہوں اوراخلاق درست کرکے اس راستہ پرچلنے کی قوت پیدا کرتا ہوں۔علم آدمی کواس وقت تک نہیں چلاسکتا جب تک اخلاق درست نہ ہوں۔اخلاقی قوت سے ہی آدمی چلے گا۔علم کا کام فقط راستہ دکھلانا ہے۔

اگر ایک عالم بہت اعلیٰ علم حاصل کرے،مگرعمل کی طرف متوجہ نہیں تو راستہ اس نے دیکھ لیا،مگر محض علم اسے راستے پرنہیں چلاسکتا۔جب تک اس کے اندر چلنے کی اخلاقی قوت نہ ہو۔

اخلاق میں صبر ہے،شکر ہے،شجاعت ہے،رضا ہے تسلیم ہے یہ عملی چیزیں ہیں۔علم راستہ بتلادے گا کہ کرنے کا یہ طریقہ ہے۔اورنچنے کا یہ طریقہ ہے،لیکن اس طریقہ پرآدمی چل پڑے،چلادینا علم کا کام نہیں ہے۔یہ کام اندرونی

قوت کا ہے جو اخلاقی قوت ہے۔ اگر قلب میں محبت ہے آدمی شجاعت اختیار کرے گا۔ محبوب کی کے خاطر لڑے گا اور محبوب کے دشمنوں کو فنا کر دینا چاہے گا۔ معلوم ہوا کہ محبت اخلاق کو چلاتی ہے، علم نہیں چلاتا۔ اگر انسان کے اندر صبر ہے تو ظاہر بات ہے کہ جو مرغوب خدا کی خاطر اختیار کرے گا، اس پر جم جائے گا، گویا طاعت پر جمے گا اور صبر کرے گا۔ اس کے خلاف سے ہٹ جائے گا، یہ صبر محبت ہی کرائے گی، اگر حق تعالیٰ شانہ سے محبت نہ ہو تو عبادت پر آدمی صبر کیسے کرے؟ آپ نماز پر صبر کئے بیٹھے ہیں۔ سردی ہے، لحاف چھوڑ کر سردی کے زمانے میں نماز کے لئے آتے ہیں تو عبادت پر اتنا جمنا یہ محبت ہی سے تو ہے محض علم سے نہیں۔ علم نے تو راستہ دکھایا تھا کہ بھئی! اگر تم نے نماز پڑھ لی تو ثواب ملے گا، لیکن پڑھنا اور پڑھنے کے لئے اٹھنا۔ اور اپنے عیش و آرام کو چھوڑنا، یہ محبت کراتی ہے، علم نہیں کراتا ہے تو محبت اخلاق کو حرکت میں لاتی ہے، اخلاق عمل کو حرکت میں لاتے ہیں۔ تب جا کے آدمی عمل کرتا ہے۔

غرض ہر چیز کا ایک وظیفہ ہے۔ علم کا کام راہ دکھلانا ہے۔ محبت کا کام حرکت میں لانا ہے۔ اخلاق کا کام عمل کرا دینا ہے۔ ہر چیز اپنے اپنے دائرے میں عمل کرے گی۔ سارے کام آپ علم کے اوپر ڈال دیں کہ وہی راستہ دکھلائے، وہ چلائے، وہی گردن پکڑ کر آپ کو مسجد میں لے جائے تو ایک چیز سارے کام انجام نہیں دے سکتی۔ الگ الگ قوتیں ہیں۔ غرض تعلیم کے ذریعے سے علم پہنچتا ہے۔ تزکئے کے ذریعے سے اخلاق درست ہوتے ہیں اور محبت پیدا کرائی جاتی ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو وظیفے نکلے۔ ایک تعلیم اور ایک تربیت۔ تعلیم سے آپ مسائل پہنچاتے تھے۔ یہ جائز یہ ناجائز، یہ حلال یہ حرام۔ تزکیے کے ذریعے سے عمل کی قوتیں قلب میں فراہم کرتے تھے کہ اس حلال کے اوپر آدمی چل پڑے اور حرام سے بچنے لگے۔ جائز کے اوپر چل پڑے اور ناجائز سے بچنے لگے۔ یہ چیز تزکیہ اور احوال قلب سے متعلق تھی۔

قلب کی حالت اگر درست نہ ہو، فتنے میں پڑا ہوا ہو اور شکوک و شبہات میں پڑا ہوا ہو تو شکی آدمی کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ تذبذب اور تردد ہو گا تو کبھی عمل ظہور پذیر نہیں ہو گا۔ قوت یقین پہلے آئے، پھر آدمی چلے گا، اور اخلاق ابھاریں گے تو آدمی عمل کرے گا۔ اس واسطے دو وظیفے فرمائے گئے، گویا بعثت کی دو عرض و غایت نکلیں۔ ایک فرمایا: **"اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا"** "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ اور ایک فرمایا: **"بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ"** "میں بھیجا گیا ہوں تا کہ اخلاق کا مکمل نمونہ تمہارے سامنے رکھ دوں"۔

تا کہ تمہارے اخلاق صحیح ہو جائیں اخلاق کے بغیر عمل نہیں ہو گا، اور تعلیم کے بغیر علم نہیں آئے گا، جس سے جائز و ناجائز کا پتہ چلے۔

تعلیم بلا تربیت کا نقصان..... تو مجلس مبارک میں ایک طرف مسائل کی تعلیم ہوتی تھی جائز و ناجائز اور حلال و حرام بتلایا جاتا تھا اور رات کو نگرانی فرماتے تھے کہ عمل کیسا ہے، مجاہدے کراتے تھے تا کہ نفوس کا تزکیہ ہو جائے، اس کا تعلق جائز و ناجائز سے نہیں قلب کے احوال باطن سے ہوتا ہے۔ احوال باطن وہی درست کر سکتا ہے، جو

باطن کے ان مقامات سے گذرا ہوا ہو، جو اس راہ میں چلا ہوا نہیں ہے، وہ کس طرح سے اعمال باطن کو درست کرے گا، اسے خود اپنے اندر کا پتہ نہیں دوسرے کے اندرون کا کیا پتہ چلے گا

او خویشتن گم است کرار ہبری کند

اس واسطے جیسے ظاہری مسائل پوچھنے کی ضرورت ہے، باطنی احوال کے درست کرنے کے لئے بھی لوگ اہل باطن کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ وسوسوں کو دور کر کے قلب کی راہ کو درست کر لیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے مسائل کی تعلیم دی حلال و حرام، جائز و ناجائز کے دائرے کو بتلایا فرائض بتلائے، واجبات اور ان کی مقداریں بتلائیں، ان کے ادا کرنے میں جو خطرات اور وسوسوں کی رکاوٹیں پیدا ہوئی ہیں، ان کے رفع کرنے کی ذمہ داری بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے لی اور قلب کو درست کرنے کا طریقہ بھی آپ نے اختیار فرمایا۔ اس کا نام تعلیم ہے اور اس کا نام تربیت ہے، تربیت سے آدمی صحیح بنتا ہے، اگر تعلیم ہی تعلیم ہو اور علم ہی علم، تو کورے علم سے راستہ تو نظر آئے گا، مگر چلنے کی طاقت پیدا نہیں ہوگی۔

جیسے غالب نے کہا کہ۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد ۔۔۔ پر طبیعت ادھر نہیں آتی

آج کے دور میں بد عملی جہالت کی وجہ سے نہیں ہے۔ علم کے باوجود بد عملی ہے، علم کے راستے اتنے پھیل چکے ہیں کہ قدم قدم پر آدمی کو علم ہوتا ہے اور یہ کاغذ ہے، پیپر ہے، رسائل اور اخبارات ہیں، رات دن علم سامنے آرہا ہے، مگر رات دن بد عملی بڑھتی جاتی ہے، یہ بد عملی جہالت کے سبب سے نہیں ہے، بلکہ عدم تزکیہ کے سبب سے ہے کہ جب نفوس مانجھے ہی نہیں گئے اور قلب کے مقامات ہی درست نہیں ہوئے، دل کی کلیں ہی درست نہیں ہیں، تو جتنا بڑا علم ہوگا، اتنی ہی بڑی بد عملی بھی ہوگی، اس لئے جہاں ظاہری علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے، وہاں باطنی تربیت کی بھی ضرورت ہے اس کے بغیر آدمی چلتا نہیں ہے۔

اہمیتِ تزکیہ...... اگر یہ چیز ضروری نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں تزکیہ نہ رکھا جاتا۔ اور تربیت نہ رکھی جاتی۔ تو سب سے زیادہ ضرورت تربیت کی پڑتی ہے۔ اور تربیت کے ساتھ تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے اور ان دونوں چیزوں کا تعلق کسی منجھی ہوئی شخصیت کے ساتھ ہوتا ہے۔

تزکیہ میں شخصیت کی احتیاج...... آدمی یہ چاہے کہ میری تربیت کاغذ سے ہو جائے تو کاغذ اور کتاب تربیت نہیں کر سکتے، کاغذ میں تو کالے کالے نقوش ہوتے ہیں، ان نقوش کی مرادات کیا ہیں؟ یہ تو معلم سمجھا سکتا ہے اور مزکی بتلا سکتا ہے کاغذ نہیں بتلائے گا۔ چناں چہ کلام میں جو کیفیات ہوتی ہیں تو کاغذ میں حروف کا نقش آتا ہے، کیفیت تو نہیں آتی، بہت سی کیفیتیں ہیں جو طرز ادا سے تعلق رکھتی ہیں، کلام کے بہت سے ایسے معانی ہوتے ہیں جو طرز ادا، ہیئت کذائی اور لب و لہجے سے سمجھ میں آتے ہیں۔ اگر وہ ہیئت اور انداز نہ ہو کلام کا مطلب متعین نہیں ہوگا اور میں اس کی

مثال دیا کرتا ہوں کہ اردو کا ایک جملہ اس کے کئی معنی آتے ہیں اور سب کا تعلق لب و لہجے سے ہے وہ جملہ ''کیا بات ہے'' اس کے معنی استفہام واستفسار، تفحیم شان تحقیر شان، اور تعجب کے آتے ہیں، سب کا تعلق لب ولہجے سے ہے اگر لب ولہجہ سامنے نہ ہو تو معنی متعین نہیں ہو سکتے، اگر یہ جملہ کاغذ پر لکھ کر کسی دوست کے پاس آپ بھجوادیں تو کاغذ میں تو کالے کالے نقوش لکھے ہوتے ہیں، لب ولہجہ لکھا ہوا نہیں ہے، وہ اس سے جو سمجھے گا، وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی، بلکہ جو کیفیت اس پر غالب ہوگی وہ وہی معنی سمجھے گا، وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی وہ اس کی اپنی مراد ہوگی۔ وہ دنیا کو یہ کہہ کر دھوکہ دے گا کہ لکھنے والے کی یہ مراد تھی حالانکہ یہ غلط ہے، کلام اس کا تھا مراد اس کی اپنی تھی۔

ٹھیک اسی طرح سے قرآن وحدیث میں بہت سے مضامین کا تعلق لب و لہجے سے ہے، اور بہت سے مضامین کا تعلق شان نزول سے ہے، ان سب سے کٹ کر اگر محض قرآن وحدیث کے لکھے ہوئے الفاظ سامنے آجائیں، اور اس کا آپ مطلب لیں تو وہ مطلب آپ کا ہوگا اگر چہ لفظ خدا کے ہوں گے، اب آپ دنیا کو یہ کہیں کہ خدا نے یہ فرمایا۔ یہ دھوکہ دہی ہوگی، وہ تو آپ فرمارہے ہیں۔ اور دنیا کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اس لئے کہ خدا کا مطلب تو جب کھلتا جب خدا کی طرف سے کوئی بیان کرنے والا آکر اپنے لب لہجے، اپنے طرز ادا، اپنے ماحول اور اپنی کیفیت سے بیان کرتا۔ آپ کے سامنے ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں، حتیٰ کہ شانِ نزول بھی آپ کے سامنے نہیں، کالے نقش لکھے ہوئے آپ کے سامنے ہیں تو ماحول، کیفیت اور ہیئت کذائی آپ کی اپنی ہے، اور قرآن اور حدیث پر آپ نے تھوپ دی ہے۔ تو حقیقت میں وہ قرآن اور حدیث کا مطلب نہیں، وہ آپ کا مطلب ہے، لفظ آپ نے اللہ کے لئے اور مطلب اپنی طرف سے گھڑ لیا۔

اسی کو مٹانے کے لئے تعلیم وتزکیہ کو رکھا گیا ہے، کہ ایک شخصیت آکر تعلیم دے اور سمجھائے کہ یہ مراد ربانی ہے، اس واسطے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا گیا۔ تا کہ وہ کلام بھی سنائیں اور کلام سنا کر اس کا مطلب بھی بیان کریں کہ یہ اس کا مطلب اور مصداق ہے۔

مقاصدِ بعثت...... بہر حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اس لئے آئے ہیں کہ علم سے دنیا کو آراستہ کریں اور اس علم سے راہ حق نظر آئے، اور تزکیہ سے آراستہ کریں جس سے لوگوں میں اس راستے پر چلنے کی قوت پیدا ہو، اور عمل کا نمونہ سکھلائیں، تا کہ عمل من گھڑت نہ ہو۔ اس میں بھی لوگ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی سنت کے متبع ہوں۔ یہی چیزیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض وغایت ہیں اسی کے مجموعے کا نام تعلیم وتربیت ہے۔ اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ ایک حدیث میں ایک غرض ظاہر کی گئی فرمایا: '' اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' ''میں دنیا معلم بن کر بھیجا گیا ہوں''۔

وہ علم سکھلاؤں جس کے ذریعے سے لوگوں کو حق کا راستہ ملے، لوگ خدا تک پہنچیں۔ ان کے اخلاق اور کردار وکریکٹر درست ہوں۔ دوسری غرض یہ فرمائی: ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ''

میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تا کہ اخلاق کریمانہ کا اعلیٰ ترین نمونہ تمہارے سامنے رکھوں، اور عمل کر کے دکھلا

دوں، اور اخلاق کریمانہ کی ہیئت کذائی تم کو دکھلا دوں، اس کا نام تربیت ہے، اس کا نام تعلیم ہے، خلاصہ یہ نکلا کہ انبیاء علیہم السلام کی دنیا میں آنے کی غرض و غایت تعلیم و تربیت ہے ہر قوم اور ہر ملک میں نبی بھیجے گئے تا کہ دنیا کی قومیں علم سے محروم نہ رہ جائیں اور اخلاق سے محروم نہ رہ جائیں۔

اندازِ تعلیم و تربیت...... اور یہ تعلیم و تربیت کس شان بعثت سے کی؟ تو بعثت کی شان یہ ہے کہ اس میں رحمت کا غلبہ ہے، شریعت کے ایک ایک حکم سے رحمت ٹپکتی ہے، ایک ایک حکم میں شان رحمت رچی ہوئی نظر آتی ہے، غضب اور قہر رچا ہوا نہیں ہے، محبت کی آمیزش ہے عداوت کی آمیزش نہیں ہے، شفقت رچی ہوئی ہے، بیگانگی اور بے تعلقی رچی ہوئی نہیں ہے، انس موانست رچی ہوئی ہے وحشت رچی ہوئی نہیں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی، تربیت کی، اور ساتھ ساتھ وحشت سے بچایا، نفرتوں سے بچایا، انس و موانست کو پھیلایا، محبت و یگانگت پھیلائی۔

اندازِ حکومت..... حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہما کو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا۔ ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو قاضی القضاۃ، یعنی چیف جسٹس بنا کر بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں صحابیوں کو اونٹ پر سوار کیا اور خود پیدل ساتھ ہو لیے۔

ان کو رکاوٹ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدل چلیں۔ اور ہم سواری پر بیٹھیں مگر امر ارشاد تھا کہ نہیں تم بیٹھو، تو یہ اونٹ پر سوار ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدل ساتھ ہیں، میل بھر تک ساتھ تشریف لائے گئے اور مختلف نصیحتیں فرمائیں۔

فرمایا: جب تم یمن میں پہنچو گے تو تمہیں عیسائیوں کی رعایا ملے گی، وہاں کے سب باشندے عیسائی ہیں، تم وہاں جا کے کیا کام کرو گے۔ تو نصیحت فرمائی کہ: بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَيَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَتَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا.

عیسائیوں کی ریاست میں جا کر لوگوں کو بشارتیں سنانا، نفرتیں نہ دلانا آسانیاں بہم پہنچانا، لوگوں کو تنگیوں میں مبتلا نہ کرنا۔ مطاوعت، وحدت اور اتحاد پیدا کرنا، اختلاف کی راہیں مت ڈالنا کہ لوگ بکھر جائیں، تم ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کرنا، متفرق بنانے کی کوششیں مت کرنا۔

تو برائے وصل کردن آمدی   نے برائے فصل کردن آمدی

تم کو دنیا کے جوڑنے کے لئے بھیجا گیا ہے، دنیا کو توڑنے کے لئے تم کو نہیں بھیجا گیا، متفرقوں کو جمع کرنے کا کام تمہارا ہے، جمع شدہ کو متفرق کر دینا یہ تمہارا کام نہیں ہے، اور جمع کرنے کا معیار تمہاری ذات نہیں ہوگی، اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہوگا۔ اسی پر لوگ جمع ہو سکیں گے، تمہاری عقل پر جمع نہیں ہوں گے، تمہارے مزاج پر جمع نہیں ہوں گے، ہر شخص عقل رکھتا ہے ضروری نہیں ہے کہ دوسرے کی عقل کا تبع ہو، تم کہو گے میرا مزاج یہ ہے، دوسرا کہے گا میرا مزاج یہ ہے۔ لیکن جب آپ یہ کہیں گے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے سب گردن جھکا دیں گے وہ معیار ہے غرض تم لوگوں بشارتیں سنانا، نفرتیں مت دلانا۔ انہیں باغنا

متفرق کرنا اور گروہ سازی مت کرنا۔ سب کو ایک گروہ بنانے کی کوشش کرنا۔ کوئی از خود گروہ بنے یہ اس کا اپنا فعل ہے۔ تمہاری طرف سے اذن اور اعلان وحدۃ واتحاد کا ہونا چاہئے۔ تو شان رحمت ہے کہ لوگوں کو ملاؤ اور بانٹو مت، متفرق مت کرو ان کے سامنے ایسی چیزیں کہو کہ اگر ان کے قلوب بکھرے ہوئے بھی ہوں تو جڑ جائیں اور جمع ہو جائیں۔ ایسے کلمات ان کے سامنے مت کہو کہ ان میں گروہ بندی پیدا ہو جائے وہ بٹ جائیں، اور متفرق ہو کر ان میں نفرتیں پیدا ہونے لگیں، کسی ایک مرکز پر انہیں لانے کی کوشش کرو۔ تو یہ ہی شان رحمت ہے۔ غرض تعلیم دینا بھی شان رحمت ہے تربیت کرنا بھی شان رحمت ہے۔

رحمتِ مجسم...... لیکن اگر اس ضابطے کو فرض قرار دیا جائے تو اس تعلیم وتربیت کو جس شان سے ادا کیا گیا وہ شان تو رحمت ہی کی ہے۔ اور وہ شان انس وموانست اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً وَّلَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا'' ''میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں لوگوں کو دور کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا''۔

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا ہے جب غزوۂ احد کے اندر ستر صحابہ رضی اللہ عنہم کی لاشیں تڑپ رہی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر پتھر لگا۔ اور خون کی چادر منہ پر آ گری۔ دندان مبارک شہید ہو گئے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان کے لئے بددعا کیجئے کہ ان ناہنجاروں نے اللہ کے رسول کو زخم پہنچایا۔ سر مبارک پر زخم لگا۔ محبوب صحابہ رضی اللہ عنہم جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں، شہید ہو گئے، بددعا فرمایئے۔! اس پر فرماتے ہیں: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً وَّلَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا'' ''میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پھٹکار دینے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا''۔ اور فرماتے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ اغفر لقَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَایَعْلَمُوْنَ'' ① ''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت کر! یہ جاہل ہیں، جانتے نہیں ہیں''۔

اس موقع پر بھی رحمت ہی کا ظہور ہوا، یہ وہ اخلاق عظیم تھا کہ دوسرے گالیاں دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حق میں دعائیں کر رہے ہیں، دوسرے تلوار اٹھا کر زخم لگائیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان فیض ترجمان سے ان کے اوپر پھول برسائیں یہی ہے وہ شان رحمت کہ دوستوں کے ساتھ رحم کرتا تو ہے ہی، لیکن دشمنوں کے ساتھ جو رحم وکرم کرے اور دشمنوں کو جو نوازنے کی کوشش کرے، کہا جائے گا کہ وہی ''رحمتِ مجسم'' ہے۔ غرض ہر موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کے ساتھ وہ کیا جو آج دوستوں کے ساتھ بھی کیا جانا مشکل ہے۔

بہر حال بعثت کی شان رحمت کی ہے، اور بعثت کی غرض وغایت تعلیم اور تربیت کی ہے۔ یہی تین حدیثیں ابتداء میں پڑھی تھیں کہ ایک میں شانِ بعثت بتلائی گئی۔ دو احادیث میں بعثت کی غرض وغایت بتلائی گئی۔

''اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً'' میں شانِ بعثت ہے، کہ میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، اور ''بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' اور

---

① المعجم الكبير للطبراني، سهل بن سعد الساعدي، ج:۵، ص: ۳۸۹. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد، باب مقتل حمزة ج:۳ ص: ۱۵.

''بُعِثتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ'' میں غرض وغایت، یعنی تعلیم وتربیت ہے۔ یہ تین روایتیں میں نے پڑھی تھیں بقدرِ ضرورت ان کی تشریح کی ہے، ان سب کا مقصد اور گویا لب لباب اور حاصل یہ نکلتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقصد اصلی تعلیم وتربیت ہے۔

نیابتِ نبوی...... اور نبی کے بعد قوم نبی کے قائم مقام بنتی ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد یہ پوری امت نبی کے قائم مقام اور نبی کی نائب ہے، اس کا بھی اصلی فریضہ یہ ہے کہ یہ تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ ویسے دنیا میں بہت سے علوم ہیں، اور ہر علم مفید ہی ہے، لیکن حقیقی علم وہ ہے جو آدمی کو آدمی بنائے جو انسان میں اخلاق کے جوہر پیدا کرے، بہت سی تعلیمات ہیں جو سامان بناتی ہیں جیسے آپ سائنس پڑھیں گے تو بہترین قسم کے سامان بنائیں گے، فلسفہ پڑھیں گے تو دماغی ریاضت ہو جائے گی۔

ہندسہ اور انجینئرنگ پڑھیں گے تو بہترین قسم کے مکانات بنائیں گے، یہ سب چیزیں آپ کی ضروریات کی ہیں، اور اچھے اچھے سامان آپ کے لئے مہیا کریں گی، لیکن اچھے انسان بنانا ان علوم کا موضوع نہیں، اچھے سامان بنانا موضوع ہے، اگر آپ اچھا انسان بننا چاہتے ہیں تو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے نیچے آنا پڑے گا، نبیوں کی دنیا میں آنے سے غرض اچھا سامان بنانا نہیں، چھری، کانٹے بنانا نہیں ہے، یہ تو ضرورت کی چیزیں ہیں۔ جس طرح آپ چاہیں یہ خود بنالیں۔ ان کے آنے کی غرض یہ ہے کہ آپ کو انسان بنادیا جائے۔ انسان کے ہاتھ میں اگر چھری ہوگی تو دوست کے گلے پر نہیں چلے گی۔ دشمن کے گلے پر چلے گی، انسان کے ہاتھ میں اگر برتن ہوگا تو صحیح استعمال کرے گا، جانور کے آگے ہوگا تو اسے پھینک مارے گا، اس لئے آدمی اگر آدمی بن گیا تو سامان بھی کارآمد ہو گئے، اور اگر آدمیوں میں آدمیت نہ رہی تو یہ سامان وبالِ جان بن جائیں گے اگر دنیا میں کروڑوں روپے کا سامان بھرا ہوا ہے اور آدمی جانوروں کی مانند ہوں، جن میں نہ خدا کی پہچان، اور نہ رسول کی پہچان نہ حق و باطل کی پہچان، نہ انس و موانست، ایسے میں سامان اور زیادہ وبالِ جان ہیں۔

اور اگر ایک بھی سامان نہ ہو اور چٹنی روٹی پر گزر ہو، مگر آدمیوں میں انسانیت کا جوہر ہو، انس ہو، محبت ہو ہمدردی خلائق ہو وہ دنیا جنت ہے تو انبیاء علیہم السلام دنیا کو جنت بنانے آئے ہیں، جہنم بنانے نہیں آئے جہنم والوں کیا خلاق فرمائے گئے ہیں۔ ﴿ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ﴾ ①

جب کوئی پارٹی جہنم میں داخل ہوگی، دوسری پارٹی اس پر لعنت کرے گی کہ تم پر لعنت ہو تمہاری وجہ سے ہم مبتلا ہوئے، وہ کہے گی تم پر لعنت ہو تمہارے بہکانے کی وجہ سے ہم مبتلا ہوئے۔ تو جہنم کا عذاب ایک طرف، یہ لعن طعن خود ایک مستقل عذاب ہے۔

اور جنت والوں کے اخلاق بیان کئے گئے ہیں۔ ﴿ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴾ ②

---

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۳۸۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۴۷۔

بڑی بڑی مسندوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے اور دل ایسے ہوں گے، جیسے حقیقی بھائیوں کے ہوتے ہیں، ہر ایک کے دل میں محبت کھچی ہوئی اور رچی ہوئی ہے، تو انبیاء علیہم السلام محبتیں پیدا کرنے آئے ہیں عداوتیں پیدا کرنے نہیں آئے۔ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی ــــ نے برائے فصل کردن آمدی

اور یہ چیز بغیر رحمت اور شفقت کے نہیں ہوتی۔ تو امت کو بھی اسی طرح شفیق بننا چاہئے اپنوں میں بھی باہم اور اغیار کے حق میں بھی کہ انہیں ہدایت کریں اور انہیں سیدھا راستہ دکھلائیں، ایسی راہیں پیدا کریں کہ لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ ایک طرح محبت و اتحاد سے چلیں، اس میں قوم کی بھی قوت ہے، ملک کی بھی قوت ہے، جتنی پاکیزگی آپ کے نفوس میں بڑھے گی، جتنے پاکیزہ اعمال بڑھیں گے، آپ اپنی قوم کے لئے بھی مفید ثابت ہوں گے۔ ملک کے لیے بھی مفید ثابت ہونگے، اگر بدعنوانیاں رہیں تو قوم کے لئے بھی اور حکومت کیلئے بھی وبال جان بن جائیں گے۔ تو آدمی وہ ہے جو صحیح طور پر معاشرہ کے لئے آدمی ثابت ہو اور بہترین انسان ثابت ہو۔

احساس ذمہ داری...... بلاشبہ بہت سی چیزوں میں حکومت روک تھام کرتی ہے۔ چوروں کو پکڑتی ہے، ڈکیتوں کو پکڑتی ہے، قانون بناتی ہے، لیکن ساری ذمہ داری حکومت پر نہیں کچھ آپ پر بھی عائد ہوتی ہے، آپ کو بھی تو اپنے اخلاق درست کرنے ہوں گے۔ جہاں کوئی سپاہ اور سی۔ آئی۔ ڈی نہ ہو، اگر آپ تنہائی میں ہوں اور اخلاق دوست نہ ہوں، وہاں پھر آپ خیانت کریں گے، ایسا آدمی ہو کہ جب تنہائی میں ہو جب بھی نیک نفس ہو، مجمع میں ہو جب بھی نیک نفس ہو۔ یہ جب ہو سکتا ہے کہ جب اس کا نفس درست ہو جائے، ورنہ اگر انسان بدنفس ہے تو ڈر کے مارے مجمع میں خیانت نہیں کرے گا، مگر جب تنہائی میں جائے گا، خیانت اس کے ساتھ لگی ہوئی ہوگی وہ آدمی آدمی نہیں بلکہ آدمی کی صورت ہوگی۔ تو آدمی صورت انسان کا نام نہیں حقیقتِ انسان کا نام ہے ؎

گر بصورتِ آدمی انسان بُدے ــــ احمد و بوجہل ہم یکساں بُدے

اگر صورت سے آدمی آدمی بنا کرتا تو صورت انسان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل دونوں کی صورت انسان کی تھی، مگر زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے، وہ فرق حقیقت کے لحاظ سے ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت دیکھی جائے تو عرش کے اوپر پہنچی ہوئی ہے، اور ابوجہل کی حقیقت دیکھی جائے تو تحت الثریٰ میں پہنچی ہوئی ہے، صورتیں دونوں کی انسانوں کی ہیں یکساں ہیں۔ غرض صورت سے آدمی نہیں بنتا، حقیقت سے بنتا ہے اور یہ حقیقت انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے بنتی ہے۔ اس کے بغیر جوہر پیدا نہیں ہوتا، اس لئے جہاں آپ اور علوم کی طرف توجہ کریں بنیادی طور پر اس عمل کی طرف توجہ کرنا سب سے ضروری ہے، جس سے ہمارا جوہر درست ہو۔ اس واسطے یہ تین حدیثیں میں نے تلاوت کیں کہ تعلیم و تربیت تو اصل غرض ہے اور اس میں شفقت اور رحمت کی شان ملی ہوئی ہونی چاہئے۔ تب جا کے وہ تعلیم و تربیت صحیح معنی میں مفید ثابت ہوگی، حق تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں کہ ہم

تعلیم کے ذریعے سے علم حاصل کریں۔ تربیت کے ذریعے سے اخلاق درست کریں اور حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے اتباع کی توفیق عطاء فرمائیں۔ اور ہمیں اپنی مرضیات پر چلائیں۔ آمین۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَابَعْدَاِذْهَدَيْتَنَاوَهَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. اَللّٰهُمَّ اَعِذْنَامِنَ الْفِتَنِ مَاظَهَرَمِنْهَا وَمَابَطَنَ. اَللّٰهُمَّ مَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَاوَاَبْصَارِنَاوَقُوَّتِنَآ اَحْيَيْتَنَاوَاجْعَلْ ثَاْرَنَاعَلٰى مَنْ ظَلَمَنَاوَلَاتَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَافِىْ دِيْنِنَاوَلَاتَجْعَلِ الدُّنْيَآاَكْبَرَهَمِّنَاوَلَامَبْلَغَ عِلْمِنَاوَلَاغَايَةَرَغْبَتِنَآاَللّٰهُمَّ لَاتُسَلِّطْ عَلَيْنَامَنْ لَّايَرْحَمُنَااَللّٰهُمَّ زِدْنَاوَلَا تَنْقُصْنَاوَاَكْرِمْنَاوَلَاتُهِنَّاوَ اَعْطِنَاوَلَاتَحْرِمْنَاوَاٰثِرْنَاوَلَاتُؤْثِرْعَلَيْنَاوَاَرْضِنَاعَنْکَ وَارْضَ عَنَّا، اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَامُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَابِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرَخَزَايَا وَلَامَفْتُوْنِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖٓ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِکَ يَااَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ (حررہ ۸ جمادی الاولیٰ ۵۰۹)

عناصرِ سیرت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـــا بَعْــدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ﴿قَدْجَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۝ یَّھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِہٖ وَیَھْدِیْھِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ. صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ.

تمہید...... بزرگانِ محترم! یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی اس آیت کریمہ میں جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند بنیادی صفات اور چند بنیادی مقاصد وافعال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسی آیت کی مجھے مختصر طریق پر کچھ شرح آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنی ہے، مگر آیت کی تشریح سے قبل بطور تمہید ومقدمہ کے چند باتیں سمجھ لیجئے تا کہ اس کے بعد آیت کے مقاصد سمجھنے آسان ہو جائیں اور وہ یہ کہ جب انسان کسی بھی متعین منزل کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لئے چار باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان چار کے بغیر منزل مقصود تک آدمی نہیں پہنچ سکتا۔

1 ......سب سے پہلی چیز روشنی راہ ہے۔ راستہ میں روشنی اور چاندنا ہو جس میں آدمی راستہ قطع کرے اور روشنی بھی ایسی کہ نہ اتنی تیز ہو کہ نگاہوں کو خیرہ اور چکاچوند کردے کہ راستہ چلنا ہی مشکل ہو جائے، نہ اتنی دھیمی ہو کہ راستے کا نشیب و فراز ہی نظر نہ آئے، بلکہ معتدل روشنی ہو جس میں آدمی بے تکلف چل سکے، غرض سب سے پہلی چیز راستہ کی روشنی ہے۔

2 ......اس کے بعد خود راستہ ہے کہ جو سیدھا ہو اس میں ٹیڑھ اور کجی نہ ہو، جس میں آدمی بے تکلف چل سکے، اگر راستہ میں اونچ نیچ ہے اور گڑھے ہوں تو روشنی بھی ہوگی تو گر جانے کا اندیشہ ہوگا۔ اس لئے روشنی ہونے کے باوجود ضرورت ہوتی ہے کہ راستہ سیدھا ہو اونچ نیچ اور نشیب وفراز سے بری ہو۔

3 ......اس کے ساتھ ساتھ ایک تیسری چیز کی اور ضرورت پڑتی ہے کہ راستہ بھی سیدھا ہو اور ساتھ میں راہنما بھی

ہوا گر راہ دکھلانے والا کوئی نہ ہوتو محض روشنی اور راستہ کام نہیں دے سکتا۔ تو راہنما کی بھی ضرورت ہے کہ وہ ہاتھ پکڑ کر پہنچا دے۔ پھر چوتھی چیز ''راہ رَو'' ہے کہ روشنی، راستہ اور راہنما بھی موجود ہے لیکن چلنے والا موجود نہیں تو منزل مقصود تک کون پہنچے؟ اس لئے ضرورت پیش آتی ہے کہ خود راہ رو بھی ہو۔ غرض یہ چار باتیں ہیں کہ ان کے بغیر منزل مقصود تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اگر روشنی نہیں ہوگی اندھیرے میں چلنا دشوار ہوگا، روشنی ہو، مگر راستہ نہ ہوتو آدمی چلے کس چیز پر؟ راستہ بھی ہو مگر راہنما اور راہ دکھلانے والا کوئی نہ ہوتو پھر آدمی چلے کیسے؟ اور یہ تینوں چیزیں موجود ہوں، مگر چلنے والا کوئی نہ ہوتو منزل تک کون پہنچے؟

حصولِ منزل کی شرائط ...... دنیا میں بھی آپ جب کبھی کسی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں تو چند باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے، حق تعالیٰ نے آپ کے لئے روشنی کا بندوبست کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا﴾ ① ''برکت والی ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بروج بنائے اور سراج منیر یعنی سورج اور قمر منیر رکھا''

دن میں آپ سورج کی روشنی میں راستہ طے کرتے ہیں اور رات کو چاند کی روشنی میں راہیں قطع کرتے ہیں۔ اللہ نے آسمان پر دو بڑے روشن سیارے رکھ دیئے۔ اور فرمایا: ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ اور لاکھوں کروڑوں ستارے متعین کئے جس سے سمتیں متعین ہوتی ہیں اور آپ آسانی سے راہ قطع کر سکتے ہیں لیکن محض سورج کام نہ دیتا اگر زمین پر سڑکیں بنی ہوئی نہ ہوتیں۔ راہ ہی نہ ہو سورج تو نکلتا ہے لیکن پہاڑ ہیں نہ اس میں راستہ ہے۔ بڑے بڑے غار ہیں، کھڈ ہیں تو آدمی چلے گا تو اس کی جان کا خطرہ ہے۔ منزل مقصود پر کیسے پہنچے گا؟ دوسری چیز یہ ہے کہ راہ ہو اور مستقیم ہو جیسا کہ ایک موقع پر فرمایا گیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِىْ مَنَاكِبِهَا﴾ ②

اللہ، وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ذلیل کر دیا پست بنا دیا کہ تم اس کے راستوں پر چلو۔ اس میں راہیں بنائیں کہ جس پر چل کر آدمی منزل مقصود پر پہنچے۔ راستہ ہو مگر راہنما نہ ہو، راستہ قطع کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لئے راہنما کی بھی ضرورت ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔ جس کی حق تعالیٰ حکایت فرماتے ہیں: ﴿وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّىْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِىْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴾ ③

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب مدین کا ارادہ فرمایا تو کہا کہ: قریب ہے۔ اللہ مجھے راستہ دکھلائے گا۔ راہنمائی خدا کی ہوگی مجھے راستہ نظر آئے گا تو راستہ کے لئے راہنما کی ضرورت ہے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''اُطْلُبُوا الرَّفِيْقَ قَبْلَ الطَّرِيْقِ'' راستہ چلنے سے پہلے رفیق سفر متعین کرلو، جو تمہاری رہنمائی کرے۔

ظاہر بات ہے کہ راہ رو کی تو ضرورت ہی ہے۔ راستہ چلنے والا ہوگا تو ان تینوں چیزوں کا متلاشی ہوگا اور اگر

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۱۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۵۔ ③ پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۲۲۔

راہ رو ہی نہ ہو تو پھر کون چلے؟ غرض اصولاً کسی منزل تک پہنچنے کے لئے ان چار باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔

سفرِ روحانیت کی شرائط...... جب مادی راستوں میں ان چار چیزوں کی ضرورت ہے تو اللہ تک پہنچانے والا راستہ جو نہایت عظیم اور طویل ہے اس کے لئے ان چیزوں کی کیا ضرورت نہیں ہوگی؟ آپ معمولی سفر کریں تو یہ چار چیزیں ضروری ہوں اتنا طویل و عظیم سفر کہ بندہ اپنے خدا تک پہنچے، اتنا لمبا راستہ کہ اللہ کی ذات وراء الوریٰ اور بندہ ظلمت در ظلمت:

چہ نسبت خاک را عالم پاک

بندہ خدا تک جائے بلا راستہ، بلا روشنی اور بلا کسی راہنما کے پہنچ جائے اور بغیر اس جذبے کے پہنچ جائے جو اس کے دل میں راہ چلنے کے لئے ہونا چاہئے۔ لامحالہ ضرورت پڑے گی، بلکہ مادی راستوں سے زیادہ ضرورت پڑے گی۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تک پہنچنے کے لئے یہ دنیوی سڑکیں تو نہیں ہوں گی۔ حق تعالیٰ شانہ جو نورِ مطلق ہیں، مادیات سے بھی بالا، روحانیت سے بھی بالا، اس کی لطافت کے سامنے روحانیت بھی کثیف ہیں تو اس کی ذات بابرکات اور لطیف و خبیر ذات تک پہنچنے کے لئے راستے بھی معنوی ہونے چاہئیں اور نور بھی معنوی ہونا چاہئے۔ (اس راہ کو قطع کرنے کے لئے) سورج کی روشنی کام نہیں دے سکتی سورج کی روشنی ہمیں ہندوستان سے پاکستان، ایران و عرب پہنچا دے گی مگر اس سے عرشِ عظیم تک نہیں پہنچ سکتے۔ جنتوں تک نہیں پہنچ سکتے عالم برزخ تک نہیں پہنچ سکتے، تو جیسا عالم ویسی روشنی۔ اس لئے اللہ تک پہنچے کے لئے مادی راستہ کافی نہیں بلکہ روحانی و معنوی راستہ کی ضرورت ہے۔ اور ویسی ہی معنوی روشنی کی ضرورت ہے کہ وہ لطافت لئے ہوئے ہو۔ اس میں کثافت کا نشان بھی نہ ہو اور مادیت سے بالاتر ہو تو ظاہر بات ہے کہ اللہ تک آ پہنچنے کے لئے ایسا راستہ درکار ہے اور ایسی ہی رہنما درکار ہے اور راہ رو بھی ایسا ہی ہونا چاہئے، اس کے لئے فقط یہ پیر کافی نہیں کہ آدمی خدا تک چلا جائے وہ تو کوئی معنوی قوت ہونی چاہئے۔ تو مادی منزل کے لئے مادی راستے، مادی طریقے، مادی راہنما، اور عالم غیب تک پہنچنے اور اللہ سے رابطہ قائم کرنے کے لئے روحانی راستے روحانی، راہنما اور روحانی رہ گزر کی ضرورت پیش آئے گی۔

نورِ معنوی کی ضرورت...... تو حق تعالیٰ تک پہنچانے والی روشنی کون سی ہے؟ جس میں ہمیں صحیح طور پر نظر آ جائے کہ راستہ کیسا ہے؟ نشیب و فراز کیسے ہیں؟ اس کے لئے حق تعالیٰ نے ایک روشنی کا مینار بلکہ روشنی کا آفتاب روشن کیا، لیکن وہ مادی آفتاب ہیں بلکہ آفتاب نبوت ہے، جس کی روشنی میں آپ اللہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ ''وہ ذات ہے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی''۔ جبکہ دنیا میں اتنی اندھیریاں چھا چکی تھیں کہ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔

اس ظلمت میں حق و باطل میں امتیاز کرنا محال تھا۔ ساری علامتیں روشنیوں کی بجھ چکی تھیں۔ راستہ کے میل اور فرلانگ ختم ہو چکے تھے کہ جن سے راستہ کا پتہ چلے ظلمت ہی ظلمت پھیل چکی تھی کیفیت یہ تھی کہ بندے خدا اور مخلوق کا فرق مٹا چکے تھے۔ مخلوق کی ضعیف و ناقص اور عیب دار صفات خدا میں تسلیم کر لی تھیں اور خدا کی پاک صفات بندوں

میں مان لی تھیں۔ بندوں کو خدائی کے درجہ تک پہنچادیا تھا اور خدا کو بندوں کے درجہ تک لے آئے تھے۔

یہود و نصاریٰ کے عقائد کی ظلمت......ایک جماعت کہتی تھی کہ: اللہ میں وہ ساری صفات موجود ہیں، جو بندوں کی بشری صفات ہیں۔ آپ توراۃ کو پڑھیں گے جو آج چھپی ہوئی ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی اللہ میاں سے کشتی ہوگئی اور بہت سے داؤ پیچ کے بعد اسرائیل بالآخر غالب آ گئے خدا کو پچھاڑ دیا۔ (نعوذ باللہ)

لکھا ہے کہ: طوفان نوح جب آیا ہے تو فرشتوں نے جا کر اطلاع کی کہ وہ آپ کا کنبہ ڈوب رہا ہے۔ مخلوق ختم ہورہی ہے جب اور کچھ نہ بن پڑا تو خدا نے رونا شروع کر دیا اور اتنا روئے کہ آنکھیں دکھنے آ گئیں۔ فرشتے عیادت کے لئے پہنچے کہ اب مزاج کیسا ہے؟ اور آنکھوں کی سرخی کچھ کم ہوگئی یا نہیں؟ تو بندوں کی ساری ناقص اور عیب دار صفات خدا میں تسلیم کی ہوئی تھیں۔ جب کہ ایک قوم نے خدائی صفات بندوں میں مان لی تھیں۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا اور خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا تھا۔ (نعوذ باللہ)

نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کے لئے علم غیب تسلیم کرتے تھے۔ خدا کے لئے بیوی تجویز کی تو خصوصیات الوہیت وہ بندوں میں مان لی تھیں اور بندوں کی عیب دار صفات خدا کے اندر مان لی تھیں ایک قوم نے مخلوق کو خدا کا ظرف بنا دیا تھا کہ اس کے اندر حلول کرے اور طاریت کا عقیدہ پیدا ہوگیا تھا کہ جسموں میں خدا سمایا ہوا ہے تو مخلوق ظرف بنی اور خالق اس کا مظروف بنا اور ایک قوم نے خالق کو ظرف بنا کر مخلوق کو اس کے اندر سمایا ہوا کہا کہ مخلوق کی مثال ایسی ہے جیسا کہ گولر کے پیٹ میں بھندے ہوتے ہیں تو خدا کے پیٹ میں مخلوق مظروف ہے تو ایک نے مخلوق کو ظرف مانا اور خدا کو سمایا ہوا مانا یہ تو تجلی میں گت بنائی اور ایک نے خالق کو ظرف مانا اور مخلوق کو اس میں سمایا ہوا مانا یہ وحدۃ الوجود کی گت بگڑی۔ بہرحال دونوں قسم کے عقیدے پائے جاتے تھے۔ اور خالق و مخلوق کا فرق مٹ چکا تھا۔

تردیدِ عیسائیت......عیسائیوں نے کہا تھا کہ: حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ ① یہود نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا کہ عزیز ہی صرف خدا کے بیٹے نہیں بلکہ ہم سب خدا کی اولاد ہیں۔ ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ ② ہم تو خدا کے بھائی بھتیجے ہیں، تو ایک نہیں لاکھوں بیٹے مانے۔

مجھے اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ دارالعلوم دیوبند کا بالکل ابتدائی دور تھا اور صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جو ایک عالم باعمل ہی نہیں بلکہ عارف باللہ صاحب کشف و کرامت بزرگ بھی تھے۔ ان کے زمانے کا ایک طالب علم اتفاق سے ڈیرہ دون پہنچا۔ یہ متوسط درجہ کا تھی، یعنی دستار بندی نہیں ہوئی تھی، فاضل نہیں تھا، فارغ التحصیل نہ تھا، وہ کہیں ڈیرہ دون پہنچ گیا۔ وہاں ایک چوراہے پر کھڑا ہوا پادری تقریر کر رہا

① پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۳۰. ② پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۱۸.

تھااور یہ ثابت کر رہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ طالب علم اس سے الجھ پڑا کہا کہ: آپ غلط کہتے ہیں اور بحث شروع کر دی مگر پادری بڑا ہوشیار تھا اور یہ بیچارہ مبتدی طالب علم۔ اس کے مقابلہ میں بحث میں چل نہ سکا کئی جگہ اس نے طالب علم کو عاجز کر دیا۔ جس کا لوگوں پر برا اثر ہوا۔ انہوں نے کہا کہ: یہ کون جانے گا کہ یہ طالب علم ہے فاضل نہیں ہے، لوگ تو یوں کہیں گے ایک عالم آیا تھا اور پادری سے ہار کر چلا گیا۔ وہیں قریب ایک بھٹیارے کی دکان تھی۔ وہ فوراً دکان سے کود کر نیچے اترا اور اس نے طالب علم کو دھکا دے کر کہا کہ: ''مولوی صاحب! آپ کا کام اس جاہل سے بحث کرنا نہیں، جاہل سے جاہل نمٹ سکتا ہے، عالم کا کام نہیں ہے کہ جاہل سے نمٹے اس پادری سے بحث کرنا ہمارا کام ہے، آپ پیچھے ہٹیے۔'' اسے بھی غنیمت معلوم ہوا کہ وہ عاجز آ گیا تھا۔ بھٹیارا آگے بڑھا اور کہا کہ پادری صاحب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ: ''عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں'' کہا اچھا آپ اس دعویٰ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہا کہ: مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ اللہ میاں کی عمر کتنی ہوگی؟ کہا بے وقوف! بے ادبی کی بات کہتا ہے وہ تو ازلی ہیں۔ ابدی ہیں۔ انہیں عمر سے کیا تعلق؟ تو اس نے کہا: یہ مطلب ہے کہ بہت لمبی عمر ہے جس کی کہیں حد نہیں۔ کہا: ہاں! یوں سمجھ لیجئے۔

بھٹیارے نے کہا کہ اتنی عمر میں ان کی کتنی اولاد ہوئی؟۔ پادری نے کہا کہ صرف ایک بیٹا۔

بھٹیارے نے کہا کہ: ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ'' کہ میں بھٹیارہ باون برس کی عمر میں بارہ بچے جنوا چکا ہوں اور اللہ میاں کی اربوں کھربوں برس کی عمر اور کل ایک بیٹا۔ اس پر تالیاں جو پٹیں اور شور پڑ گیا کہ پادری ہار گئے، ہار گئے۔ لوگوں نے دھکے دے کر اس کو وہاں سے نکال دیا اور مسلمانوں کی فتح کا اعلان ہو گیا۔

یہ واقعہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے پاس پہنچا، فرمایا کہ: بھٹیارے نے بڑا عالمانہ جواب دیا، مگر وہ بے چارہ اصطلاحات سے واقف نہیں تھا اس لئے اس نے اپنی بات ایک عامیانہ زبان میں کہی مگر مقصد اس کا یہ تھا کہ اگر باپ بننا اللہ میاں کے لئے صفت کمال ہے اور اولاد ہونا اس کے لئے کوئی کمال کی بات ہے تو اس کی ہر صفت لامحدود ہونی چاہئے۔ اولاد بھی لامحدود ہونی چاہئے تھی جس کے عدد کی کوئی انتہا نہ ہوتی اور اگر اولاد ہونا خدا کے لئے عیب کی صفت ہے تو ایک بیٹا ہونا بھی عیب ہے وہ ایک سے بھی بری ہونا چاہئے۔ بھٹیارہ کا یہ مطلب تھا مگر وہ بے چارہ اصطلاحی الفاظ سے واقف نہیں تھا، اس لئے اپنے عامیانہ الفاظ میں کہا کہ: عمر کتنی ہوگی۔ اور ان کروڑوں برسوں میں لے دے کے کل ایک بیٹا۔ حالانکہ میرے تو اب تک بارہ بچے ہو چکے ہیں۔ بہر حال عیسائیوں نے ایک ہی بیٹے کا دعویٰ کیا تھا۔

ردِّ یہودیت...... یہود نے آگے بڑھ کر کہا: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ ''ہم سب اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔'' یہ گویا بھٹیارے کے مذہب پر چلے اس نے جو بحث میں کہا تھا کہ بہت سی اولاد ہونی چاہئے تھی تو یہود نے سمجھا کہ واقعی اللہ میاں کا کل ایک، بیٹا۔ ہزار دو ہزار، کروڑ دو کروڑ، تو ہونے چاہئیں۔ تو انہوں نے کہا

کہ: ہم سب خدا کے بیٹے ہیں۔ اور جو قومیں باقی رہ گئیں وہ بھی کچھ احباب میں ہیں کچھ بھتیجوں میں آ جائیں گے غرض اللہ میاں سے رشتہ داری قائم کر لی تو قرب خداوندی کی یہ گت بنائی کہ قرب بمعنی قرابت و راشتہ داری لے لیا اور کہا کہ: اللہ میاں کے قریب ہم بھی ہیں، یعنی اس کی اولاد ہیں، ہمارا نسب اس سے ملتا ہے۔

مشرکین کی تردید...... مشرکین مکہ نے بھی یہ دعویٰ کیا تھا کہ اللہ میاں کی اولاد ہوتی ہے مگر انہوں نے کہا تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں جس کا قرآن کریم نے جواب دیا کہ: ﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى o تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴾ ①

تم تو بیٹوں پر راضی، بیٹی ہو جائے تو ناک منہ چڑھاؤ اور اللہ میاں کے لئے بیٹیاں؟ کیا تم نے بھونڈی تقسیم کی ہے؟ جس کو اپنے لئے پسند نہیں کرتے۔ وہ ظالموں نے خدا کے سر تھوپ دیا۔ اگر اولاد ماننی ہی تھی تو کم از کم یہود کی طرح بیٹے تو مانتے۔ بہرحال مخلوق اللہ کی قدر نہیں جانتی تھی۔ خالق اور مخلوق کا فرق بھلا چکی تھی۔ اپنی عیب دار صفات خالق میں مان لی تھیں کہ ہم باپ ہیں تو وہ بھی باپ ہے۔ ہماری اولاد ہے تو اس کی بھی اولاد ہے۔ ہم کسی ظرف میں رہتے ہیں تو خدا بھی کسی ظرف میں رہتا ہے۔ ہم محدود ہیں تو معاذ اللہ وہ بھی محدود ہے گویا اس درجہ کو جہالت کی ظلمت پہنچ چکی تھی کہ علم کا نشان باقی نہیں رہا تھا۔

مسخ عقل...... اسی طرح اللہ کی صفات کے بارے میں اور اس کی توحید کے بارے میں مخلوق علم کو گم کر چکی تھی۔ توحید جیسی عقلی چیز جسے انسان عقلاً سمجھ سکتا ہے اسے سمجھنے کا شعور باقی نہیں رہا تھا۔ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کامل کا دعویٰ کیا تو مشرکین مکہ نے حیرت سے کہا کہ: ﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ﴾ ②

کیا کروڑوں دیوتاؤں اور خداؤں کو ایک ہی خدا، پیغمبر نے بنا دیا؟ کیا ایک خدا سارے آسمانوں اور زمینوں کا انتظام کر لے گا؟ ﴿ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ﴾

یہ تو عجیب بات ہے جو پیغمبر کہہ رہے ہیں، یعنی عجیب تو یہ تھا کہ شرک مانا جائے، مگر شرک رگ و پے میں اتنا سرایت کر چکا تھا کہ توحید عجیب معلوم ہونے لگی۔

توحید اجمالی...... توحید کا اجمال واقعی عقلی ہے۔ اگر انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام بھی دنیا میں تشریف نہ لائیں۔ تو انسان کی فطرت اجمالاً مالک کے ایک ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کلام لکھتے ہیں کہ: اگر کسی قوم یا فرد کو انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی دعوت نہ پہنچے پہاڑوں کی چوٹیوں میں گزر کر رہا ہو۔ کوئی ڈرانے والا پیغام حق لے کر اس تک نہ پہنچا اور اسی پر اس کی موت آ گئی تو قیامت کے دن توحید کا سوال اس سے بھی ہوگا۔ اگر اجمالی وہ اتنا کہہ دے کہ "میں اتنا جانتا تھا کہ ہاں ہے کوئی پیدا کرنے والا اور وہ ایک ہے تفاصیل تو انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام بتاتے ہیں۔ تفاصیل مخبر صادق کی خبر اور وحی کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتیں لیکن اتنا اجمال کہ کوئی پیدا کرنے والا ضروری

① پارہ ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۲۱. ② پارہ ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۵.

ہے اور وہ چند نہیں ہو سکتے دس بیس نہیں ہو سکتے یہ ایک فطری امر ہے، اور توحید عقلی ہے لیکن معقولات بھی اس دور میں ختم ہو چکی تھیں اس درجہ جہالت کی ظلمت چھا چکی تھی کہ توحید پیش کی تو کہا: ﴿ إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾ یہ پیغمبر نے کیا عجیب وغریب بات کہہ دی کہ ایک خدا سارے عالم کا انتظام کرلے گا۔

جہالت کی ظلمت ...... اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاد کو پیش کیا کہ دنیا ایک دن فنا ہو جائے گی۔ یوم آخرت آنے والا ہے۔ قیامت آنے والی ہے، تم سب کو وہاں جواب دہی کرنی پڑے گی۔ تو حیرت سے کہا کہ: ﴿مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ﴾ ① ''جب ہماری ہڈیاں گل سڑ کر بوسیدہ ہو جائیں گی۔ پھر کون ہے جو انہیں زندہ کرے اور اٹھائے؟'' ان کی سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ کوئی قادر مطلق موجود ہے تو جہالت کی ظلمت اس قدر قلوب پر چھا چکی تھی کہ توحید جیسی معقول چیز کو وہ عجیب بات سمجھے۔

بشریت انبیاء علیہم السلام ...... پیغمبر کی شان اور پیغمبر کی ذات کو بھی عجیب سمجھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں انہوں نے کہا تھا: ﴿قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ﴾ ②

یہ کیسا رسول آیا ہے کہ کھانا بھی کھاتا ہے، پانی بھی پیتا ہے، بازاروں میں بھی جاتا ہے۔ گویا رسول کا تصور ان کے نزدیک یہ تھا کہ بشریت سے بالاتر ہو۔ تو رسول کی ذات کے لئے بشریت کا انکار لازم سمجھتے تھے کہ رسول بشری نہیں ہو سکتا۔ بشری عوارض اس پر طاری نہیں ہو سکتے۔

حالانکہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام پر تمام بشری عوارض طاری کئے جاتے ہیں تاکہ لوگ ان پر خدائی کا شبہ نہ کرسکیں اس لئے کہ ایک طرف انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے ہاتھ پر معجزات ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے کہ اشارہ فرمائیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں۔ اشارہ فرمائیں تو بت آ کر وضو کے لئے پانی پیش کریں۔ درختوں کو اشارہ فرمائیں تو دوڑ کر آئیں اور سر مبارک کے اوپر سایہ کرلیں۔ پانی میں ہاتھ ڈال دیں تو انگلیوں سے چشمے بہہ پڑیں۔ جس سے پندرہ سو آدمی سیراب ہو جائیں۔ تو ایک طرف تو یہ افعال اور عجائبات قدرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر نمایاں ہوں۔ ایک طرف یہ کیفیت کہ بخار چڑھتا ہے تو شدید، اور فرمایا کہ جتنا تمہیں عام طور سے بخار آتا ہے۔ مجھے اس سے دوگنا آتا ہے۔ غزوہ احد میں سر مبارک پر پتھر لگ پڑا تو خون بہہ پڑا۔ ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔ لاشیں تڑپ رہی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ طائف پہنچے تو طائف کے شہدوں نے آپ کے پیچھے کتے لگا دیئے۔ پتھر مارے۔ پائے مبارک زخمی ہو گئے۔ سجدہ میں تھے کہ مشرکین مکہ نے عین حرم کے اندر اونٹ کا اوجھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر ڈال دیا۔ جس سے اٹھنا دشوار ہو گیا۔ کانٹے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستوں میں بچھائے گئے۔ سحر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کرایا گیا اور سحر کا اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو گیا۔ تو ایک طرف قدرت کے یہ کارنامے کہ اشارہ کریں تو چاند دو

① پارہ: ۲۳، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۷۸۔ ② پارہ: ۱۸، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۔

ٹکڑے ہو جائے۔ایک طرف یہ کیفیت کہ اوجھ گر جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ نہیں سکتے۔ایک طرف یہ کیفیت کہ انگلیوں سے چشمے جاری ہو جائیں اور ایک طرف یہ کیفیت کہ بیت نبوت میں دو دو مہینے دھواں بھی نہیں اٹھتا تھا کہ کھانے پینے کو کچھ مل جائے۔ یہ متضاد چیزیں کیوں رکھی گئیں اگر فقط معجزات دیئے جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر خدائی کا شبہ ہو سکتا تھا۔اس لئے حق تعالیٰ نے تمام بشری عوارض طاری کئے ،تاکہ انبیاء علیہم السلام کی بشریت کی کوئی نفی نہ کرے۔

عظمت انبیاء علیہم السلام......اور پھر فرما دیا گیا کہ: اپنی زبان سے اعلان کر دو۔﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ﴾ ①

کہہ دوائے پیغمبر کہ میں بشر ہوں اور بشر بھی فقط نہیں کہا بلکہ ”مِثْلُكُمْ“ فرمایا کہ تم جیسا بشر ہوں،یعنی جو تمہارا طریق پیدائش ہے۔ وہی میرا طریق پیدائش ہے۔ جو تمہارا طریق وفات ہے وہی میرا طریق وفات ہوگا جیسے تم پر عوارض بشریت آتے ہیں میرے اوپر بھی آتے ہیں۔تو میں بشر ہوں اور تم جیسا بشر ہوں۔ہاں! اللہ نے یہ بزرگی دے دی کہ مجھ پر وحی فرمائی۔مجھ پر اپنا کلام نازل فرمایا یہ میری خصوصیت ہے جو تم میں سے کسی کو نہیں دی گئی۔

تو یہ بزرگی خدا کی دی ہوئی ہے۔لیکن دی کس کو؟ بشر ہی کو دی ہے،لیکن اس بزرگی کے آنے کے بعد بشریت کا چولہ نہیں اتر گیا۔میں بھی اپنی وحی کا اسی طرح متبع ہوں جیسا کہ تمہیں اتباع کی دعوت دے رہا ہوں۔چنانچہ فرمایا:﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ﴾ ② میں کوئی انوکھا رسول نہیں آیا۔میں وحی کی اتباع کرتا ہوں۔جس طرح وحی خداوندی کے تم پابند ہو میں بھی پابند ہوں۔جس طرح تم قانون حق کے پابند ہو۔میں بھی پابند ہوں۔یہ تمام چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لئے پیش کرائی گئیں تاکہ واضح ہو جائے کہ آپ بشر ہیں۔

نفیٔ بشریت کا نقصان......اور حقیقت یہ ہے کہ بشریت کی نفی کرنا یہ بدقسمتی کی بات ہے۔ ہماری نوع میں اللہ نے وہ ذات بابرکات پیدا کی کہ تمام مخلوقات میں بڑھ چڑھ کر ہے یہ تو ہماری نوع کو خدا کا شرف ہے کہ ایسا شرف بخشا اور ہم اپنی نوع کی توہین کریں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے نکال دیں کہ آپ بالاتر ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی اور محرومی کی بات ہوگی۔ہم تو دلائل کی رو سے کہیں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے بشریت کی عظمت واضح ہو۔

بہرحال جہاں معجزات دیئے گئے وہاں عوارض بشریت بھی دیئے گئے تاکہ کسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر خدائی کا شبہ نہ ہو سکے۔

اظہارِ عبدیت کا امر......اسی لئے ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور فرمایا مامور ہو کر:﴿ قُلْ اِنِّيْ

---

① پارہ:۱۶،سورۃالکھف،الآیۃ:۱۱۰۔

② پارہ:۲۶،سورۃالاحقاف،الآیۃ:۹۔

لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا﴾ ① ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلان کر دیجئے کہ اگر اللہ میری پکڑ کرے تو کوئی مجھے چھڑانے والا نہیں اسی کا فضل وکرم مجھے چھڑا سکتا ہے“۔

اور اس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری چیز یہ ارشاد فرمائی کہ: ”لَنْ يُّنْجِيَ اَحَدَكُمْ عَمَلُهٗ“ تم میں سے کسی کا عمل کسی کو نجات نہیں دلا سکتا بجز اللہ کے فضل کے تو حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ”وَلَا اَنْتَ يَارَسُوْلَ اللهِ؟“ کیا آپ کو بھی آپ کا عمل نجات نہیں دلا سکتا، فرمایا: ”لَا اِلَّا اَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللهُ بِرَحْمَتِهٖ“ کہ مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ جب تک اللہ ہی کا فضل میری دستگیری نہ فرمائے۔ تو انبیاء علیہم السلام کی زبان سے یہ عبدیت کے کلمات اس لئے ادا کرائے جاتے ہیں تا کہ کسی کو ان کی الوہیت کا شبہ نہ ہو جائے۔ ان کی خدائی کا شبہ کسی کو نہ گزر جائے اس لئے یہ تمام چیزیں پیش آتی ہیں۔ ②

دورِ بعثت کا اجمالی حال..... غرض مشرکین میں نبوت کا تصور یہ تھا کہ وہ بشریت سے بالاتر کوئی چیز ہے کہ نبی نہ کھائے نہ پیئے تو کہتے تھے۔ ﴿مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ ③

بہر حال خدا کے بارے میں بھی رسول کے بارے میں بھی اس قدر ظلمت عالم پھیل چکی تھی۔ مکہ کے اندر بھی مکہ کے اردگرد بھی اور چہار طرف قلوب میں ظلمت اور اندھیری چھا گئی تھی۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: ”اِنَّ اللهَ نَظَرَ اِلٰى قُلُوْبِ بَنِيْ اٰدَمَ فَمَقَتَ عَرَبَهُمْ وَعَجَمَهُمْ“ ④ اللہ نے انسانوں کے دلوں کی طرف نگاہ کی تو غضبناک نگاہ سے دیکھا۔ کوئی شمہ خیر کا باقی نہیں رہ گیا تھا ”اِلَّا غُبَّرَ اَهْلُ الْكِتٰبِ“ اہل کتاب میں سے چند گنے چنے افراد جو حق کے اوپر قائم تھے، وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بیٹھ کر اپنے دین کو بچا رہے تھے۔ مخلوق سے الگ تھے۔ حق کے لئے عام مجامع کے اندر، عام اجتماعات اور عام بستیوں میں گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی تو حق پر جمنے کے لئے لوگ پہاڑوں کی کھوہ میں جاتے تھے تا کہ دین کو سلامت رکھ سکیں۔ تو عقائد، اعمال، اخلاق اور رسوم کی ظلمت پھیل چکی تھی۔ ہر طرف اندھیریاں چھا گئی تھیں۔ ان اندھیریوں میں ایک تیز روشنی کی ضرورت تھی کہ ان تمام ظلمات کے پردے چاک ہوں۔ اور روشنی سامنے آئے جس سے عقائد، اعمال اور احوال درست ہوں۔ تو اس شدید ترین اندھیری کو دفع کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔

شانِ تشریف آوری..... آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس شان سے دنیا میں تشریف لائے کہ آپ کے دائیں ہاتھ میں سورج تھا اور آپ کے بائیں ہاتھ میں چاند تھا۔ اکٹھی دو روشنیاں لے کر آپ تشریف لائے۔ غالباً آپ کو یہ شبہ ہو گا کہ ہم نے یہ کسی تاریخ میں نہیں پڑھا۔ کسی حدیث میں نہیں پڑھا کہ آپ کے ہاتھ میں چاند اور سورج ہوں۔ یہ

---

① پارہ: ۲۹ سورۃ الجن، الآیۃ: ۲۲. ② الصحیح لمسلم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب لن یدخل احد الجنۃ بعملہ بل برحمۃ اللہ تعالیٰ ج: ۴ ص: ۲۱۲۹. ③ پارہ: ۱۸، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷. ④ الصحیح لمسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا واہلہا، باب الصفات التی یعرف بہا فی الدنیا اہل الجنۃ واہل النار، ج: ۴ ص: ۲۱۹۷ رقم: ۲۸۶۵.

ایک نئی سی بات ہے۔ تو میں عرض کرتا ہوں کہ آپ صبر وسکون سے کام لیں۔ بلاشبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند تھا۔ سورج سے کیا مطلب ہے؟ یعنی دائیں ہاتھ میں اللہ کی چمکتی ہوئی کتاب تھی۔ اور بائیں ہاتھ میں قلب نبوت تھا۔ جس میں اخلاق کی روشنی بھری ہوئی تھی۔ کتاب اللہ کے اندر الوہیت کا جلال بھرا ہوا تھا۔ اگر فقط کتاب اللہ سامنے آئی اور پیغمبر نہ آتے تو الوہیت کا جلال مخلوق کو بھسم کر دیتا، مجال نہ تھی کہ کوئی اس کو سمجھ سکے اس کی روشنی کو قلب نبوت میں اتارا گیا تو نبوت کی عبدیت کے ساتھ جب الوہیت کا نور اس پر فائز ہوا تو ٹھنڈک پیدا ہوئی جس کو انسان سہ سکیں۔ تو سورج اللہ کی کتاب تھی اور چاند جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک تھا جو کمالات اخلاق کا مرکز تھا۔ اس طرح سے آپ دنیا میں تشریف لائے، یعنی جلال بھی تھا اور جمال بھی۔ خدا کی کتاب کے اندر جلال تھا اور قلب مبارک کے اندر شان جمالی تھی۔

جامعیت شریعت...... اس لئے شریعت مقدسہ میں دونوں شانیں موجود ہیں۔ رحمۃ للعالمین کی شریعت ہے جس میں عفو ودرگذر اور معافیاں بھی ہیں اور ساتھ ساتھ حدود وقصاص اور جہاد بھی ہے چور چوری کرے تو ہاتھ کاٹ دو، زانی زنا کرے تو سنگسار کر دو جہاں شریعت کے اندر رحمۃ للعالمینی ہے۔ وہاں جلالی شانیں اور تعزیرات و عقوبات بھی موجود ہیں۔ اسی لئے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**بُعِثْتُ مَرْحَمَةً وَّمَلْحَمَةً**" "میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں اور جنگ مجسم بنا کر بھی بھیجا گیا ہوں۔ مطیعوں کے لئے رحمت ہوں اور مجرموں کے لئے غضب مجسم ہوں"۔ اسی طرح فرماتے ہیں: "**اَنَا الضَّحُوْکُ الْقَتَّالُ**" میں بہت زیادہ ہنس مکھ بھی ہوں۔ اور بہت زیادہ قتال کرنے والا بھی ہوں۔ یعنی رحمت کی شان بھی ہے۔ اللہ کی رحمت میرے اندر سرایت کیے ہوئے ہیں اور غضب کی شان بھی ہے کہ خدا کے غضب سے اس کے منکروں کے مقابلہ میں غضب مجسم بنتا ہوں۔ غرض دونوں شانیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرمائیں۔ بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں روشنیاں لے کر آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات فی الحقیقت ایک نور ہے، کیسا نور تھی؟

حق وباطل میں امتیاز کا نور...... جیسی ظلمت آپ کے سامنے ابھی آئی ویسا ہی نور تھا۔ جہالت، اخلاق وعقائد کی ظلمت بنی آدم میں تھی جبلت کی شہوتیں، جبلت کی ظلمتیں یہ ایسی ظلمات ہیں۔ جن سے حق وباطل میں امتیاز نہیں ہوتا تو ان ظلمتوں کے لئے ویسے ہی نور کی ضرورت تھی کہ یہ ظلمتیں رفع ہوں۔ چاندنے میں حق وباطل نظر آئے۔ حق وباطل اس سورج کی روشنی میں نظر نہیں آتا۔ وہ پیغمبر کی روشنی میں نظر آتا ہے۔ جو علم اور کمالات اخلاق کی روشنی ہے۔ حقیقت میں نبوت نورانی ہے۔

غرض جس طرح کی ظلمتیں میں نے عرض کیں یہ ظلمتیں وہ نہیں ہیں جو سورج کے ڈوبنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ حسی اور مادی ظلمت ہے اور جہالت وبداخلاقی کی ظلمت یہ معنوی ظلمت ہے جو قلب میں پیدا ہوتی ہے جیسے حدیث

میں فرمایا گیا کہ ''اَلظُّلْمُ ظُلُمٰتٌ'' ① (ظلم یہ ظلمت وتاریکی ہے۔عدل روشنی ہے تو عدل کی روشنی سورج کی طرح سے نہیں ہے۔علم کی روشنی سورج کی روشنی کی طرح نہیں ہے، مگر سورج کی روشنی اس روشنی کے سامنے ماند ہے۔

سورج فقط مکان کو روشن کرتا ہے اور علم کی روشنی قلوب اور ارواح کو روشن کرتی ہے سورج سے فقط زمین اور مکان روشن ہوتا ہے، اور علم سے زمان، مکان اور اعیان سب روشن ہو جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نور خداوندی ہیں۔مگر مادی نور نہیں ہیں معنوی نور ہیں۔یعنی علم الٰہی کا پرتو جو آپ کے اوپر پڑا ہے وہ عالم میں کسی کے اوپر نہیں ڈالا گیا۔بعض روایتوں میں ہے کہ: ''اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ'' ② اس روایت کو بعض نے ضعیف اور بعض نے موضوع کہا ہے لیکن اس کا مضمون صحیح ہے، کیوں کہ قرآن کریم نے دعویٰ کیا کہ: ﴿قَدْجَآءَ کُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ﴾ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور پہنچا۔اور نور سے مراد ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو ''اول ماخلق اللہ نوری'' کو دیکھا جائے تو اگر چہ حدیث موضوع بھی ہو مگر مضمون کے لحاظ سے صحیح ہے، کیوں کہ قرآن کے ساتھ موید ہے۔ بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں۔مگر معنویت کا نور ہیں۔ روحانیت کا نور ہیں۔ اخلاق کا نور ہیں۔کمالات خداوندی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر ظہور کرتے تھے۔ جلوہ کرتے تھے اس کی روشنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر تھی، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مظہر اتم تھے۔ اللہ کے کمالات کے جس طرح سے یہ بجلی کی روشنی آپ کے سامنے ہے۔ فیوز جو ہے اس کے اندر ایک بہت معمولی سا تار ہے، لیکن جب اس کا کنکشن پاور ہاؤس سے ہو جاتا ہے تو وہ اتنا روشن ہو جاتا ہے کہ میدانوں کو چمکا دیتا ہے۔ تو اصل میں روشنی پاور ہاؤس سے آتی ہے۔ خود اس کے تار کے اندر روشنی نہیں ہے لیکن منور ہو کر تار کی ہستی نظر نہیں آتی۔ روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے۔ایسے میں اگر تار کہہ دے: ''اَنَا النُّوْرُ'' میں تو خود نور ہوں۔ تو وہ کہہ سکتا ہے لیکن حقیقت میں نور اور ہے اس کی ذات اور ہے اس کی ذات پر، نور نے جلوہ کیا ہے۔ وہ نور کا مظہر بن گیا۔ اسی واسطے نور بھی کہہ جا سکتا ہے اور جب ذات کی طرف نگاہ جائے گی تو کہا جائے گا کہ میں تو تار ہوں۔ روشنی دوسرے کی ہے جو میرے اندر آ رہی ہے۔ انبیاء علیہم السلام وہ صلاحیتیں لے کر آتے ہیں کہ علوم خداوندی ان کے اندر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اخلاق ربانی ان کے اندر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ تو یہ نور معنوی نور ہے جیسا کہ وہ ظلمت معنوی ظلمت تھی۔ معنوی ظلمت کے رفع کرنے کے لئے معنوی نور کی ضرورت تھی۔ آفتاب کا نور اسے زائل نہیں کر سکتا تھا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات نور بن کر آئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو دیکھ کر مخلوق نے یہ سمجھ لیا کہ حق یہ ہے، باطل یہ ہے، نیکی اسے کہتے ہیں، بدی اس کہتے ہیں۔ آپ کے اعمال، اخلاق اور پاکیزہ کردار کو دیکھ کر دنیا کے سامنے معیار آ گیا اور سمجھا کہ نیکی کس چیز کا نام

---

① الصحیح للبخاری، کتاب المظالم والغصب، باب الظلم ظلمات یوم القیامة، ج: ۲ ص: ۸۶۴ رقم: ۲۳۱۵.

② قال العلامة اللکهنوی: وقد اشتهر بین القصاص حدیث "اول ماخلق الله نوری" وهو حدیث لم یثبت بهذا لمعنی وان ورد غیره موافق له فی المعنیٰ دیکھئے: الآثار المرفوعة ج: ۱ ص: ۴۳.

ہے۔خلق حسن کس چیز کا نام ہے۔کمال کس چیز کا نام ہے۔عیب کس چیز کا نام ہے۔

گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ تک پہنچنے کے راستہ کے لئے روشنی تھے۔اس کے بغیر راستہ نظر نہیں آ سکتا تھا۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشعل نور بن کر تشریف لائے اور راہ خداوندی لوگوں کے سامنے کھل گئی۔

راہنمائے حق......راہنما کیا چیز ہے؟ حقیقت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تو مشعل نور ہے جس سے راہ کھلی، لیکن راہ کے لئے راہنما کی بھی ضرورت ہے تو راہنما آپ کی سنتیں۔آپ کے افعال اور کردار ہیں۔اسوہ حسنہ جس کو سیرت کہا جاتا ہے۔وہ اسوہ حسنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور احوال کا مجموعہ ہے۔فی الحقیقت وہ راہنما ہے تو یہ ایک نور راہ آیا جس سے راستہ روشن ہوا اور ایک راہنما آیا۔وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے جو راہنمائی کرتی ہے کہ اس طرح سے چلو۔

اسوۂ عمل......آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر جو اعمال کا نمونہ پیش کیا فقط آپ نے قانون نہیں پیش کر دیا۔قانون کے ساتھ اپنا اسوہ بھی پیش کیا۔آپ نے فقط یہ نہیں فرمایا کہ "صَلُّوْا" نماز پڑھو بلکہ یہ فرمایا کہ: "صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ" نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔اسی نمونے کی نماز پڑھو۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نمونہ عمل بن کر دنیا کے اندر آئے۔آپ کی سیرت عمل کے لئے راہنما تھی جس کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہوگی وہ نماز صحیح پڑھے گا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سامنے نہیں ہوگی۔نماز صحیح نہیں پڑھ سکتا۔تو یہ نہیں فرمایا کہ "صَلُّوْا" بلکہ فرمایا: "صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ" اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا۔فقط آرڈر نہیں دیا بلکہ وضو کر کے دکھلایا ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا۔تو تمام اعضا کو ایک ایک دفعہ دھویا۔اور فرمایا: "هٰذَا وُضُوْءٌ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلٰوةَ اِلَّا بِهٖ" یہ وضو ہے جس کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں کرتے۔اگر ایک دفعہ بھی اعضا کو نہ دھویا جائے تو وضو ہی نہ ہوگا۔اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ وضو فرمایا اور اعضاء کو دو دو مرتبہ دھویا اور فرمایا کہ یہ وضو ہے جو "نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ" ہے۔اور اس کے بعد تیسری مرتبہ وضو کیا۔تو تین تین دفعہ اعضاء وضو کو دھویا، اور فرمایا کہ: "هٰذَا وُضُوْئِيْ وَوُضُوْءُ الْاَنْبِيَآءِ مِنْ قَبْلِيْ" یہ میرا وضو ہے اور میرے سے پہلے جتنے انبیاء تھے وہ یہی وضو کرتے تھے۔

ضرورتِ مربی......تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقط یہ نہیں فرمایا کہ: "تَوَضَّؤُوْا" لوگو وضو کرو بلکہ کر کے دکھلایا کہ اس طرح سے کرو کیوں کہ عمل کی بہت سی خصوصیات ہوتی ہیں جو بلا عامل کی ہیئت کے سمجھ میں نہیں آ سکتیں، الفاظ سے آدمی عمل کی ہیئت نہیں بنا سکتا۔جب تک کہ عمل کی ہیئت سامنے نہ ہو۔دین ہی میں نہیں بلکہ ہر صنعت میں ہر حرفت میں یہی طریقہ ہے کہ محض اصول اور کتاب کافی نہیں ہوتے جب تک کر کے دکھلانے والا کوئی مربی اور استاد سامنے نہ ہو۔خیاطی کا فن ہے۔آپ پانچ سو صفحے کی کتاب پڑھ جائیں۔جس میں یہ اصول ہوں کہ کپڑے سینے کے یہ یہ طریقے ہیں لیکن جب تک درزی کو سوئی چلاتے ہوئے نہیں دیکھیں گے آپ کو سوئی چلانی

آئے گی نہیں کیوں کہ عمل کی ایسی باریکیاں ہوتی ہیں جو کاغذ پر نہیں آسکتیں کر کے دکھلانے والا جب تک اس ہیئت سے کر کے نہ دکھلائے۔

اسی واسطے حضرات محدثین نے جہاں جہاں احادیث کی روایت کی ہے وہاں خود بھی عمل کر کے دکھلایا ہے اور اپنے عمل کو روایت کے مطابق کیا ہے۔ میں نے مشکوۃ شریف اپنے والد بزرگوار رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی مشکوۃ شریف میں جب یہ باب آیا کہ نماز کس طرح پڑھنی چاہئے، تو رکوع کی بحث آئی تو رکوع کی روایت کو پڑھ کر اور اسے سمجھا کر خود والد مرحوم نے جماعت کے اندر رکوع کر کے دکھایا کہ یوں کرنا چاہیے، جب سجدے کی روایت آئی تو اسے پڑھا کر سجدہ کر کے دکھلایا کہ یوں کرنا چاہئے، تو ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ ہم تو رات دن رکوع وسجدہ کرتے ہیں۔اس میں درس کے دوران جماعت میں کر کے دکھلانے کی کیا ضرورت تھی؟

فرمایا کہ: یہ میں نے اس لئے دکھلایا کہ جب میں نے مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی تھی تو انہوں نے بھی مجھے یونہی کر کے دکھلایا تھا اور فرمایا کہ: جب میں نے شاہ عبدالغنی محدث دہلوی سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی اس موقع پر یونہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: جب میں نے شاہ اسحاق صاحب سے حدیث پڑھی تو انہوں نے بھی مجھے یوں ہی کر کے دکھلایا تھا اور شاہ اسحاق صاحب نے فرمایا کہ: جب میں نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے حدیث پڑھی تو انہوں نے حدیث سمجھا کر یوں ہی رکوع اور سجدہ کر کے دکھلایا تھا اور کہا کہ: مجھے شاہ ولی اللہ نے یونہی کر کے دکھایا تھا اور شاہ ولی اللہ نے کہا کہ: مجھے شیخ ابو طاہر مدنی نے یونہی کر کے دکھلایا تھا اور آخر تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچادی۔

تسلسل ہیئت عمل ...... تو محدثین جہاں الفاظ کی روایت کرتے ہیں وہاں ہیئت عمل کو بھی کر کے دکھاتے ہیں، یعنی الفاظ فقط اصول کا نام نہیں، بلکہ تاریخ بھی اس کے ساتھ وابستہ ہے۔کوئی قانون قانون نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ اس کی تاریخ نہ ہو۔تو روایات حدیث کے ساتھ امت کا تعامل بھی موجود ہے۔اس میں اس عمل کے بارے میں راہنمائی ہوتی ہے۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عمل کیا صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس عمل کی نقل کی تابعین نے اس عمل کی نقل کی روایت بھی پیش کی۔

اسی واسطے بعض روایات جو مسلسل بالاولیات کے نام سے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی روایت کو ظاہر فرمایا اور ایک حکم دیا اور اسی مجلس میں اس کو کر کے دکھلایا تو محدثین روایت کے ساتھ ساتھ سند اور اس کو کر کے دکھاتے چلے آتے ہیں۔

مثلاً حدیث "مُسَلْسَل بِالْمَاءِ وَالتَّمر" یہ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی فضیلت بیان کی اور بیان کر کے خود کھائی اور اپنا اولش (کھجور کا بقیہ) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیا اور کٹورے میں پانی پیا اور بچا ہوا پانی عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو پلایا۔عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے

اپنے شاگرد کو کھجور کی فضیلت کی یہ حدیث سنائی تو فضیلت بیان کر کے اسی طرح کھجور کھائی اور بقیہ نصف اپنے شاگرد کو کھلائی اس طرح پانی پیا اور بچا ہوا اپنے شاگرد کو پلایا۔ اسی طرح تابعین نے تبع تابعین کو، تبع تابعین نے اتباع تبع تابعین کو کہا یہاں تک کہ سند ہم تک پہنچ گئی۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث سہارنپوری اکابر علماء میں سے گزرے ہیں۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور جو مشہور ہے۔ اس کے حضرت صدر مدرس تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ کے خلفاء میں سے تھے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ حضرت مولانا کے ساتھ سفر میں ساتھ ہوا۔ حضرت میرٹھ جا رہے تھے راستے میں مجھ سے فرمایا کہ: اس وقت میری حدیث کی سند پوری جماعت میں سب سے زیادہ عالی اور بلند ہے میں ایک واسطے سے حضرت شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد ہوں۔ تو میرا جی چاہتا ہے کہ تجھے سند کی اجازت دوں اس کے لئے تو خود سہارنپور آ کر اجازت لے، میں نے عرض کیا کہ: حضرت میں ضرور حاضر ہوں گا۔ لڑکپن کی بات تھی اور ابالی پن کی وجہ سے بھول بھال گیا۔ ایک برس گزر گیا پھر اتفاق سے سفر میں ساتھ ہوا۔ پھر یہی ارشاد فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ اب میں حاضر ہوں گا پھر برس چھ مہینے کے قریب گزر گئے، چھ مہینے کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت مولانا ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لئے جا رہے ہیں۔ اب میں نے سوچا کہ اگر یہ سند نہ لی تو میں محروم ہو جاؤں گا۔ اس لئے میں نے سہارنپور کا سفر کیا حضرت بہت خوش ہوئے۔ مولانا محمد زکریا صاحب جو آج مظاہر العلوم کے شیخ الحدیث ہیں سے فرمایا کہ حدیث کی جتنی کتابیں مظاہر العلوم کے کتب خانے میں ہیں وہ سب لے آؤ۔ تو ساری صحاح ستہ معاجم، مسانید اور سنن سب کتابیں آ گئیں اور اجازت دی تو حضرت نے بہت سی کتابوں کا اول مجھ سے پڑھوایا اور بعض کتابوں کو خود پڑھا اس کے بعد فرمایا کہ مسلسل بالاولیات بھی لے کر آؤ تو الیانع الجنی لائی گئی جس میں وہ روایتیں جمع ہیں۔ جو اولیات کے ساتھ مسلسل ہیں جن میں عمل کے ساتھ ہیئت عمل کی ضرورت ہے تو کھجور بھی منگوایا اور عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بیان کی کہ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی فضیلت بیان کر کے خود کھائی اور انہیں کھلائی پانی پیا اور بچا ہوا پانی پلایا۔ تو خود کھجور کھا کر مجھے کھلائی، خود پانی پیا اور بچا ہوا مجھے پلایا۔ اس عمل کی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک ملا دی غرض محدثین جہاں حدیث کی روایت کرتے ہیں وہاں اس کے تعامل کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ اس کی صفات اور کیفیات کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ حدیث کے درس میں جب "رَنَّةُ النِّيَاحَةِ" ① کی حدیث آئی یہ زمانہ اہلیت میں رسم تھی کہ جب کوئی بڑا آدمی مر جاتا تھا تو وہ وصیت کر کے مرتا تھا کہ مجھ پر چھ مہینے تک رونا۔ تا کہ یہ سمجھا جائے کوئی بڑا آدمی مرا ہے۔ کوئی ایک برس کی کوئی دو برس تک رونے کی وصیت کرتا تھا۔

اب ظاہر بات ہے کہ برس دن رونے کے لئے کس کی آنکھ میں اتنے آنسو رکھے ہوئے ہیں۔ کہ ایک برس تک

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الجنائز، باب التشديد في النياحة، ج: ٢ ص: ٦٤٤ رقم: ٩٣٣.

رویا جائے۔اس لئے رونے والیاں کرایہ پر رکھی جاتی تھیں جو چھ مہینے برس دن تک روتی تھیں اور طریقہ ان کا یہ ہوتا تھا کہ جہاں کوئی تعزیت کرنے والا آیا۔اورانہوں نے دیکھا کہ کوئی آرہا ہے تو دوڑ کر آئیں اور حلقہ بنا کر بیٹھ گئیں۔اور جب وہ قریب پہنچا تو انہوں نے راں راں کرنا شروع کر دیا۔"وَا کَسَدَا وَا جَمَلَا" ہائے تو ایسا تھا۔تو ویسا تھا۔جب تعزیت کرنے والا چلا گیا تو انہوں نے بھی رونا موقوف کر دیا پھر کوئی آیا پھر شروع کر دیا تو شہرت ہوتی تھی کہ بڑا آدمی مرا ہے کہ رونا ہی نہیں تھمتا تو کرایہ پر رونے والیاں رکھی جاتی تھیں اور وہ بیان کر کے روتی تھیں۔ماتم کرتی تھیں۔

تو جب یہ حدیث آئی تو میرے والد صاحب نے اس راں راں کی نقل اتاری ہم لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اس کی کیا ضرورت تھی تو والد محترم نے فرمایا کہ: مولانا گنگوہی نے بھی یوں ہی نقل اتاری تھی اور انہوں نے فرمایا تھا کہ شاہ عبدالغنی نے بھی یوں ہی نقل اتاری تھی۔آگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچادی، بہرحال عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تو مشعل نور تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے رکھ کر عرش تک پہنچنے کا راستہ نظر آجاتا تھا کہ یہ حق ہے اور فلاں راستہ باطل ہے نور اور ظلمت میں امتیاز ہو جاتا تھا اور راہنما آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں تھیں۔آپ کا طریق عمل تھا جس سے آدمی حق کا راستہ پاتا تھا حج اس طرح کرتے ہیں، روزہ اس طرح، نماز اس طرح، جہاد اس طرح کرتے ہیں۔انفاق فی سبیل اللہ، معاشرت، معیشت، صلح وامن کا یہ طریقہ ہے سب چیزیں آپ نے عملی طور پر کر کے دکھلائیں۔

عملی قرآن......تو کتاب اللہ میں جو چیزیں علمی شکل میں موجود تھیں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں وہ چیزیں علمی شکل میں موجود تھیں، اس لئے اللہ کا علمی قرآن وہ ہے جو اوراق اور کاغذوں میں موجود ہیں اور عملی قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔جو قرآن میں لکھا ہوا تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا ہوا موجود تھا۔اسی واسطے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب پوچھا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور سیرت کیا تھی تو فرمایا۔"کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ" اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت دیکھنی ہے تو اول سے آخر تک قرآن پڑھتے جاؤ۔یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تھی یعنی جو اس میں لکھا ہوا ہے وہی آپ کے اندر عملی شان سے موجود ہے جو چیزیں اس میں اقوال کی شکل میں موجود ہیں۔وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں احوال کی شکل میں موجود ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں راہنما ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نہ آتی تو راہنمائی ناممکن تھی۔

طریقۂ تعلیم خداوندی......اس سے اندازہ ہوا کہ عمل کے لئے اور دین کی راہ قطع کرنے کے لئے محض کتاب اللہ کافی نہیں جب تک کہ شخصیت ساتھ نہ ہو۔محض لٹریچر کافی نہیں ہے جب تک کہ کوئی شخصیت راہنمائی نہ کرے۔یہی وجہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ خیر وبرکت تک تعلیم کا یہی طریقہ اللہ نے رکھا کہ کتاب بھی بھیجی اور کتاب کے ساتھ معلم کتاب بھی بھیجے۔آدم علیہ السلام کو صحیفے دیئے گئے تو خود ان کو بھی ساتھ بھیجا گیا، ادریس علیہ السلام کو پچاس صحیفے دیئے گئے تو حضرت ادریس علیہ السلام بھی ساتھ بھیجے گئے۔

اگر صحف ابراہیم بھیجے گئے تو ابراہیم علیہ السلام بھی ساتھ بھیجے گئے۔ توراۃ آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ساتھ آئے اگر انجیل آئی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ساتھ آئے۔ زبور آئی تو حضرت داؤد علیہ السلام بھی ساتھ بھیجے گئے اور قرآن آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات آئی۔

اس لئے اگر پیغمبر نہ آئیں تو محض کتاب کے الفاظ سے آدمی مرادِ ربانی کو نہیں سمجھ سکتا۔ اگر سمجھ جاتا تو پیغمبروں کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کتاب اللہ کو بیت اللہ کی چھت پر رکھ دیا جاتا اور اعلان کر دیتے کہ اے لوگو! تم مریضانِ نفوس ہو اور یہ "شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ" ہے۔ جاؤ! اسے لے جاؤ اور اپنا اپنا علاج خود کرلو اگر اٹھا کر لوگ لے جاتے تو مراداتِ ربانی ان کی سمجھ میں نہ آتیں جب تک پیغمبر تعلیم نہ دیتے۔

انبیاء علیہم السلام کی احتیاج...... اس واسطے کہ کلام کی مراد سمجھنے کے لئے کبھی لب و لہجے کی بھی ضرورت پڑتی ہے، کاغذ پر جو کلام لکھا جاتا ہے۔ تو اس میں کلام کی کیفیات کاغذ پر نہیں آتیں وہ لب و لہجے اور ہیئت سے سمجھ میں آتی ہیں۔ ماحول سے سمجھ میں آتی ہیں محض کاغذ اور کاغذ کے کالے حروف سے سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ہماری اردو زبان کا ایک جملہ ہے "کیا بات ہے" عام طور سے بولا جاتا ہے۔ اس کے کئی معنی آتے ہیں اور سارے معنوں کا تعلق لب ولہجہ سے ہے۔ اگر میں یوں کہوں کہ بھئی! کیا بات ہے؟ آپ یوں سمجھیں گے کہ میں سوال کر رہا ہوں، پوچھ رہا ہوں کہ کیا بات ہے، کیا واقعہ گذرا ہے؟ اور اگر میں یوں کہوں: کیا بات ہے، اب آپ کیا سمجھے؟ اب آپ یہ سمجھے کہ میں نے بڑائی بیان کی کہ فلاں چیز کی کیا بات ہے وہ تو بہت بڑی چیز ہے اور اگر میں یوں کہوں کہ "کیا بات ہے" اب آپ کیا سمجھے؟ اب آپ یہ سمجھے کہ میں نے ایک چیز کی تحقیر کی ہے کہ نہایت ذلیل چیز ہے کیا بات ہے اور اگر میں یوں کہوں کہ کیا بات ہے۔ اب آپ سمجھیں گے کہ میں نے تعجب کا اظہار کیا تو ایک ہی جملہ ہے اس کے معنی وسوال، تعجب تفخیم شان اور تحقیر شان کے آتے ہیں۔ لیکن ہر معنی کا تعلق لب و لہجے سے ہے۔ کاغذ اور کالے نقوش سے نہیں اب اگر آپ کسی کے سامنے کاغذ پر لکھ کر بھیج دیں کہ "کیا بات ہے" وہ مطلب سمجھے گا جو اس کے ذہن میں کیفیت ہے۔ وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی اس کی اپنی طبعی گھڑی ہوئی مراد ہوگی اور متکلم کے سر تھوپ دے گا۔

حالانکہ مراد اپنی ہوگی۔ تو ٹھیک اسی طرح قرآن حکیم کا ایک لب ولہجہ ہے اگر قرآن کے ساتھ بیان کرنے والے مربی نہ آتے، لب ولہجہ، ماحول اور ہیئت کذائی سے نہ سمجھاتے تو قرآن کریم سے اللہ کی مرادیں سمجھنا آپ کے لئے ممکن نہ ہوتا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لب و لہجے، طریق عمل اور ہیئت کذائی سے سمجھایا۔ حدیث میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا واقعہ فرمایا گیا۔ جب قرآن کریم کی یہ آیت اتری ﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ رمضان کی راتوں میں کھاؤ اور پیو جب تک فجر طلوع نہ کرے، اس کو اس طرح تعبیر کیا کہ اس وقت تک کھاؤ، پیو۔ جب تک فجر کا سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے ممتاز نہ ہو جائے تو سفید ڈورے سے مراد صبح صادق ہے جو پوپھٹتی ہے اور ایک لمبی لے کر آسمان پر کھنچ جاتی ہے اور سیاہ

ڈورے سے رات کی تاریکی مراد ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ نے ایک ڈورا تو کالا لیا اور ایک سفید اور دونوں تکئے کے نیچے رکھ لئے کھاتے پیتے رہے تکیہ اٹھایا دیکھا کہ اتنا اندھیرا ہے کہ سیاہ ڈورا سفید ڈورے سے ممتاز نہیں ہوتا۔ پھر کھاتے پیتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح صادق بھی ہوگئی پندرہ بیس منٹ اوپر گزر گئے کیوں کہ صبح صادق کے بعد کچھ دیر اندھیرا رہتا ہے، مگر چوں کہ کالا ڈورا سفید ڈورے سے الگ اور نمایاں نظر نہیں آیا اس لئے کھاتے پیتے رہے۔ جب اتنا چاندنا ہو جاتا کہ دونوں ڈورے الگ الگ نظر آنے لگتے تب روزے کی نیت کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کی اطلاع دی گئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ کو بلایا۔ فرمایا تم کیا عمل کرتے ہو؟ انہوں نے کہا حضرت! قرآن شریف میں یہ آیت نازل ہوگئی ہے:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ①

تو میں نے کالا اور سفید ڈورا اپنے تکئے کے نیچے رکھ لیا ہے تاکہ دیکھتا رہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِيْضٌ“ تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے کہ کالا سفید دونوں ڈورے اس کے نیچے آگئے۔ بندہ خدا کالے ڈورے سے مراد رات کی تاریکی اور سفید ڈورے سے مراد صبح صادق کی سفیدی ہے، تو نے روئی کے دھاگے سمجھ لئے۔ تو لغت کے لحاظ سے صحیح سمجھے، مگر اللہ کی مراد نہیں تھی، مراد سمجھانے والے پیغمبر تھے۔ اگر مراد پیغمبر نہ سمجھائیں تو کالا ڈورا اور سفید ڈورے سے وہ روزہ رکھنا شروع کرتے روزہ رکھتے رہتے کوئی ملامت اس پر نہ ہوتی۔ مگر وہ مرادِ خداوندی نہ ہوسکتی، غرض بعض دفعہ لغت ہوتی ہے مرادِ خداوندی دوسری ہوتی ہے۔ عرفی معنی مراد ہوتے ہیں۔

تعیینِ مراد میں عرف کا دخل...... ہمارے محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ ”سونے پر سہاگہ“ تو لغۃً تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سونا رکھ کر سہاگہ اس کے اوپر چھڑک دو، لیکن مراد یہ نہیں مراد عرف عام میں یہ ہے کہ جب کسی چیز میں خیر کا مبالغہ بیان کیا کرتے ہیں۔ اس وقت کہتے ہیں کہ سونے پر سہاگہ ہوگیا۔ یعنی سونا تو اپنی ذات سے عمدہ ہی تھا اور سہاگہ لگنے کے بعد کندن بن گیا، یعنی اس کی خوبی بڑھ گئی۔ عرف عام اور اہل زبان میں رہ کر یہ محاورے سمجھ میں آتے ہیں پھر ان کی لطافت محسوس ہوتی ہے۔ کوئی محض ڈکشنریاں دیکھے اور اہل عرف سے قطع نظر کردے تو وہ یہ سمجھے گا کہ سونا رکھ کر سہاگہ پیس کر اس پر چھڑک دے تو اہل عرف اس کی بات پر ہنسیں گے کہ یہ عرف کو جانتا ہی نہیں۔ ہمارے ہاں ہمارے اساتذہ میں آپ کے ضلع ہزارہ کے حضرت مولانا غلام رسول خان صاحب تھے، اردو پوری طرح نہیں بول سکتے تھے۔ جیسے سرحد کے لوگ بول سکتے ہیں۔ ویسی ہی بولتے تھے اور دعوی مولانا کو یہ تھا کہ میں سب سے زیادہ اردو جانتا ہوں۔ تو ایک موقع پر دار العلوم کے تمام اساتذہ جمع تھے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ان کے بھائی مولانا محمد حسن صاحب وغیرہ تو مولانا محمد حسن صاحب نے کہا کہ: میاں مولوی غلام رسول! چالیس برس سے تم دار العلوم دیوبند میں مدرسی کررہے ہو اور تمہیں اردو بولنی نہیں آئی۔ مولانا کو غصہ آگیا کہنے لگے:

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷.

’’میں اردو نہیں جانتا؟‘‘۔ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اردو جانتا ہوں مگر اس زبان کو لغو سمجھتا ہوں اس لئے بولتا نہیں ہوں۔ حکیم صاحب نے کہا کہ: آپ ہندوستانیوں سے زیادہ سمجھتے ہیں؟ کہا کہ ہاں! انہوں نے کہا کہ بتاؤ اس کے کیا معنی ہیں۔ ’’کریلا اور نیم چڑھا؟‘‘ اب مولانا چپ بیٹھے کہ اس کا کیا مطلب کہ ’’کریلا اور نیم چڑھا‘‘۔

کہنے لگے کہ: اس عطف (لفظ اور) نے کام خراب کر رکھا ہے ورنہ معنی ظاہر تھے حکیم صاحب نے کہا کہ چلو تم عطف نکال دو۔ ’’کریلا نیم چڑھا‘‘ اس کا مطلب بتلا دو کہنے لگے اب معنی ظاہر ہے کہ کریلا آدھا کچا آدھا پکا۔ سارا مجمع ہنس پڑا۔ اب ظاہر بات ہے کہ مولانا نے لغت کی مدد سے یہ معنی بیان کئے اہل عرف میں کبھی رہے نہیں تھے کہ اس محاروے کی حقیقت کو سمجھتے۔ ’’کریلا‘‘ لیا اردو کا ’’نیم‘‘ فارسی کا لیا چڑھا لیا ہندی کا اور تینوں چیزوں کو ملا کر ایک معنی بنا دیئے تو اس معنی پر اہل عرف کو ہنسنا ہی تھا یہ معنی مراد تھوڑا ہی ہیں۔

ایسے ہی ہمارے ہاں ضلع سہارن پور میں ایک کلکٹر تھا یہ آج سے چالیس برس کی بات ہے، انہیں بھی یہی دعویٰ تھا کہ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں ان کے ہاں پیش کار ہمارے دیو بند کے منشی حبیب حسن تھے بڑے عمدہ شاعر تھے، بڑی شستہ ان کی زبان تھی تو بعض اوقات وہ کلکٹر دعویٰ کیا کرتا کہ ویل! پیش کار۔ ہم تم سے زیادہ بہتر اردو جانتا ہے۔

یہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں کہ یہ کمبخت اردو کیا جانے، اس کی مادری زبان نہیں۔ اہل عرف میں یہ نہیں رہا۔ اسے خواہ مخواہ یہ دعویٰ ہو گیا۔ اب یہ ملازمت کے ڈر کے مارے بول نہیں سکتے تھے کہ کہیں برخاست نہ کر دے کہیں روٹی نہ جائے۔

ایک دن کوئی بات آ پڑی تو اس کلکٹر نے میز پر جوش کے ساتھ مکہ مار کر کہا کہ ویل پیش کار! تم جاہل ہو اردو سے۔ ہم اردو جانتے ہیں۔ پیش کار کو بھی غصہ آ گیا، انہوں نے کہا کہ: میری نوکری رہے یا نہ رہے مگر مجھے اس کے دماغ سے یہ خناس نکالنا ہے۔ اس نے میز پر ایک مکا مارا تھا انہوں نے دو مکے مارے اور کہا۔

ویل صاحب بہادر! تم جاہل مطلق ہو تم نہیں جانتا اردو کسے کہتے ہیں ہم جانتے ہیں۔

صاحب کے غصہ کا پارہ چڑھ گیا آسمان پر۔ کہنے لگا تم نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔ کہنے لگے تمہیں کیا خبر اردو کی؟

انہوں نے کہا ویل صاحب بہادر! اچھا میں تمہارا امتحان لیتا ہوں۔ بتلاؤ اس کے کیا معنی ہیں؟ کہ ’’صاحب بہادر سے جب میں نے یہ پوچھا تو بغلیں جھانکتے رہ گئے‘‘ صاحب نے کہا ادھر کو جھانک لیا، ادھر کو جھانک لیا۔ یہ بغلیں جھانکنا ہو گیا۔

وہ ہنس پڑے کہ یہ معنی ہیں؟ تو کہنے لگا اور کیا معنی ہے۔ انہوں نے کہا کہ: آپ تو ہندوستانیوں سے زیادہ اردو جانتے ہیں۔ آپ بتائیں میں کیوں بتاؤں؟ اب وہ صاحب بہادر بیٹھ کر سوچ رہے ہیں کہ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ بغل ادھر کو جھانک لی بغل ادھر کو جھانک لی۔ بغلیں جھانکنے کا لفظ صادق آ گیا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو

کہنے لگا کہ ویل پیش کار! آپ ہمیں تین دن کا مہلت دیں ہم آپ کو ڈکشنری دیکھ کر بتائے گا۔ انہوں نے کہا کہ حضور تین دن کے بجائے آپ کو ایک ہفتہ کی مہلت ہے اور ساری ڈکشنری دیکھ کر بتایئے گا۔ تو صاحب بہادر نے ڈکشنریاں کھنگالنا شروع کیں۔ لغت کی ہر چھوٹی بڑی کتاب دیکھ ماری۔ ان میں کہیں بھی یہ کیفیت اور ہیئت موجود نہ تھی۔ یہ محاورہ تھا۔ جب صاحب بہادر عاجز ہوگیا تین چار دن کے بعد کہا کہ: ویل پیش کار صاحب ہمیں کسی ڈکشنری میں یہ چیز نہیں ملی بغلیں جھانکنا تو لکھا ہے مگر اور کچھ نہیں نکلتا۔

انہوں نے کہا: حضور قیامت تک اور کچھ نکلے گا بھی نہیں۔ پھر اس نے کہا اچھا آپ بتلائیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نہیں بتلاتا آپ ہندوستانیوں سے زیادہ اردو جانتے ہیں۔ کہا آپ بتلا دیں، انہوں نے کہا توبہ کریں آئندہ میں یہ نہیں کہوں گا میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں۔ یہ صاحب بہادر پر بڑا شاق گذار، مگر جہالت کا اقرار کر چکے تھے تو مجبوراً انہیں کہنا پڑا کہ اچھا اب ہم نہیں کہیں گے۔ تب انہوں نے بتلایا کہ بغلیں جھانکنا لغۃً اس کے معنی یہ ہیں ہے کہ بغل میں ادھر کو جھانک لیا ادھر کو جھانک لیا مگر عرف میں اسکے معنی یہ ہیں کہ بغلیں جھانکنا یہ تحیر کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ جب آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ بغلیں جھانکتا رہ گیا۔ اس سے کوئی بات بن نہیں پڑی۔ کوئی جواب نہیں بن پڑا تو یہ حیرت سے کنایہ ہے۔

ہر زبان میں یہ چیز ہوتی ہے کہ ایک لغوی معنی ہوتے ہیں، ایک اصطلاحی اور ایک عرفی معنی ہوتے ہیں۔
فارسی کا محارہ ہے کہ ''فلاں شخص آب در کرد۔ فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے۔

تو ٹوکری میں پانی ڈالنے کا لغوی مطلب تو یہ ہے کہ آدمی ٹوکری نیچے رکھ کر اوپر سے گھڑا انڈیل دے۔ مگر مراد یہ ہے کہ جب کوئی شخص بے نتیجہ اور فعل عبث کرتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے نتیجہ کچھ نہیں۔ ہزاروں گھڑے ڈال دے گا، پانی بہہ جائے گا۔ غرض جب کوئی آدمی عبث کام کر رہا ہو جو بے نتیجہ ہو تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے۔ تو جو لوگ فارسی دانوں کے عرف میں نہ رہے ہوں۔ اہل عرف کی صحبت نہ اٹھائے ہوئے ہوں۔ وہ لغت کی مدد سے ایسے ہی معنی بیان کریں گے کہ اہل عرف ان کے معنی اور حماقت و جہالت پر ہنس پڑیں گے یہی شان قرآن و حدیث کی بھی ہے کہ ان کا بھی ایک عرف ہے قرآن فقط لغت پر نہیں اترا، اس کی کچھ اصطلاحیں ہیں۔ کچھ محاورات ہیں۔ ادا کا کچھ لب ولہجہ ہے وہ اس لب و لہجے اس ماحول اور طرز ادا ہی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ تبھی اس کی مرادیں متعین ہوسکتی ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص قرآن دانوں کے عرف کو ہی نہیں جانتا ہو قرآن والوں کے عرف میں نہ رہا ہو وہ کبھی بھی مراد ربانی کو نہیں سمجھ سکتا وہ لغت کی مدد سے مراد خداوندی کو حل کرنے کی کوشش کرے گا۔ تو قرآن کریم کا لغت کی مدد سے حل کرنا کافی نہیں ہے۔ یہ کافی نہیں کہ آپ نے (عربی ادب کی کتاب) مقامات حریری یا اردو ادب کی کتابیں پڑھ لیں۔

مرادِ قرآنی کی تعیین میں سنت کا مقام...... نیز یہ تو قابلیت کی بات ہے، اور یہ تو تعجب بالائے تعجب ہے کہ

اردو کے ترجمے دیکھ کر آپ مفسر بن گئے، اس سے قرآن حل نہیں ہوتا جب تک مرادات ربانی پوری طرح سمجھ میں نہ آئیں، اور وہ جب سمجھ میں آئیں گی جب پیغمبر کے اقوال و افعال اس کے ساتھ ملائے جائیں جن سے قرآن کریم کی تفسیر اور تطبیق ہوتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خوارج کے مقابلہ کرنے کے لئے بھیجا کہ ان سے بحث و مناظرہ کرو اور ان کو حق سمجھاؤ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ تیار ہوئے۔ تو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا دیکھو خوارج کے سامنے مجمع میں قرآن سے کوئی دلیل نہ پیش کرنا بلکہ سنت سے دلیل پیش کرنا۔ انہوں نے عرض کیا حضرت! قرآن حکیم کا علم تو میرا موضوع ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قرآن فہمی کی دعا دی ہے تو میں عالم قرآن ہوں۔ تو جو میرا مضمون اور موضوع ہے۔ اسی سے آپ روک رہے ہیں کہ میں اس سے استدلال نہ کروں اس کی کیا مصلحت ہے۔ فرمایا کہ: قرآن کریم کی آیتیں ذی وجوہ ہیں۔ اصولی جملے ہیں۔ کئی کئی معنی پر ڈھل سکتے ہیں۔ تم اگر عوام کے سامنے ایک آیت پڑھ کر اس کا مطلب بیان کرو گے۔ مخالف اس آیت کے عموم سے فائدہ اٹھا کر اسی کے دوسرے معنی بیان کر دے گا، عوام یوں کہیں گے کہ یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ حق و باطل واضح نہیں ہوگا لیکن جب سنت رسول کی دلیل پکڑو گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور عمل مشخص ہے اس میں دوسری چیز کی گنجائش نہیں ہوگی، تو قرآن کریم کے معنی متعین ہو جائیں گے۔ دورنگی نہیں رہے گی دو معنی لینے کی گنجائش نہیں رہے گی اور حق واضح ہو جائے گا عوام سمجھیں گے کہ یہ حق ہے۔

اس لئے جب تک قرآن کے ساتھ سنت کو نہ ملایا جائے قرآن کی مراد مشخص نہیں ہوسکتی معنی متعین نہیں ہوسکتے۔ اس کے بغیر اگر مراد متعین کریں گے تو وہ آپ کی اپنی مراد ہوگی جو آپ قرآن کے سر تھوپ دیں گے تو یہ تلبیس ہوگی یا نفاق ہوگا کہ لفظ قرآن کے لئے معنی اپنا ڈال دیئے۔ حالانکہ دنیا میں کسی کے کلام کا بھی مطلب بیان کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔ جب تک وہ صاحب کلام خود نہ کہے کہ یہ میرا مطلب ہے۔ تو ظاہر بات ہے کہ مراد ربانی کی تعین اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک حق تعالیٰ شانہٗ اپنی طرف سے کسی کو نہ بھیجیں کہ جا کر میری مراد بتلا دو۔

اسی واسطے قرآن کریم کی دو شانیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ جب آپ پر قرآنی آیات کی وحی ہوتی تھی تو ابتداء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ اس کو رٹنا شروع کر دیتے تھے کہ کہیں بھول نہ جاؤں اور۔ میرے ذہن میں آیت جم جائے۔ حق تعالیٰ شانہ نے حکم فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾ ① ''اے پیغمبر! اپنی زبان کو حرکت مت دیں۔ جلدی مت کریں''۔ اس خیال سے کہیں میں بھول نہ جاؤں۔ یہ لفظ میرے سینے میں جمع ہو جائیں۔ اس لئے فرمایا: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ ② ''ہمارے ذمہ ہے اس کا تمہارے سینہ میں جمع کر دینا اور تمہاری زبان سے اس کا پڑھوا دینا تو حق تعالیٰ نے ذمہ لیا''۔ ﴿فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾ ③ ''جب ہم (بواسطہ فرشتہ) کلام کرنے لگیں۔ تو اس کا اتباع کرو سنتے رہو''۔ یہ پہلا حکم تھا جو قرآن کے

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔ ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔

بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے فرمایا گیا۔

ظاہر بات ہے کہ جمع کر دینے اور پڑھوا دینے کا تعلق الفاظ سے ہوتا ہے۔ معنی نہ جمع کئے جاتے ہیں نہ پڑھوائے جاتے ہیں۔ اب آگے معنی کی بات رہ جاتی ہے تو معنی کی صورت یہ نہیں تھی۔ یہ آپ نے کسی روایت میں کسی جگہ نہیں دیکھا ہوگا کہ قرآن کریم کی جب آیت اترتی ہو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر سوچتے ہوں کہ اس کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ ایک یہ۔ یہ معنی ذرا زمانے کے زیادہ مناسب ہیں۔ لاؤ یہ اختیار کرلو۔ اس لئے کہ اگر خدانخواستہ یہ ہوتا تو یہ اپنی اختراع ہوتی متکلم کی مراد نہ ہوتی تو حق تعالیٰ شانہ نے جیسے لفظوں میں پابند کیا، آگے معانی میں بھی پابند کیا۔ فرماتے ہیں: ﴿ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴾ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو کھول کر بیان کر دینا کہ مطلب کیا ہے مراد کیا ہے''۔

تو بیان کا تعلق لفظوں سے نہیں ہوتا۔ معانی سے ہوتا ہے، اس کا حاصل یہ نکلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے الفاظ کے بارے میں بھی امین تھے۔ اپنی طرف سے الفاظ اختراع نہیں فرماتے تھے۔ اور معانی کے بارے میں بھی امین تھے۔ جو آپ کے قلب مبارک میں اللہ نے ڈالا وہی معنی آپ نے سمجھا اپنی عقل سے یا سوچ بچار سے معنی متعین نہیں کئے تو نبی کو وحی میں آزاد نہیں کہا گیا کہ جو چاہو تم معنی متعین کر دو اس معنی کے پابند ہیں جو نازل کیے جائیں، جسے تم لفظوں میں پابند ہو جب اللہ کا رسول امین ہے اور آزاد نہیں کہا گیا ہے۔ کہ الفاظ و معانی میں ایک شوشہ گھٹا بڑھا سکے تو میں اور آپ کیسے آزاد ہو جائیں گے؟ کہ جو ہمارا جی چاہے ہم سمجھے لیں ہم انہی معنی کے پابند ہیں جو اللہ کے رسول نے سمجھے اور آپ کو سمجھائے گئے۔ قرآن خود دعویٰ کرتا ہے کہ تم انہیں معنی کے اندر مقید ہو۔ اب وہ معنی اور بیان رسول کہاں ہے؟ اسی بیان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیث کہتے ہیں، اور اسی کو سنت کہتے ہیں۔ کسی چیز کا بیان قول سے کیا کسی چیز کا عمل سے کیا، اور کسی چیز کا تقریر سے کیا کہ عمل دوسرے کا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا یہ بیان تقریری کہلاتا ہے، ایک بیان قولی ہے اور ایک بیان فعلی ہے، ان تینوں بیانوں کے مجموعے کا نام سنت ہے۔

تفکر فی القرآن ...... اسی واسطے ایک جگہ فرمایا گیا: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ ① ''اے پیغمبر! ہم نے یہ ذکر تمہاری طرف نازل کیا تا کہ تم کھول کھول کر اس کو بیان کر دو۔ اور شاید کہ لوگ اس میں تفکر کریں''۔

تو تفکر کا درجہ بیان کے بعد رکھا کہ بیان دے دو تا کہ مراد واضح ہو۔ اس مراد کے اندر رہ کر لوگ غور و فکر کریں تا کہ حقائق و معارف اور علوم لوگوں پر کھل جائیں۔ اس واسطے کہ علوم و معارف اللہ کی مراد میں چھپے ہوئے ہیں، ہماری اختراع میں علوم اور معارف نہیں ہیں تو پہلے بیان اور مراد سامنے آئے تو اس میں غور کریں گے تو حقائق علمی کھلیں گے۔ اور اگر اللہ کی مراد ہی سامنے نہ ہو تو پھر ہم کس چیز میں غور کریں گے؟ پھر جو غور ہوگا وہ محض ہمارا ذاتی

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴۔

تخیل ہوگا، اس تخیل کو ہم قرآن کریم کے سر تھوپ دیں گے۔ حالانکہ قرآن اس سے بری ہوگا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ''مُبیّن'' بن کر تشریف لائے کیوں کہ قرآن کریم کی مرادات بغیر مبین کے سمجھ میں نہیں آتیں۔

جمع حدیث کی تکوینی تدبیر...... اسی واسطے حضرات محدثین نے حدیث کی جمع و تنقیح اور تشریح کی طرف پوری پوری توجہات منعطف کیں اور حق تعالیٰ شانہ نے انہیں محیر العقول حافظے دیئے۔ ان کے حافظوں میں کئی کئی لاکھ حدیثیں جمع ہوتی تھیں۔ عظیم الشان مجالس میں بیٹھ کر حدیث کا املا کیا جاتا تھا اور ایک ایک محدث اٹھتا تھا۔ اس کے سینے میں دو دو تین تین لاکھ احادیث مع متن اور سند کے جمع ہیں حق تعالیٰ کو یہ چیزیں حافظوں میں محفوظ کرانی تھیں تو محیر العقول حافظے دے دیئے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ حجاز کا سفر کر رہے تھے۔ جہاز میں بیٹھے تھے اس زمانے میں بادبانی جہاز ہوتے تھے۔ ہوا موافق ہوئی چل پڑے۔ مخالف ہوئی لنگر ڈال دیا تو چھ چھ مہینے میں جا کر جدّہ کے ساحل پر اترتے تھے برس اور دو برس حج کرنے میں لگتے تھے تو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ جہاز پر سوار ہوئے۔ ترمذی اور بہت سے تلامذہ بھی ساتھ سوار ہو گئے۔ جہاز میں مدت کافی لگتی تھی۔ اس لئے یہ ارادہ کیا کہ شیخ سے عرض کریں کہ آپ احادیث کا املا کرائیں ہمارا یہ وقت احادیث کے سننے اور لکھنے میں کٹے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد نے اس کو مان لیا اور کہا کہ کل سے ایک وقت مقرر کر لو تا کہ میں حدیثیں املا کراؤں۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس نہ کاغذ تھا نہ قلم دوات۔ اب انہوں نے سوچا کہ اگر میں مجلس میں بلا کاغذ اور قلم دوات کے گیا تو مجھے اٹھا دیا جائے گا، یہ باب حدیث اور باب املا کے خلاف ہے۔ اس لئے سب سے پیچھے بیٹھ گئے اور اپنا ایک گھٹنا کھڑا کر کے اپنا ہاتھ سامنے رکھتے اور دوسرے ہاتھ کو حرکت دیتے رہتے تا کہ شیخ یوں سمجھیں کہ لکھ رہے ہیں اور مجلس سے نہ اٹھائے جائیں۔ تیس چالیس روز اسی طرح گزر گئے اور ہر دن میں دس دس، بیس بیس حدیثیں روایت ہوتی تھیں۔ ایک روز شیخ نے گردن اٹھائی دیکھا کہ نہ کاغذ نہ قلم۔ فرمایا یہ کیا حرکت ہے؟ کاغذ ہے؟ عرض کیا نہیں ہے۔ فرمایا قلم ہے؟ عرض کیا نہیں۔ پھر یہ کیا حرکت ہے؟ عرض کیا میں اس لئے ایسا کرتا تھا کہ آپ یہ سمجھیں گے کہ اس کے پاس کاغذ قلم نہیں ہے۔ اس لئے مجلس سے اٹھا دیں گے تو میں اپنے کو بصورت کاتب نمایاں کرتا تھا کہ میں بھی لکھ رہا ہوں۔

شیخ کو غصہ آیا فرمایا تم نے میری محنت اکارت کر دی۔ تم درس میں مت بیٹھو۔ انہوں نے عرض کیا حضرت! محنت اکارت نہیں ہوئی۔ مجھے الحمد للہ وہ ساری روایتیں حفظ یاد ہیں۔ اب ان کو ترتیب وار پڑھنا شروع کیا کہ پہلی تاریخ میں آپ نے یہ حدیثیں مع اس سند کے بیان کیں۔ دوسری تاریخ میں یہ بیان کیں۔ اور یہ ان کی سند ہے۔ تیسرے دن آپ نے یہ حدیثیں بیان کیں اور ان کی سند یہ ہے اتنے روز میں جتنی روایتیں املا کرائی تھیں، وہ ساری امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے سنا دیں۔ تو شیخ نے ان کے حافظے پر اعتماد فرمایا اور اجازت دے دی کے تم

میرے درس میں بیٹھ سکتے ہو۔تو یہ محیر العقول حافظہ نہیں تھا تو اور کیا تھا؟

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے نے جو خود بھی محدث تھے بغداد کا سفر کیا تو بغداد کی جامع مسجد میں جب معلوم ہوا کہ امام ابوداؤد کے بیٹے آئے ہیں اور وہ خود بھی محدث ہیں، سارے عوام جھک پڑے۔ لاکھوں آدمی جمع ہوگئے کہ کچھ حدیثیں تبرکا سنی جائیں۔

بعض علماء نے عرض کیا کہ آپ الحمد اللہ یہاں تشریف لائے ہیں۔ اللہ نے آپ کو محدث بنایا ہے۔ کچھ حدیثیں آپ سنا دیں اور املا کرا دیں۔ فرمایا کہ: ''میں بیاض ساتھ نہیں لایا جس میں حدیثیں لکھی ہوئی ہیں''۔

اس کو بہت حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا کہ ایک محدث یوں کہے کہ میں اپنی یادداشت ساتھ نہیں لایا۔ وہ محدث کیا ہوا جس کا حافظہ اتنا کمزور ہو۔

تو بعض نے کچھ لعن کا لفظ کہا جو ابن ابی داؤد کے کان میں پڑ گیا، اس میں غیرت جو آئی تو فوراً منبر پر بیٹھ گئے اور ابوداؤد کی حدیثیں سنانا شروع کیں تو ایک دو تین دن میں پوری ابوداؤد مع سند اور اور متن کے اپنی یادداشت سے سنادی ایک دو مقام کے سوا کہیں فروگزاشت نہیں ہوئی۔ پھر لوگوں نے مان لیا کہ واقعی یہ محدث ہیں۔ بہرحال حق تعالیٰ کو اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام جمع کرنا تھا تو محیر العقول حافظے پیدا کر دیئے۔

دورِ جدید میں روایت حدیث کا طریق...... جب ساری حدیثیں سینوں سے نکل کر سفینوں میں جمع ہوگئیں۔ اسی نسبت سے حافظے کم ہونا شروع ہوگئے اس لئے کہ حاجت باقی نہیں رہی آج ہم اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر نوٹ بک جیب میں نہ رکھیں تو صبح کی بات شام کو نہیں یاد رہ سکتی۔ کاغذ دیکھ دیکھ کر اپنے افعال کو انجام دیتے ہیں۔

میرا جو یہاں آکر حشر ہوا۔ وہ یہ کہ جلسوں کی کچھ تاریخیں متعین ہوئیں۔ یہاں دعوت چائے کی۔ یہاں کھانے کی۔ یہاں تقریر یہاں مذاکرہ۔ وہ پندرہ دن کا پروگرام لکھا گیا۔ اب وہ نامہ اعمال میری جیب میں پڑا ہوا ہے اور بحمد اللہ ہے دائیں جانب۔ بائیں جانب نہیں ہے۔ روز صبح کی نماز پڑھ کر میں دیکھتا ہوں کہ آج کہاں تقریر ہے۔ آج کہاں جانا ہے۔ تو حافظوں کی یہ حالت ہے کہ پندرہ دن تو پندرہ دن صبح کی بات شام کو یاد نہیں رہتی۔ آج اگر کوئی یوں کہنے لگے میں امام بخاری ہوں، امام مسلم ہوں یا امام ابوداؤد ہوں۔ تو یہ مضحکہ خیز بات ہوگی۔ جن لوگوں کے حافظوں میں اللہ کو حدیث کو جمع کرانا تھا انہیں ایسے حافظے دے دیئے۔ جب کتابوں میں روایت آگئی اب محدث کے معنی فقط یہ ہیں کہ روایت کا حوالہ دے دے کہ یہ روایت بخاری میں ہے، یہ مسلم میں ہے، یہ ترمذی میں ہیں۔ اول سے لے کر اخیر تک پوری سند پڑھنا اور رجال کی تنقیح کی حاجت باقی نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ کام سب محدثین کر چکے ہیں۔ پکی پکائی ہمارے سامنے آگئی ہے۔ یہ نہایت ناقدری ہوگی کہ ہم دعویٰ کریں کہ ہم بھی بخاری ہوگئے۔ صبح کی بات تو شام کو یاد نہیں رہتی اور بخاری بننے کا دعویٰ ہے۔

یہ قدرتی چیز ہے کہ جب کسی قوت سے کام لینے کی ضرورت باقی نہ رہے اسی نسبت سے وہ قوت گھٹنی شروع

ہو جاتی ہے تو حافظہ گھٹتے گھٹتے اس نوبت پہ آ گیا۔

اجتہادی قوت کا فقدان ...... اور میں کہتا ہوں کہ: یہ یہی صورت درایت اور تفقہ کے اندر بھی ہے، اجتہاد جس کو کہتے ہیں۔ جب قرآن اور حدیث کتابوں کے اندر جمع ہو گیا اور حافظوں سے نکل کر سفینوں میں آ گیا۔ تو مسائل نکالنے کی طاقت جس کو اجتہادی قوت کہتے ہیں، اللہ نے آئمہ کے اندر اعجازی طور پر پیدا کی کہ ایک رات میں ایک آیت سے ایک ایک سو مسئلے نکالے ہیں اور فقہ کو مرتب کر دیا۔ وہ استنباطی واجتہادی مسائل جب سینوں سے نکل کر سفینوں میں جمع ہو گئے، اور کتابوں میں آ گئے۔ تو اسی نسبت سے اجتہاد گھٹنا شروع ہوا۔ گھٹتے گھٹتے اس حد تک پہنچ گیا کہ ایک شخص عالم بنتا ہے مگر بعض دفعہ الٹا سمجھ جاتا ہے، کہتے کچھ ہیں، سمجھتا کچھ ہے تو فہم بھی ہمارے خراب اور ختم ہو گئے الٹی بات سمجھتے ہیں۔ ایک روایت یہاں سے نقل ہوئی ہے چلتے چلتے چند زبانوں کے بعد وہاں پہنچ کر کچھ کا کچھ بن جاتا ہے اور پروپیگنڈہ بن جاتا ہے۔ اصلیت کا پتہ نہیں ہوتا۔ تو اسی نسبت سے اجتہادی قوت بھی ختم ہو گئی۔ اس لئے آج اگر کوئی ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یا شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ مضحکہ خیز دعویٰ ہو گا۔ اس لئے کہ اس قوت کے باقی رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ کام اپنا پورا کر گئی۔ تو حافظے بھی ختم ہو گئے۔ اجتہادی قوتیں بھی اس نسبت سے ختم ہو گئیں۔ اس لئے جس طرح روایت میں ہمارا بڑا درجہ یہ ہے کہ ہم کتاب کا حوالہ دے دیں۔ استنباطی مسائل میں بڑا فقیہ وہ ہے جو کتاب کا حوالہ دے دے کہ یہ فلاں کتاب میں ہے۔

بہر حال جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے مبین بنا کر بھیجا۔ تا کہ آپ اللہ کی آیتوں کو بیان کریں کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے اس کی مراد یہ ہے جیسا کہ عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ کو آپ نے سمجھا دیا۔ ورنہ عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ تو روئی کے ڈورے لے کر بیٹھ گئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کی مراد کا بیان کیا کہ روئی کا دھاگہ مراد نہیں ہے، بلکہ صبح کی سفیدی اور رات کی تاریکی مراد ہے۔ تو اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کر کے آیت کی مراد کو کھول دیا۔ اگر پیغمبر کی ذات نہ آتی۔ فقط قرآن کریم سامنے آتا تو یہ مرادات نہ کھل سکتیں ہم اپنے ذہن سے سمجھتے جو بھی ہمارے ذہن میں آتا۔

تزکیہ قلب ...... پھر اگر ذہن تربیت یافتہ نہ ہو۔ مزکی نہ ہو۔ صاف نہ ہو۔ اخلاقی قوتیں اس میں نہ ہوں۔ ایسے میں اگر وہ غور کرے تو اوندھا ہی سمجھے گا اور اپنے مذاق کے مطابق سمجھے گا۔ اس لئے جہاں اس کی ضرورت تھی کہ شخصیت آ کر مرادیں سمجھائے وہاں اسکی بھی ضرورت تھی کہ مخلوق کا ذہن بھی بنائے۔ ذہنیت بھی درست کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں مراد کو بیان کیا۔ وہاں لوگوں کے نفوس کا تزکیہ بھی کیا۔ ان کا ذہن بھی بنایا۔

اگر کوئی شخص مشرکانہ ذہنیت لے کر قرآن کو دیکھے تو یوں معلوم ہو گا کہ ہر آیت سے شرک ہی نکل رہا ہے، اگر نصرانی ذہنیت سے سوچے تو یوں معلوم ہو گا کہ ہر آیت میں عیسائیت بھری پڑی ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم تو ایک مردِ سخی کی مانند ہے۔ دوست اس سے کمالے دشمن کمالے۔ وہ تو ذی وجوہ اصولی اور کلی جملے ہیں۔ ہیر پھیر کر آدمی اپنا

مطلب نکال سکتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی یہودیانہ ذہنیت سے دیکھے تو یوں معلوم ہوگا کہ قرآن میں یہودیت بھری پڑی ہے، لیکن اگر کوئی موحدانہ ذہنیت لے رجائے گا تو آیت آیت سے توحید نکلے گی اس لئے جہاں مراد سمجھانے کی ضرورت تھی وہاں ذہن کو بنانے کی بھی ضرورت تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفوس کا تزکیہ بھی کیا۔ ریاضت اور مجاہدات بھی اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو کرائے، "تَوَجُّهُ اِلَی اللهِ" کی مشق بھی کرائی" اِنَابَتْ اِلَی اللهِ رُجُوْعْ اِلَی اللهِ" اور تعلق مع اللہ کے مجاہدے بھی کرائے، تا کہ اللہ سے رابطہ صحیح ہو۔ ذہن میں استقامت پیدا ہو جائے۔ ذہن سے زیغ اور کجی نکل جائے، جب ذہن میں استقامت آئے گی تو جو آیت پڑھی جائے یا معنی بیان کیے جائیں گے وہ آدمی صحیح سمجھے گا، غلط سمجھنے کی صورت باقی نہیں رہے گی تو ذہن میں استقامت پیدا کرنا یہ ایک مستقل موضوع اور مقصد نبی کے آنے کا ہے۔

اسی واسطے قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چار فریضے بیان کئے گئے ہیں: ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ﴾ ① اللہ کی ذات وہ ہے جس نے امیوں میں رسول بھیجا۔ کیسا رسول؟ خود بھی امی ہے لکھنے پڑھنے کی خبر نہیں مگر علوم وہ بیان کئے جن سے لوگوں کو عاجز کر دیا۔

یتیمے کہ نا کردہ قرآں درست کتب خانہ چند ملت شست

بہر حال رسول بھیجا اس کا کیا کام ہے۔ اس کے کیا فرائض ہیں؟ لوگوں کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے، یعنی اللہ نے جو الفاظ اتارے ہیں۔ وہ امانت اور دیانت کے ساتھ پورے الفاظ پہنچا دیتے ہیں۔ نیز تعلیم بھی دیتا ہے، تعلیم بیان مطالب کو کہتے ہیں یعنی ان کے معانی بھی سمجھاتے ہیں یہ نہیں کہ فقط الفاظ لوگوں کے سامنے رکھ دے اور یوں کہہ دیں کہ جو تمہارا جی چاہے اس کے معنی سمجھ لیں۔ اس لئے کہ تعلیم کہتے ہی اسے ہیں کہ الفاظ کے اند رونی حقائق اور معانی کو سامنے رکھا جائے۔ تو کتاب کی تعلیم معانی و مطلب کے ساتھ دیتے ہیں۔ اور آگے فرمایا: حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، حکمت کی دو قسمیں ہیں، حکمت نظری اور حکمت عملی، حکمت نظری تو علمی چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ تعلیم میں آ گئی۔ اس لئے متعین ہو گیا کہ حکمت سے مراد حکمت عملی ہے، یعنی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں۔ معانی بھی سمجھاتے ہیں۔ پھر کر کے دکھلاتے بھی ہیں تا کہ نمونہ عمل بھی سامنے آ جائے۔ جس کے معنی اسوہ حسنہ کے ہیں تو عمل کی ہیئت بھی سامنے پیش کر دیتے ہیں تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے آیت کے معنی متعین ہو جائیں۔

آدمی میں یہ سب چیزیں ہوں مگر اس کے ساتھ ایک چوتھی چیز کی ضرورت تھی ﴿وَیُزَکِّیْهِمْ﴾ ہے ان کے دلوں کو مانجھتے تھے ان میں سے زیغ اور کجی بھی نکالتے تھے، کسی کی یہودیانہ ذہنیت تھی تو یہود سے مسلم بنا، کسی کی نصرانی ذہنیت تھی تو نصرانیت سے مسلم بنا، کسی کی مشرکانہ ذہنیت تھی تو شرک سے اسلام کی طرف آیا۔ غرض وہ پچھلے

① پارہ: ۲۸، سورة الجمعة، الآية: ۲.

اثرات زائل کر کے قلب کو پاک کر دیا۔ اس کے لئے ریاضت اور مجاہدے کی ضرورت پڑتی ہے، تو آپ جہاں حلال وحرام کا بیان کرتے تھے وہاں پاک صاف قلوب کی دیکھ بھال بھی فرماتے تھے۔

عمل کی نگرانی...... راتوں کو اٹھ کر اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی نگرانی فرماتے تھے کہ عمل کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر کر رہے ہیں تو کیسا عمل کر رہے ہیں۔

ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مکان سے گزرے تو دیکھا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہیں، مگر اتنی آہستہ کہ کان لگا کر سنو تو آواز آتی ہے، ورنہ آواز نہیں آتی۔ آگے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مکان کی طرف بڑھے تو اس زور سے پر قرآن پڑھ رہے تھے کہ محلّہ گونج رہا تھا۔ صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں دونوں حضرات جمع ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! تم اتنا آہستہ کیوں پڑھ رہے تھے کہ کان لگا کے سنا جائے۔ تو عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اس کو سنا رہا تھا جو نہ بہرہ ہے نہ مجھ سے غائب ہے، یعنی اللہ کو سنا رہا تھا۔

تو مجھے زیادہ چلانے کی ضرورت کیا تھی۔ پھر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم اتنے زور زور سے کیوں پڑھ رہے تھے؟ تو عرض کیا کہ: ''اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاُطْرِدُ الشَّیْطٰنَ'' سوتوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا، اس لئے زور زور سے پڑھ رہا تھا۔ ان کی شان ہی ''اَشَدُّهُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰهِ عُمَرُ'' ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! تم ذرا آواز کو اونچا کر دو۔ اور اے فاروق! تم ذرا آواز کو نیچا کر دو تا کہ اعتدال پیدا ہو جائے۔

یہ کوئی حلال وحرام یا جائز وناجائز کا مسئلہ نہیں تھا، یہ عمل کی نگرانی تھی، طرز عمل سکھلانا تھا۔ تا کہ استقامت اور اعتدال پیدا ہو جائے۔

قلوب کا علاج...... حدیث میں ہے کہ: بعض لوگوں نے آ کر عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمیں وسوسے بہت آتے ہیں، فرمایا: کیا وسوسے آتے ہیں؟ عرض کیا: سوالات کا ایک سلسلہ ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین کس نے بنائی؟ دل سے جواب نکلتا ہے اللہ نے بنائی۔ آسمان کس نے بنایا؟ دل سے جواب نکلتا ہے کہ اللہ نے۔ چاند سورج کو کس نے بنایا؟ جواب ملتا ہے کہ اللہ نے ان سوالوں کے بعد ذہن میں ایک کلیہ جمع ہوتا ہے کہ ہر بنی ہوئی چیز کے لئے کسی بنانے والے کی ضرورت ہے۔ ہر موجود کے لئے کسی موجد کی ضرورت ہے تو سوال ہمارے دل میں آتا ہے کہ اللہ میاں بھی تو موجود ہیں تو ان کے بنانے والا اور پیدا کرنے والا کون ہے؟

جب یہ سوال آ گیا تو ہمارا ایمان کہاں باقی رہا؟ جب اللہ کی نسبت یہ خیال آئے کہ اس کا بنانے والا کون ہے؟ تو ایمان کہاں باقی رہا؟ اور جب ایمان نہ رہا تو عمل میں تو ایمان سے طاقت آتی ہے تو ترقی عمل رک گئی، عمل معطل ہو گیا۔ وسوسہ کا اثر یہی پڑتا ہے کہ آدمی عمل سے معطل ہو جاتا ہے گویا عملی زندگی اور عملی ترقی رک گئی۔ سبحان اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وسوسہ کو دفع فرمایا اور کس حکیمانہ طریق سے اس وسوسہ اور شبہ کو زائل فرمایا۔

فرمایا: یہ جو تمہیں شبہات ہوتے ہیں سوالات دل میں پیدا ہوتے ہیں تم انہیں برا سمجھتے ہو یا اچھا؟ عرض کیا یا رسول اللہ اتنا برا جانتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا گوارا ہے لیکن یہ وسوسہ گوارا نہیں ہے۔ فرمایا: ''ذَاکَ صَرِیْحُ الْاِیْمَانِ'' فرمایا: یہی تو ایمان کی علامت ہے۔ یہ ایمان ہی تو ہے جو اس وسوے کو برا جتلا رہا ہے۔ اگر اندر ایمان نہ ہو تو آدمی وسوسے کو برا نہ سمجھے اور ڈرے کیوں؟ یہ ایمان ہی ڈر پیدا کر رہا ہے۔

جیسے آنکھ کھل جاتی ہے، بیدار ہو گئے سمجھ یوں رہے تھے کہ ایمان باقی نہیں رہا واضح ہوا کہ ایمان تو موجود ہے وہ جو عمل کی ترقی رک گئی تھی۔ وہ پھر جاری ہو گئی۔

اب یہ کوئی جائز و ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا نہ حلال و حرام کا مسئلہ تھا، یہ قلب کی تربیت کا مسئلہ تھا دل کی کلیں درست کرنی تھیں۔ دل کا رخ صحیح کرنا تھا کہ ادھر کو چلو ادھر کو نہ چلو۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ جا رہے تھے، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پوچھا اے حنظلہ کیا حال ہے؟ عرض کیا کہ ''نَافَقَ حَنْظَلَۃُ'' حنظلہ تو منافق ہو چکا ہے۔ اس میں ایمان باقی نہیں ہے، فرمایا: وَمَا ذَاکَ؟ یہ کیا بات کہی؟ فرمایا بات یہ ہے کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر رہتے ہیں تو جنت و دوزخ گویا آنکھوں کے سامنے رہتی ہے اور جب گھر آتے ہیں اور بال بچوں میں لگتے ہیں تو وہ چیز باقی نہیں رہتی۔ معلوم ہوا کہ ہم میں منہ دیکھے کا ایمان ہے، حقیقی ایمان نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں جاتے ہیں ایمان آ جاتا ہے گھر آتے ہیں ایمان نکل جاتا ہے، یہی معنی نفاق کے ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ بات تو میرے اندر بھی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ہوتا ہوں تو عرش و کرسی کا گویا مشاہدہ کرتا ہوں اور گھر میں یہ کیفیت نہیں ہوتی، یہ تو میرا بھی حال ہے اور جب یہ حال تیرا بھی اور میرا بھی ہے تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی دل کا روگ ہے۔ چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں اس کا علاج کرائیں تو دونوں کے دونوں حاضر ہوئے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سارا واقعہ سنایا کہ حنظلہ ملے۔ میں نے ان سے حال پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ مجھ میں تو نفاق آ گیا۔ پھر میں نے کہا کہ یہ حال تو میرا بھی ہے۔ یا رسول اللہ ہم میں تو نفاق ہے ایمان کہاں ہے ہمارے اندر؟ یہ تو منہ دیکھے کا ایمان ہے۔ فرمایا: ''یَا حَنْظَلَۃُ اَسَاعَۃً وَسَاعَۃً!'' فرمایا: اے حنظلہ! گھبرانے کی بات نہیں سَاعَۃً وَسَاعَۃً! یہی ہوتا ہے کہ کبھی حضور کی کیفیت، کبھی غیب کی کیفیت، کبھی غیبوبت کبھی حضور۔

اور اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال سے سمجھایا۔ فرمایا: دیکھو سمندر ہے، سمندر میں بعض دفعہ تو مد و جزر رہتا ہے۔ طوفانوں کا زمانہ ہوتا ہے موجیں اٹھتی ہیں، جیسے مئی جون اور جولائی کے مہینے ہیں، پھر اکتوبر، نومبر، دسمبر میں آ کر سمندر ساکن بن جاتا ہے۔ جب موجیں اٹھتی ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ سمندر دوگنا تگنا ہو گیا، بلکہ چوگنا ہو گیا گویا اس کا پانی بہت بڑھ گیا۔ اور جب ساکن ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پانی گھٹ گیا، تو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ موجوں میں پانی بڑھتا ہے نہ سکون میں گھٹتا ہے، جب پانی میں جوش ہوتا ہے تو تموج کی وجہ سے نظر یوں آتا ہے کہ پانی چوگنا بن گیا۔ سکون کے وقت وہ بات نہیں رہتی۔ فرمایا۔

''اسی طرح سے جب تم میری مجلس میں آتے ہو تو ایمان کے سمندر میں جوش پیدا ہوتا ہے وہ چوگنا نظر آتا ہے، جب گھروں میں جاتے ہو تو سکون پیدا ہوتا ہے ایمان کے اندر کمی نہیں آتی۔ رہتا اتنے کا اتنا ہی ہے، جیسے سمندر میں سکون کے وقت کمی نہیں، جوش کے وقت زیادتی نہیں''۔

جو وسوسہ گزر رہا تھا وہ قلب سے نکل گیا اور جو عمل کی ترقی رک گئی تھی وہ پھر جاری ہوگئی۔ یہ قلوب کا علاج کرنا ہے۔ یہ حلال وحرام کا بیان نہیں۔ یہ تربیت وتزکیہ نفوس ہے دلوں کا رخ درست کرنا ہے، تو تعلیم مدارس کا کام ہے، تربیت شیخ کا کام ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے سب سے بڑے استاد بھی ہیں اور سب سے بڑے شیخ بھی ہیں ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعمال کی تصحیح فرماتے ہیں اور ایک طرف دلوں کو مانجھتے ہیں اور دلوں میں نورانیت پیدا فرماتے ہیں۔

قلبی نورانیت کے آثار...... اس نورانیت اور قلب کے رخ صحیح ہونے کا اثر یہ ہے کہ جب دل کی راہ صحیح پڑ گئی، جو آیت سامنے آئے گی اللہ کی صحیح مراد سمجھے گا کجی باقی نہیں رہے گی، صحیح مطلب سمجھے گا اور جس کے قلب کی تربیت صحیح نہ ہو اسے آیتوں میں شبہ ہوگا، روایتوں میں شبہ ہوگا، اس لئے کہ دل میں کجی ہے، وہ کجی حدیث یا قرآن کی نہیں وہ اس کے قلب کی ہے اسے وہ حدیث وقرآن میں نظر آتی ہے، حالانکہ حدیث وقرآن اس سے بری ہے اس نے اپنے قلب کو کسی سے صحیح کرایا نہیں۔

بلا تربیتِ قلب قرآن فہمی...... ایک نا تربیت یافتہ نفس جس میں حرص وہوا، کبر وحسد اور انانیت ہے ان اخلاق کے ساتھ جب قرآن میں غور کرے گا تو اوندھے سیدھے مطلب لے گا، اس لئے کہ قلب اور راستہ صحیح نہیں وہ نفس کی طرف متوجہ ہے خدا کی طرف متوجہ ہی نہیں۔

اسی واسطے اس حدیث میں فرمایا گیا ہے جس میں فتنہ انکار حدیث کی خبر دی گئی ہے۔

''يُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانٌ عَلَى اَرِيْكَتِهٖ يَقُوْلُ'' عنقریب ایک وقت آئے گا کہ ایک پیٹ بھرا ہوا آدمی تکیہ لگائے ہوئے مسند پر بیٹھا ہوا ہوگا اور کہے گا۔ ''حَسْبُنَا كِتٰبُ اللّٰهِ'' کتاب اللہ کافی ہے۔ ہم حدیث کو نہیں مانتے۔ جو اس میں حلال ہے اس کو حلال سمجھیں گے جو اس میں حرام ہے اس کو حرام سمجھیں گے۔ تو جہاں فتنہ انکار حدیث کی خبر دی ہے وہاں یہ خبر بھی دی کہ اس فتنہ کا منشاء کیا ہوگا؟ تو فرمایا۔

''رَجُلٌ شَبْعَانٌ عَلَى اَرِيْكَتِهٖ''۔ پیٹ بھرا ہوا آدمی۔ پیٹ بھر کر کھانے والا وہی ہوتا ہے جس کے نفس کے اندر حرص آورزو زیادہ ہوتی ہے۔ صاحب تقویٰ اور متقی کی کام یہ ہے کہ بقدر ضرورت کائے۔ لیکن اناپ شناپ کھائے اور ناک تک پیٹ بھر جائے یہ حریص ہونے اور ہوسنا کی کی علامت ہوتی ہے، اور حریص وہ ہوتا ہے جو

بندہ نفس ہوتا ہے جب بندہ خدا بنتا ہے تو کجی باقی نہیں رہتی اور بندہ نفس ہے تو نفس کی طرف رخ رہے گا۔ تو منہ نفس کی طرف کئے ہوئے ہیں۔ اور خدا کی آیتوں میں غور کر رہا ہے تو برعکس مطلب سمجھے گا۔ صحیح مطلب اس کو نہیں سمجھ میں آئے گا۔ اس لئے دو لفظ فرمائے "شَبْعَانُ" اور "عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ" شبعان سے حریص ہونے کی طرف اشارہ ہے اور "عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ" اس سے کبر اور نخوت کی طرف اشارہ ہے۔ تو وہ لوگ جن کو اپنے علم پر گھمنڈ ہے کہ ہم جانتے ہیں اور باقی سب جاہل ہیں تو پہلا نزغہ تو یہ ہے کہ ان میں کبر و نخوت ہے اور حریصانہ شان ہے۔ اس شان کو لے کر قرآن کو سمجھیں گے تو اپنی شان کے مطابق ہی وہ مطلب بھی سمجھیں گے اور خیال یہ کر لیں گے کہ یہ اللہ کا مطلب اور مراد ہے۔ اس لئے اللہ نے اپنے رسول کو بھیجا کہ لفظوں کی بھی تلاوت کرے، معنی بھی سمجھائیں عمل بھی کر کے دکھلائیں نفوس کو مانجھیں اور تزکیہ بھی کریں۔

اللہ کے رسول کے دنیا سے اٹھنے کے بعد یہ چاروں چیزیں موجود رہنی چاہئیں تب تو دین کامل موجود ہے اور اگر ان میں سے ایک بھی گھٹ جائے تو کہا جائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناقص دین چھوڑ گئے ہیں کامل اسلام باقی نہیں ہے۔

خدمَتِ کلامُ اللہ...... الحمد للہ! آج تلاوت آیات بھی موجود ہے، لاکھوں حفاظ امت کے اندر موجود ہیں، جن کو قرآن کے الفاظ از بر یاد ہیں۔ دنیا میں کسی قوم نے اپنی مذہبی کتاب کی وہ خدمت نہیں کی جو مسلمانوں نے کی ہے ایک چھ برس کا بچہ کھڑا ہوتا ہے، اور الحمد سے لے کر والناس تک فر فر پڑھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ رمضان شریف میں آپ دیکھیں مساجد میں ایک رونق ہوتی ہے جگہ جگہ تراویح ہوتی ہیں۔ امام پڑھ رہا ہے اگر اس نے کہیں غلطی کی تو مقتدی پیچھے لگ جاتے ہیں جب تک اس کو لقمہ دے کر صحیح نہ کرا دیں اس کو آگے نہیں چلنے دیتے تو سننے والے بھی حفاظ ہوتے ہیں، پڑھنے والے بھی تواتر طبقہ کے ساتھ قرآن کی روایت موجود ہیں، تو الفاظ کے محافظ درحقیقت حفاظ ہیں۔

قرآن کے معانی کی حفاظت کرنے والے علماء ربانی ہیں۔ عمل کر کے دکھلانے والے حضرات صوفیائے محققین ہیں جو کمال تقوی و دیانت سے عمل کی ہیئتیں بتلاتے ہیں، اور عمل کر کے دکھلاتے ہیں اور دلوں کو مانجھنے والے وہ حضرات ہیں جو خانقاہوں میں بیٹھ کر قلوب کی تربیت کرتے ہیں تو تلاوت، تعلیم، تزکیہ اور اسوہ کے تمام افعال جاری ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی چیز باقی نہ رہے تو کہا جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کے چار ستونوں میں سے ایک گر گیا۔ تو اسلام کی عمارت کیسے باقی رہتی؟

آج بحمد اللہ چاروں طبقے موجود ہیں اور یہ چاروں حق تعالیٰ شانہٗ کے خلفاء ہیں۔ اللہ کے ایک علمی خلیفہ ہیں جو اس کے الفاظ کو محفوظ کئے ہوئے ہیں ایک علمی خلیفہ وہ ہیں جو اس کے معانی کو محفوظ کئے ہوئے ہیں، ایک عملی خلفاء ہیں کہ آیتوں میں جو کیفیات چھپی ہوئی ہیں اور قلب پر پڑتی ہیں۔ ان کیفیات کو ریاضات اور مجاہدات سے محفوظ کئے ہوئے ہیں، یہ مٹنے والی چیز نہیں۔ انکار کرنے والے انکار کریں، پہلے بھی منکر پیدا ہوئے ہیں۔

خدمتِ حدیث...... فرق اتنا ہے کہ پہلے منکر اقرار کی صورت سے انکار کرتے تھے یعنی وضاعین حدیث کا زمانہ، یعنی حدیثیں گھڑ گھڑ کر صحیح احادیث سے ملاتے تھے تاکہ صحیح احادیث کا اعتماد اٹھ جائے۔ لوگ احادیث کو نا قابل اعتبار سمجھیں۔ تو انہیں اتنی جرأت نہیں تھی کہ حدیث کا انکار کریں، اقرار کر کے پھر سازش کر کے حدیثیں گھڑ گھڑ کر رلا ملا دیتے تھے، لیکن اللہ جزائے خیر دے حضرات محدثین کو کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیا، مستقل کتابیں لکھ دیں کہ یہ حدیثیں صحیح ہیں یہ حدیثیں موضوع ہیں، احادیث کی اقسام بیان کیں، حجیت کے مراتب بیان کئے۔

ہر حدیث ایک ہی درجے کی نہیں ہوتی۔ اگر حدیث متواتر ہے اس کی سند کا ثبوت ایسا ہے۔ جیسے قرآن کا اس حدیث سے جو چیز ثابت ہوگی وہ قطعی ہوگی، اور موجب یقین ہوگی۔ اگر حدیث اس سے کم درجہ کی ہو تو اسے خبر واحد کہتے ہیں۔ وہ موجب ظن ہوگی۔ موجب یقین نہیں ہوگی۔ اگر حدیث ظنی ہے اور اس میں کچھ اور کمزوری پیدا ہوگئی وہ معضل ہوگی۔ تائید کے درجے میں استعمال کی جاسکے گی، کسی حکم کی بنا نہیں بنائی جاسکے گی۔ غرض حدیث کی اقسام بیان کیں کہ متن کے لحاظ سے اتنی اقسام ہیں اور سند کے لحاظ سے اتنی اقسام ہیں، رجال سند کے لحاظ سے اتنی اقسام ہیں، اگر اول سے یعنی صحابی رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوئی راوی حذف ہو جائے تو اسے مرسل کہیں گے۔ شروع میں اگر راوی نہ رہے تو اسے معضل کہیں گے بیچ میں راوی نہ رہے تو اسے مشکل کہیں گے، معضل و مرسل اور مشکل کے احکام بیان کئے جو حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو۔ سارے راوی اس کے ثقہ ہوں، وہ مرفوع متصل کہلائے گی۔ اور جس میں انقطاع پیدا ہو جائے اس کا یہ حکم ہے تو اس کو مستقل فن بنایا، دنیا میں روایت کا فن موجود نہیں تھا، مسلمانوں نے یہ فن بنایا اور حدیث کے فن کے لحاظ سے اس کو بنایا، حدیث کی تاریخ اور رجال حدیث کی تاریخ مرتب کر دی۔

روایت کرنے والے آدمی چار لاکھ کے قریب ہیں۔ تو چار لاکھ آدمیوں کی سوانح عمریاں جمع کر دیں، تاکہ واضح ہو جائے کہ کس کیریکٹر کے آدمی تھے، کس کردار کے آدمی تھے۔

روایت حدیث میں احتیاط...... پھر روایت میں یہ احتیاط کہ اگر عمر بھر میں ایک دفعہ جھوٹ ثابت ہو جائے تو اس کی عمر بھر کی روایتیں کالعدم کر دیتے تھے، کہ یہ روایتیں قابل اعتبار نہیں ہیں اور جھوٹ بولنا تو بجائے خود رہا۔ اگر صورت کذب اور واہمہ کذب بھی پیدا ہو جائے تب بھی اس کی روایت چھوڑ دیتے تھے۔

ایک محدث ہیں ان کا واقعہ تراجم میں موجود ہے کہ انہیں معلوم ہوا کہ اس حدیث کی سند عالی شام میں موجود ایک محدث کے پاس ہے، تو ایک حدیث کی سند لینے کے لئے مدینہ منورہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّكَرَامَةً) سے تین سو میل کا سفر شام کے لئے کیا۔ اس زمانے کے سفر پیدل چلنا، اونٹوں پر چلنا وغیرہ مہینوں میں جا کر پہنچتے تھے۔ صرف ایک حدیث سننے کے لئے تین سو میل سفر کی صعوبت اختیار کی، جا کر ان کا پتہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ محدث فلاں محلے میں رہتے ہیں۔ ان کے مکان پر گئے آواز دی وہ باہر آئے۔ سلام و مصافحہ کیا۔ انہوں نے نہایت اخلاق

سے ٹھہرایا۔ ان کی مجلس ہوئی تو ان کا ایک بچہ اس مجلس میں آ گیا۔ بچے میں ضد ہوتی ہے وہ کسی چیز پر ضد کرنے لگا۔ اس کو ہزار بہلایا پھسلایا مگر وہ ضدی بچہ تھا مانتا نہیں تھا۔ تو ان محدث نے ہاتھ بند کر کے کہا کہ آؤ تمہیں چیز دیں۔ وہ بچہ آیا تو ہاتھ میں تو کچھ تھا نہیں، اسے بہلانا مقصود تھا، اسے لے کر باہر کر دیا۔

یہ جو حدیث سننے گئے تھے یہ لاحول پڑھ کر اٹھ کر چلے آئے اور کہا کہ جو معصوم بچے کے سامنے جھوٹ بول سکتا ہے کہ ہاتھ میں کچھ نہیں تھا اور کہا کہ: آؤ تمہیں چیز دیں۔ اسے اللہ پر جھوٹ بولتے ہوئے کیا دیر لگتی ہے، وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بول دے تو کیا اس کی زبان تھام لی جائے گی تو یہ بالکل مباح تھا۔ لیکن سارا اپنا سفر اکارت کر کے واپس آ گئے کہ یہ اس قابل نہیں ہے کہ اس سے حدیث سنی جائے، بچے کو بہلانے کے لئے جھوٹ بول دے۔ ہاتھ میں چیز نہ ہو اور کہہ دے کہ آؤ چیز دیں، حالانکہ واقعہ کے لحاظ سے یہ جھوٹ نہیں تھا بہلانے کے لئے توریہ کی سی صورت ہوتی ہے، ایسے آدمی کو کاذب نہیں کہا جا سکتا مگر حدیث کی سند میں صورتِ کذب اور وہم کذب کو بھی کذب سمجھا ہے، اس احتیاط سے روایتیں لی ہیں تب آج دین منقح صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اگر خدا نخواستہ شیعوں منکر پیدا ہو جاتے تو قرآن سمجھانے والا آج کوئی باقی نہ رہتا۔ بس پھر یہی ہوتا کہ اردو کے ترجمے دیکھ دیکھ کر لوگ الگ الگ ہانکتے اور کہتے کہ یہ خدا کی مراد ہے اور وہ علم نہ ہوتا اور اسے اللہ کی طرف منسوب کر دیتے۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو چار فریضے دے کر بھیجا گیا تھا۔ وہ چاروں فریضے آج بھی موجود ہیں۔ اور چاروں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء موجود ہیں۔ الفاظ کی روایت کرنے والے۔ معانی اور احکام کی روایت کرنے والے، تزکیہ قلوب کے سلسلے میں نیابت کا فرض انجام دینے والے بھی اور عمل کا نمونہ دکھلانے والے بھی۔

آدابِ تعلیم...... مگر ہاں! ان کی تلاش کی ضرورت پڑتی ہے، اس لئے کہ ایسے لوگ لوگوں کے گھروں پر نہیں جایا کرتے کہ ہم سے سیکھ لو۔ لوگوں کو ان کے گھروں پر جانا پڑتا ہے۔ " اَلْعِلْمُ یُؤْتیٰ وَلَایَأْتِیْ "علم خود نہیں آتا۔ اسے حاصل کرنے کے لئے اس کے پاس جایا جاتا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ہارون الرشید نے کہا کہ میرے دو بیٹے ہیں۔ آپ انہیں "موطا" پڑھا دیں۔ (یہ حدیث کی کتاب ہے) آپ نے وعدہ فرمایا کہ پڑھا دوں گا۔ ہارون الرشید نے کہا کہ کس وقت تشریف لایا کریں گے؟ فرمایا تشریف لانے کا کیا مطلب؟

" اَلْعِلْمُ یُؤْتیٰ وَلَایَأْتِیْ " علم خود لوگوں کے دروازوں کے اوپر آیا کرتا ہے؟ ان کو خود آنا پڑے گا، تو ہارون الرشید پر ذرا بھاری گزرا، مگر اس نے کہا کہ بہتر ہے حاضر ہوں گے، مگر ایک شرط ہے کہ عام طالب علموں میں نہ بٹھائیں۔ ان کو ذرا امتیازی جگہ بٹھلائیں۔

فرمایا: طالب علمی کی لائن میں سب برابر ہیں، اگر آپ کو جاہل رکھنا ہے تو میں امتیازی برتاؤ کروں؟ عالم بنانا ہے تو یہ برتاؤ نہیں ہوگا۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ علم تمہارے گھر سے نکلا ہے تم بنی عباس ہو۔ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کے اقارب ہو۔ اگر تم ہی اس کو ذلیل کرو گے تو اسے عزت دینے کے لئے کون آئے گا؟

پھر شہزادے اسی طرح جاتے تھے، اسی طرح مؤدب بیٹھتے تھے اور استاد کی جھڑکیاں بھی سنتے تھے، اس طرح حدیث حاصل کی۔ پھر ہارون الرشید کا بھی یہ عالم ہوا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ مامون سے کہا کہ پانی ڈالو میں پیر دھوتا ہوں۔ تو مامون الرشید شاہزادہ پانی ڈال رہا تھا، امام مالک اپنے پیر کو اپنے ہاتھ سے صاف کر رہے تھے، اچانک ہارون الرشید پہنچ گئے تو دیکھ کر امام مالک سے شکایت کی۔ یہ شکایت نہیں کہ کیوں پیر دھلوائے؟ کیوں پانی ڈلوایا۔ فرمایا مجھے اس کی شکایت ہے کہ آپ اپنے پیر کو اپنے ہاتھ سے مل رہے ہیں، مامون کے ایک ہاتھ میں لوٹا ہوتا، ایک ہاتھ سے آپ کے پیر مل کر دھوتا۔ مامون کا یہ فرض تھا۔ نہ یہ کہ وہ فقط پانی ڈالے پھر اس درجے پر ہارون الرشید آ گیا۔

کمالِ طلب......تو حقیقت یہ ہے کہ: "اَلْعِلْمُ عِزٌّ لَا ذُلَّ فِیْهِ وَلٰكِنْ يُّحْصَلُ بِذُلِّ لَا عِزَّ فِيْهِ" یہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ علم ایک ایسی عزت ہے جس میں ذلت کا نشان نہیں، مگر ایسی ذلت سے حاصل ہوتا ہے جس میں عزت کا نشان نہیں، غلامی محض کرنی پڑتی ہے، اساتذہ کے آگے جھکنا پڑتا ہے اڑی کڑی جھیلنی پڑتی ہے۔ تب جا کر چار حرف آتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ یہ اتنا بڑا علم آپ کو کیسے حاصل ہوا تو فرمایا: " بِلِسَانٍ سَئُوْلٍ وَّقَلْبٍ عَقُوْلٍ "①

سوال کرنے والی زبان اور عقل مند قلب کے ذریعہ حاصل ہوا، میں نے سوال کرنے میں کبھی عار نہیں کیا۔ اگر مسئلہ معلوم نہیں ہوا اپنے چھوٹے سے سوال کر لیا، چناں چہ ایک دفعہ ایک مسئلہ ذہن میں اٹکا، تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جو کاتب وحی ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے استاد ہیں۔ ضرورت پڑی کہ ان سے تحقیق کی جائے، تو بارہ بجے دوپہر کو یہ سوال ذہن میں آیا تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی دہلیز پر بیٹھ گئے، جہاں جلتا ہوا پتھر ہے، دھوپ پڑ رہی ہے یہ خیال کیا کہ جب ظہر کی نماز کے لئے نکلیں گے تو سوال کروں گا اگر مسجد میں پہنچ گئے تو درس شروع ہو جائے گا، سوال کا موقع نہیں رہے گا تو ساری دوپہر دھوپ میں دہلیز پر بیٹھ کر گزاری۔ جب اچانک زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نکلے فرمایا۔

اے ابن عم رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ آپ کہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟ عرض کیا: حضرت ایک مسئلہ اٹک رہا تھا، اس کی تحقیق کرنی ہے۔ فرمایا پھر آ جاتے۔

عرض کیا: سوال تو دل میں اب ہی کھٹکا تھا، پھر آنے کا کون سا وقت ہے؟ جب سوال ذہن میں آیا تو جبھی حاضر ہو گیا۔

اس سے شدت طلب معلوم ہوئی۔ اور شدت طلب کے ساتھ ساتھ کسر نفس بھی واضح ہوا کہ علم کے حاصل

① فیض القدیر، ج: ۲ ص: ۵۶۹.

کرنے میں نہ کسی وقار کا سوال نہ کسی خودداری کا سوال غلاموں اور خادموں کی طرح جا کر دہلیز کے اوپر بیٹھ گئے اس طرح سے علم حاصل ہوتا ہے۔

عظمت استاذ...... حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیو بند، (جن کا نام نامی ابھی آپ نے سنا) کو خنزیر کے بارے میں تحقیق کرنی تھی فقہی مسئلہ میں کسی موقع پر خنزیر کا ذکر آیا تو لوگوں نے کہا کہ: یہ تو بھنگیوں سے معلوم ہو سکتا ہے، وہی خنزیر پالتے ہیں، انہیں کو زیادہ معلوم ہوگا۔

تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں جو بھنگی آتا تھا، ایک دن اس سے پوچھا کہ بھئی! خنزیر کے بارے میں اس بات میں تمہاری کیا تحقیق ہے؟ کیا علم ہے؟ اس نے اصلیت بتلائی کہ یہ صورت ہوتی ہے۔ اس دن کے بعد سے جب وہ بھنگی آتا تو اس کی تعظیم۔ میں کھڑے ہو جاتے اور فرماتے۔ ''اس کے ذریعہ مجھے ایک علم حاصل ہوا ہے''۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: '' اَنَا عَبْدُمَنْ عَلَّمَنِیْ حَرْفًااِنْ شَآءَ بَاعَ وَاِنْ شَآءَ عَتَقَ''

میں اس کا زرخرید غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف سکھا دیا۔ چاہے مجھے بیچ دے، چاہے آزاد کر دے۔ تو علم تو اس کے ساتھ آتا ہے کہ اتنا نفس پست کر لیا جائے اتنی ذلت و تواضع اختیار کی جائے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گھر بیٹھے سارا علم سمٹ کر خود بخود ہمارے سینے میں آ جائے یہ عادت اللہ کے خلاف ہے۔

اہل علم کا استغناء...... ایسے لوگ جو علم میں گہری نظر رکھتے ہیں، علمی تحقیقات پر ان کی عمریں بسر ہوئی ہیں، وہ لوگوں کے گھروں کے دروازوں کو جھانکتے نہیں پھرتے، لوگوں کا فرض ہوتا ہے کہ ان کے پاس آئیں۔ جو آتے ہیں وہ کامیاب ہوتے ہیں جو نہیں آتے بے علم رہ جاتے ہیں، مگر امت خالی نہیں ہے اگر امت خالی ہو جائے تو اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب لازم آتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ یَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِیْفَ الْغَالِیْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِیْنَ وَتَاْوِیْلَ الْجَاهِلِیْنَ''

فرمایا کہ: ہر سلف کے بعد خلف پیدا ہوتے رہیں گے، اس علم کو اٹھاتے رہیں گے اور اس علم کے ذریعے سے غلو کرنے والوں کی تحریفوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے، مبطلوں کی دروغ بافیوں کے پردے چاک کرتے رہیں گے اور جاہلوں کی رکیک تاویلات کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور علم نکھر کر سامنے آتا رہے گا، حق و باطل میں امتیاز ہوتا رہے گا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں لاوارث چھوڑ کر نہیں گئے، آپ ہمارے ہاتھ میں علم و عمل ذوق اور استقامت ذہن کی پوری قوت دے کر گئے ہیں، سارے راستے ہمارے لئے کھول کر گئے ہیں۔

گمراہی سے حفاظت کی ضمانت...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ: ''تَرَکْتُ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَبَدًا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا'' دو وزنی چیزیں تم میں چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تم نے ان کو مضبوط پکڑ لیا اور ان کو لپٹ گئے تو کبھی قیامت تک گمراہ نہیں ہوگے۔ ''کِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِیْ'' اللہ کی کتاب اور میری سنت۔ میرا طریقہ اور میرا عمل۔ ان کو وزنی کہا ہے؟

اس لئے کہ جب طوفان اٹھتے ہیں۔ تنکے کا سہارا پکڑ لینے سے جان نہیں بچتی۔کوئی لکڑی تیر رہی ہے۔ بڑی سے بڑی ہے وہ خود بہہ رہی ہے۔آپ نے اسے پکڑلیا، بہنے ہی کی طرف جائیں گے۔ جان بچنی ضروری نہیں۔ لیکن اگر کوئی چٹان پڑی ہو۔ جو ہلائے نہ ہلے اگر اسے پکڑلیں گے تو طوفان آپ کا کچھ نہیں کر سکتا۔تو کتاب وسنّت ایک مضبوط چٹان کی طرح ہیں۔ دنیا میں کتنے ہی جہالتوں اور دروغ بافیوں کے طوفان آئیں لیکن اس چٹان سے جو تمسک کر رہا ہے وہ کبھی نہیں بہک سکتا، کبھی گمراہ نہیں ہوسکتا اس لئے کہ کتاب اللہ اپنی جگہ اٹل ہے اس کے معانی بھی اٹل ہیں، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اوراس کے معانی اپنی جگہ اٹل ہیں جو اس سے تمسک کرے گا وہ ہر دروغ بافی کا پردہ چاک کرسکتا ہے ہر مبطل کے انتحال اور ہر جاہل کی رکیک تاویلوں کو رد کرسکتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خبر دے گئے ہیں کہ قیامت تک امت میں خلف صالح پیدا ہوتے رہیں گے۔

تجدید دین...... جہاں یہ خبر دی کہ فرقے پیدا ہوں گے۔گمراہ پیدا ہوں گے وہاں یہ بھی خبر دی کہ حقانی لوگ بھی برابر جاری رہیں گے۔اس امت سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا ."لَاتَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَایَضُرُّهُمْ مَّنْ خَاذَلَهُمْ وَلَامَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُاللّٰهِ" ① فرمایا! میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی جو منصور من اللہ ہوگی۔ اللہ کی طرف سے اس کی تائید ہوگی، خلاف کرنے والے اسے ضرر نہیں پہنچا سکتے رسوا کرنے والے اسے رسوا نہیں کرسکیں گے۔یہاں تک کہ قیامت آجائے۔اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:" اِنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ یُّجَدِّدُ لَهَا دِیْنَهَا." ② اس امت میں ہر سو برس کے بعد مجدد دین آتے رہیں گے جو دین کو نکھارتے رہیں گے۔ دودھ اور پانی الگ کر کے نکھار کر علم اور مسائل نکالتے رہیں گے۔صدی کے اخیر میں جو لوگ قلت علم اور کثرت جہل سے کچھ کا کچھ سمجھ جائیں گے، من گھڑت رسوم اور عمل پیدا کردیں گے تو اللہ نے وعدہ کردیا کہ ہر صدی کے آخر میں مجدد دین آکر دین کو نکھار دیں گے، پھر صدی کے اخیر میں علمی اور عملی فتنے پیدا ہوں گے پھر مجدد آجائیں گے، خواہ جماعتوں کی صورت میں آئیں یا افراد کی صورت میں آئیں، غرض امت گمراہ ہونے والی نہیں ہے۔چناں چہ فرمایا گیا:" لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ" ③ میری امت پوری کی پوری کبھی گمراہی پر قیامت تک جمع نہیں ہوگی۔اہل حق ہمیشہ باقی رہیں گے۔حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:" کَیْفَ تُهْلَکُ اُمَّةٌ اَنَا اَوَّلُهَا وَالْمَسِیْحُ اٰخِرُهَا وَالْمَهْدِیُّ وَسَطُهَا" حدیث منکر ہے۔السلسلة الضعیفة ۵/۱۷۲ اول الکتاب ④ "وہ امت کیسے گمراہ ہوسکتی ہے

① سنن ابن ماجه،باب اتباع سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم،ج:۱،ص:۱۲ رقم:۱۰.

② السنن لابی داؤد، كتاب الملاحم،باب مايذكر في قرن المائة. حدیث صحیح ہے دیکھئے:صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج:۹ ص:۲۹۱. ③ المستدرک للحاکم ج:۱ ص:۲۰۱ رقم:۳۹۵. حدیث صحیح ہے۔دیکھئے:صحیح وضعیف الجامع الصغیر ج:۷ ص:۱۷۶. ④ الفتن لنعیم بن حماد،بقاء عیسی ابن مریم علیه السلام بعد نزوله، ج:۲ ص:۵۷۸ رقم:۱۶۱۴. حدیث صحیح ہے۔دیکھئے:صحیح وضعیف ابن ماجه ج:۱ ص:۸۲ رقم:۸۲.

جس کے ابتدائی سرے پر میں ہوں۔ انتہائی سرے پر مسیح ابن مریم ہوں اور بیچ میں حضرت مہدی ہوں'' تو امت کا اول و آخر کے لحاظ سے بھی بتلایا کہ وہ حق پر قائم رہے گی امت کے درمیانی قرون کا بھی بتلایا کہ ہر قرن میں مجدد آئیں گے، امت کے ہر قرن کے ہر ہر سال کے بارے میں بتلایا کہ: ''یَحْمِلُ ھٰذَا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ'' تدریس و تعلیم کا سلسلہ جاری ہوگا اور خلف صالح پیدا ہوتے رہیں گے، یہ امت کوئی لاوارثی امت نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس کا حلیہ بگاڑ دے، اگر بگاڑنے والے پیدا ہوں گے تو اس بگاڑ کو دکھلانے والے بھی پیدا ہو جائیں گے۔ تاویل کرنے والے ہوں گے تو اس رکیک تاویل کو باطل کرنے والے بھی پیدا ہوں گے۔ بہر حال یہ دین ہر دہر اور قرن میں نکھرا ہوا رہے گا۔

فرقہ ناجیہ...... فرق اتنا ہے کہ کبھی اہل حق کی قلت ہوگی، کبھی کثرت ہوگی۔ لفظ ''طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ'' کا بولا ہے، یعنی ایک چھوٹی جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی، چاہے عددی قلت ہو مگر بہر حال موجود رہے گی۔ اسی طرح جہاں یہ خبر دی کہ امت میں تہتر فرقے پیدا ہوں گے اور بہتر ناری ہوں گے وہاں یہ بھی خبر دی کہ ایک فرقہ ناجی ہوگا۔ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: '' وَمَنْ هُمْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! (صلی اللہ علیہ وسلم)'' وہ فرقہ ناجیہ کون ہے؟ فرمایا: ''مَآ أَنَا عَلَیْهِ الْیَوْمَ وَأَصْحَابِیْ'' جس پر میں اور میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) آج کے دن ہیں اس پر چلنے والا فرقہ حق ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین معیارِ حق ہیں...... اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ: ''مَآ أَنَا عَلَیْهِ الْیَوْمَ وَأَصْحَابِیْ'' جس پر میں اور میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو اپنے ساتھ شریک کیا۔

اس سے واضح ہوا کہ جو میرا دین ہے وہی بعینہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا دین ہے۔ جو میرا عقیدہ ہے وہی بعینہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا عقیدہ ہے جو میرا عمل ہے وہی بعینہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل ہے۔ فرق اتنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ان اعمال کے ساتھ وہ اعمال بھی ہیں کہ امت ان کی نقل نہیں اتار سکتی جو خصوصیاتِ نبوت میں داخل ہیں۔ صحابہ کے اندر عملوں کے مختلف نمونے ہیں، تاجر ہے تو تجارتی عمل دیانت کے ساتھ اس کے اندر موجود ہے، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم زارع اور کاشت کار ہیں تو زراعت کے مسائل دیانت کے ساتھ ان کے اندر موجود ہیں۔ فوجی ہیں تو فوج کے مسائل دیانت کے ساتھ موجود ہے۔ سول میں ملازم ہیں تو اس کے مسائل دیانت کے ساتھ ان میں موجود ہیں۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم مختلف رنگوں کے ہیں۔ مگر ہر رنگ میں دیانت بھری ہوئی ہے، سرخ اور سبز رنگ ہے، مگر اندر ان کے دین کی روح کام کر رہی ہے۔

امت میں چوں کہ طبقات مختلف ہیں، طبائع مختلف ہیں۔ مزاج مختلف ہیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں اللہ نے اتنے ہی مزاج کے لوگ پیدا کر دیئے تاکہ جس مزاج کا آدمی ہو جیسا مزاج چاہئے ویسے ہی مزاج کا آدمی صحابہ رضی

اللہ عنہم میں مل جائے اس لئے فرمایا کہ " میں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم" تو سارے صحابہ رضی اللہ عنہ کا ایک دین ہے، اس لئے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کا متبع بن گیا وہ میرا متبع ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کو اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو معیار بتلایا کہ ان کے عمل اور ایمان پر اپنے عمل اور ایمان کو پرکھ لو، یعنی تم صحابہ رضی اللہ عنہم کے افعال پر نقد وتبصرہ نہیں کر سکتے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم تمہارے افعال پر نقد وتبصرہ کریں گے کیوں کہ وہ تمہارے کھرے اور کھوٹے پہچاننے کے لئے کسوٹی ہیں۔ تو کسوٹی بتلاتی ہے کہ سونا کھرا ہے یا کھوٹا، سونے کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ بتلائے کہ یہ کسوٹی کھری ہے یا کھوٹی، تو کسوٹی ناقد ہے منقود نہیں ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم ناقد ہیں ہم منقود ہیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ منقود ہمیشہ مغلوب ہوتا ہے۔ ناقد غالب ہوتا ہے۔ اگر ہم صحابہ رضی اللہ عنہم پر نقد وتبصرہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان پر غالب اور افضل ہیں۔ ان کے اعمال کا کھرا اور کھوٹا بتا سکتے ہیں۔ حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہمارے حق میں کسوٹی ہیں۔ وہ بتلائیں گے کہ تمہارا اتنا عمل کھوٹا ہے کیوں کہ وہ ہمارے مطابق نہیں ہے اور اتنا کھرا ہے کہ جو ہمارے مطابق ہے۔ گویا صحابہ رضی اللہ عنہم کو معیار بتلایا گیا۔

اہلِ حق کی پہچان...... اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت ومحبت اور اطاعت دل میں موجود ہے۔ تو سمجھ لو کہ وہ فرقہ حق پر ہے اور اگر عظمت ومحبت اور اطاعت موجود نہیں ہے تو باطل پر ہے یہ ایک کھلا معیار ہے۔ اس لئے جو فرقے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں گالم گلوچ کرتے ہیں وہ کبھی حقانی نہیں کہے جاسکتے۔ انہوں نے پہلی بنیاد ہی ختم کردی جو ان کے حق میں اس کے قائل ہیں کہ ان کی فلاں بات کھری ہے اور فلاں کھوٹی ہے وہ کبھی بھی دین کو پوری طرح نہیں پاسکتے۔ دین کو وہی پائیں گے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی پوری عظمت کے قائل ہیں۔ چناں چہ اہل سنت و الجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ: "اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ." سارے صحابہ رضی اللہ عنہم عدول، متقن اور پارسا ہیں۔

جیسے انبیاء علیہم السلام اپنے اقوال وافعال میں معصوم ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اپنی نیات اور باطن میں محفوظ ہیں، عملی لغزش اگر ان سے ہو جائے تو ہو جائے، مگر ان کے قلوب کا رخ اتنا پاک اور صحیح ہے کہ اللہ نے ان کے قلوب کو پہلے ہی جانچ لیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾①

صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ اللہ نے ان کے قلوب کا پہلے ہی امتحان کرلیا ہے۔ انہیں اپنے رسول کی صحبت کے لئے منتخب کیا ہے، تو امتحان کرلیا اور یہ امتحان میں پاس ہوگئے، اس لئے ان کے لئے مغفرت بھی ہے اور اجر عظیم بھی ہے تو جس پر حق تعالیٰ اطمینان نہ فرمائیں اسے کیسے اجر دیں؟

اسی طرح اور مقام پر ارشاد ہے: "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ" اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے راضی۔ جن کے دلوں میں کھوٹ ہو۔ اللہ ان سے کبھی راضی نہیں ہوسکتا۔ رضا بھی ایسی کہ اس کا اعلان کر دیا گیا اور اعلان قرآن

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳.

حکیم میں کیا گیا تا کہ قیامت تک یہ اعلان جاری رہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی لمحہ ایسا نہیں آ سکتا کہ ان کا کھوٹ ثابت ہو۔ قیامت تک ان کی رضا کا پتہ دے دیا۔ غرض قلوب اور باطن کا پتہ یہ کہہ کر دیا کہ ہم نے ان کے قلوب کو جانچ لیا ہے اور اعمال کا پتہ دوسری جگہ دیا۔ فرمایا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ ①

تم انہیں دیکھو گے کہ رکوع اور سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ کے فضل اور رضا کو تلاش کر رہے ہیں۔ ہر حال میں اللہ کی طرف انابت اور رجوع ہے ان کے سجدوں کا اثر ان کی پیشانیوں پر آ گیا ہے تو ایک طرف عمل کو سراہا اور ایک طرف دل کو سراہا۔ ایک طرف ان کا مقام بتلایا تو من حیث الطبقہ جس طبقے کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے۔ وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے، بعد میں افراد آتے رہیں گے، لیکن من حیث الطبقہ پورے طبقے کو سراہا گیا۔ اس کی تقدیس کر دی گئی ہو۔ سوائے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دوسرا طبقہ نہیں ہے۔ اس لئے فرمادیا گیا: ''اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ'' میرے سارے صحابہ رضی اللہ عنہم ستاروں کی مانند ہیں، جس کی روشنی میں چل پڑو گے، ہدایت پا جاؤ گے، راستہ تمہیں مل جائے گا، کسی کا استثناء نہیں کیا۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم امین ہوئے۔

وارثت نبوی کا استحقاق...... اور گویا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی روحانی اولاد ہیں پھر ان کی روحانی اولاد تابعین ہیں جنہیں وہ وراثت ملی پھر ان کی روحانی اولاد تبع تابعین ہیں۔ جنہیں وہ وراثت ملی ثم وثم چلتے چلتے وہ فرقہ حقہ وہ اہل حق آج بھی ان کے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کے وارث بنے تو ہماری علمی وراثت جب ہی قائم رہ سکتی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے۔ اگر بیچ میں ایک کڑی بھی کٹ گئی وراثت سے محروم ہو جائیں گے اس لئے کہ وراثت اسے ملتی ہے جس کا نسب محفوظ ہو اور نسب ہی محفوظ نہ ہو تو وراثت کا حق دار کہاں ہے؟ جس نے طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہم یا تابعین یا تبع تابعین سے تعلق نہ رکھا تو سوال یہ ہے کہ وہ دین اس تک پہنچا کیسے؟ وہ جو سلسلہ زنجیر کا آرہا ہے تھا اس کی کڑی ٹوٹ گئی تو دین کیسے پہنچا؟ وحی آنے سے رہی کیوں کہ نبوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ عقلی اختراعات کا نام دین نہیں ہے، نقل کا نام دین ہے، اور منقول ہونے کے لئے سلسلہ کی ضرورت ہے، اور سلسلہ میں سے ایک کڑی نکل گئی پھر دین کیسے پہنچا؟ تو لامحالہ الفاظ ومعانی، ذوق اور استقامت قلب نیز تزکیہ نفس میں سلسلہ ماننا پڑے گا، ساری چیزیں ہم تک منقول ہو کر پہنچیں گی تب تک دین کا کمال ہم میں پیدا ہوگا، سلسلہ کٹ گیا یا سلسلہ کے ذریعہ جو چار چیزیں ہم تک پہنچ رہی تھیں، ان میں سے ایک کڑی کٹ گئی۔ دین ناقص رہ جائے گا۔ تو وعدہ یہ کیا گیا ہے کہ دین کامل ہو کر باقی رہے گا اور سلسلہ ختم ہونے کے بعد سرے سے دین نہیں رہتا اور دین کے اجزاء میں سے کوئی چیز کٹ جائے تو کامل دین نہیں رہتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب لازم آئے گی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اس سے بری ہے کہ کوئی اس کی تکذیب کرے۔

---

① پارہ: ٢٦، سورة الفتح، الآية: ٢٩.

آفتابِ راہ اور راہ نما...... بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آفتابِ نبوت بن کر تشریف لائے، دنیا میں عقائد و اعمال اور رسوم کی جو ظلمات پھیل گئی تھیں، آفتاب نبوت نے آ کر ان سب کے پردے چاک کر دیئے، دیگر انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام ستاروں کی مانند ہیں۔ ستارے سارے کے سارے نمودار ہو جائیں، مگر رات زائل نہیں ہوتی اگر چہ روشنی پھیل جائے۔ آفتاب کی آمد کا جب قصہ شروع ہوا پو پھٹی تو ابھی آفتاب نکلا نہیں مگر رات غائب ہونا شروع ہو جاتی ہے تو تمام انبیاء علیہم السلام آئے انہوں نے دلوں میں دماغوں میں روشنی پھیلائی۔ لیکن رات ہی رات رہی مگر آفتاب نبوت طلوع ہوتے رات ختم ہوگئی اور دن نکل آیا اور ہر چیز جتنی دن میں واضح نظر آتی ہے، رات میں نظر نہیں آتی تو توحید کے دقائق رسالت کے دقائق بلاشبہ سارے انبیاء علیہم السلام نے سمجھائے۔ لیکن رات کے وقت روشنی میں آدمی اجمالی طور پر سمجھتا ہے۔ دن کی روشنی میں ایک ایک مخفی چیز نمایاں ہو جاتی ہے تو توحید و رسالت کے جتنے دقائق اس دین میں کھلے۔ پچھلے ادیان میں وہ حقائق نہیں ملتے جتنے علوم و معارف توحید و رسالت کے اس دین نے واضح کئے دنیا کے کسی دین میں نہیں کھلے پچھلے انبیاء علیہم السلام نے نکتے کھولے مگر جتنی روشنی تھی اتنا اجمال سامنے آ گیا، جب تیز روشنی پڑی تو چھپی چیزیں بھی کھل گئیں اور نمایاں ہوگئیں۔

غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات آفتاب نبوت اور مشعل نور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے رکھنا یہ اس کی دلیل ہے کہ حق واضح ہو گیا جو آپ سے اوجھل ہے وہ ناحق ہے اور جو آپ میں روشن ہے وہ حق ہے، تو راستہ قطع کرنیکی لئے روشنی کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے روشنی بھیج دی۔ راہنما کی ضرورت تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں ہماری راہنما ہیں کہ نماز و جہاد ایسے کرو۔ گھریلو زندگی ایسے بسر کرو تو ایک ایک سنت ہمارے عمل کے لئے راہنمائی کرتی ہے تو جہاں راستہ کے لئے نور کی ضرورت تھی وہاں رہنما کی بھی ضرورت تھی۔

صراطِ مستقیم...... اور صراط مستقیم اللہ کی روشن کتاب ہے۔ جس نے ایک لائن بچھا دی ہے۔ جس پر آدمی دوڑتا ہوا اللہ تک پہنچ جائے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: "اَلْقُرْاٰنُ حَبْلُ اللهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ" ① یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو اس نے آسمان سے زمین تک لٹکا دی ہے۔ تمہارا کام کیا ہے؟ ﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا ﴾ ② اللہ کی رسی کو تم مضبوط پکڑ لو۔ جب یہ رسی کھینچی جائے گی تو اس کے ساتھ لپٹنے والے کھنچ کر اوپر پہنچ جائیں گے۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن پہلے آسمان سے لے کر ساتویں زمین تک یہ سارا علاقہ جہنم کا ہوگا۔ جس میں آگ بھی تپے گی اور سارے سانپ بچھو وغیرہ ہوں گے۔

اور آسمان اول کے اوپر جنتیں ہوں گی۔ ویسے جنت ساتویں آسمان کے اوپر ہے لیکن قیامت کے دن اسے آسمان اوّل پر لا کر رکھیں گے اور آسمان بیچ میں ہوگا، پانچ سو برس کی مسافت اس کا پل ہوگا جو کہ اعراف ہوگا۔ جس

---

① تفسیر الطبری، واعتصمو ابحبل اللہ ج: ۴ ص: ۳۱ حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلة الصحيحة ج: ۵ ص: ۲۳.

② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳.

میں کچھ آثار جنت کے ہوں گے اور کچھ آثار جہنم کے ہوں گے تو یہ سارا جہنم کا علاقہ ہے، جس میں ہم اور آپ پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ نے رسی لٹکائی کہ جسے جہنم سے نکل بھاگنا ہو۔ اس رسی کو پکڑ لے، میں اسے کھینچنے والا ہوں جو اسے پکڑ لے وہ بھی آ جائے گا۔ تو حقیقت یہ ہے کہ کفار نے جو اللہ کی رسی کو نہیں پکڑا تو انہیں جہنم میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں وہ ہیں ہی جہنم میں۔ تو اللہ کی رسی ٹوٹ نہیں سکتی البتہ چھوٹ سکتی ہے تو غور کرتے رہنا چاہئے بیدار رہنا چاہئے کہ کہیں یہ رسی چھوٹ نہ جائے۔ اللہ کے باطن سے نکل کر اس کا کلام (رسّی) آیا۔ جو اسے تھامے گا۔ باطن حق سے اس کا تعلق قائم ہوگا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: "تَبَرَّكْ بِالْقُرْانِ فَإِنَّهُ كَلَامُ اللهِ وَخَرَجَ مِنْهُ" "قرآن پاک سے برکت حاصل کرو۔ کیوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے"۔ حق تعالیٰ کا تبرک براہ راست دنیا میں جو موجود ہے وہ صرف اس امت کے ہاتھ میں موجود ہے کہ اس نے کلام کیا اور وہ کلام بعینہ ہمارے ہاتھ میں موجود ہے۔

ویسے تو زمین، آسمان، سورج وغیرہ سب کچھ اس کا تبرک ہے جن سے ہم فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر یہ سب کچھ مخلوق ہیں اور قرآن کو پیدا نہیں کیا یہ تو کلام ہے اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔ جو اس کی صفت ہے، تو صفت کو موصوف پیدا نہیں کیا کرتا۔ صفت موصوف سے صادر ہوتی ہے۔ میں یوں نہیں کہوں گا کہ میں اپنے کلام کو پیدا کر رہا ہوں۔ یوں کہوں گا کہ بول رہا ہوں، یعنی کلام مجھ سے صادر ہو رہا ہے۔ سرزد ہو رہا ہے کہ جو چیز میرے اندر بھری ہوئی ہے وہ باہر نکل رہی ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ میں کلام کو پیدا کر رہا ہوں۔ تو جو چیز اللہ سے صادر ہو رہی ہو۔ وہ اللہ سے منقطع نہیں ہو سکتی۔ اس کا سرا اوپر اللہ میاں سے لگا ہوا ہے نیچے کا سرا تمہارے ہاتھ میں ہے اگر تھامو گے تو اللہ کی ذات تک رسائی ہوگی۔ اسی واسطے کثرت تلاوت سے جو ترقی ہوتی ہے اس سے ذات باری تعالیٰ سے وابستگی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری عبادات سے آدمی صفات خداوندی تک پہنچتا ہے، بہرحال یہ مسئلہ بہت طویل ہے اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کریم اللہ کی ایک رسی ہے جسے اس جہنم سے نکل بھاگنا ہے، وہ اس رسی کو مضبوطی سے تھام لے۔ غرض کتاب اللہ صراطِ مستقیم ہے۔ جس پر چل کر آدمی اللہ تک پہنچتا ہے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مشعل نور، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں راہنما اور سیدھا راستہ کتابِ مبین اور چلنے والے ہم اور آپ ہیں۔ اگر چلنے کا جذبہ ہے، تو راستہ روشنی مینارے، میل اور فرلانگ کے نشانات موجود ہیں، اور منزل بھی سامنے ہے اور اگر چلنے کا ارادہ نہ ہو تو اس کے حق میں روشنی اور راستہ سب کچھ بیکار ہے۔ سنتیں اور واجبات بھی بے کار:

تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

قرآن و حدیث کی طرف سے کوئی کمی اور کوتاہی نہیں ہے کمی اور کوتاہی چلنے والوں کی طرف سے ہے۔ یہ چلنا نہیں چاہتے ورنہ ادھر سے فیضانِ خداوندی موجود ہے۔

حصولِ مقصد کی شرائط...... بہر حال میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ہر مقصد تک پہنچنے کے لئے چار باتوں کی ضرورت ہے، ایک روشنی ، راہ ایک راستہ، ایک راہنما ہو جو مبصر اور دانا ہو۔ راستے کے نشیب و فراز سے واقف ہو تو روشنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ اور صراطِ مستقیم کتاب اللہ ہے جس میں کہیں ٹیڑھ کا نشان نہیں ہے۔ ﴿ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْہِ﴾ ① یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی کھٹکا، زیغ اور ٹیڑھ پن نہیں ہے، سیدھا سیدھا راستہ ہے۔

یہ فرمایا: ﴿لَارَیْبَ فِیْہِ﴾ یہ نہیں فرمایا "لَارَیْبَ فِیْھِمْ" کہ لوگوں کے اندر ریب (اور شک) نہیں جتنی کھٹک ہے وہ ہمارے ہی سینوں میں ہے، کتاب میں کوئی کھٹک نہیں مگر یہ کھٹک بھی کتاب ہی کی طرف رجوع کرنے سے زائل ہوگی۔ خود بخود زائل نہیں ہوگی۔ آپ اس انتظار میں رہیں کہ پہلے کھٹک زائل ہو جائے پھر کتاب اللہ کو پکڑوں؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کے بدن پر ناپاکی لگی ہوئی ہو اور دریا ہو سامنے اور یہ کہے کہ پہلے پاک ہو جاؤں۔ دریا کہے گا۔ بے وقوف! میرے اندر آ کے دیکھ، پاک بھی میں ہی کروں گا، اس لئے اگر کسی کے دل میں زیغ اور کجی موجود ہے اور وہ اس کا علاج چاہتا ہے تو اس میل کو دھونے کے لئے کتاب وسنت ہی ذریعہ ہے۔

لٹریچر کی کثرت کا نقصان...... زیغ تربیت اور تزکیہ نفس سے ہٹے گا، اس کے لئے شخصیت کی ضرورت پڑے گی، شخصیتوں کی طرف رجوع کیے بغیر محض کاغذی لٹریچر اور کالے نقوش سے کام نہیں چلے گا۔ آج ہم لٹریچر کتنا ہی اکٹھا کرلیں ہزاروں کتابیں شائع کردیں لیکن جب تک نفس کی تربیت نہ ہو تو جو کتاب جس کے آگے جائے گی جب ذہن بنا ہوا نہیں تو الٹے ذہن سے الٹی بات سمجھے گا۔ سیدھے ذہن سے دیکھے گا۔ سیدھی بات سمجھ میں آئے گی اور ذہن عموماً نا تربیت یافتہ ہیں۔ اس لئے میں تو سمجھتا ہوں کہ لٹریچر کی کثرت عموماً مسلمانوں کو مضر پڑ رہی ہے۔ وہ فقط کاغذ کے بندے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اہل حق کی طرف رجوع نہیں کرتے، بس کتابچہ دیکھ لیں گے۔ تو کتابچوں سے دین تھوڑا ہی آتا ہے، دین تو صحبت اہل اللہ اور صحبتِ صلحاء سے آتا ہے۔

مرکزِ علم شخصیّت ہے اور کتاب علامت...... اسی واسطے جب کسی عالم کے علم کو جانچتے ہیں۔ اس سے یہ پوچھا کرتے ہیں؟ کہ تمہارا استاذ کون ہے؟ اور اس کا استاذ کون ہے؟ سلسلہ کیا ہے؟ یعنی سند پوچھی جاتی ہے۔ اگر دیکھتے ہیں کہ سند بڑے بڑے علماء کی ہے تو سمجھتے ہیں کہ مستند عالم ہے۔ یوں کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ نے کون سی کتاب پر پڑھا تھا۔ اگر تو مطبع مجتبائی کی چھپی ہوئی تھی۔ تب تو آپ بڑے عالم ہیں، اگر کسی اور مطبع کی تھی تو آپ گھٹیا درجہ کے عالم ہیں، کیوں کہ وہ کتابیں غلط چھاپتا تھا اس کا کاغذ اچھا نہیں ہوتا تھا تو عالم کا علم کاغذ اور کتاب سے نہیں پہچانا جاتا۔ روشنائی کی عمدگی سے نہیں پہچانا جاتا۔ اس سے پہچانا جائے گا کہ اس کا معلم کیسا تھا۔ اس میں دین تھا یا نہیں۔

ابن سیرین رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "اِنَّ ھٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ" یہ علم

① پارہ:۱، سورۃ البقرہ، الآیۃ:۱.

تمہارا دین ہے۔ تو جس سے دین سیکھو، پہلے اسے بھی دیکھ لو کہ اس میں بھی دین ہے یا نہیں، اس لئے کہ دین سینوں سے آتا ہے، سفینوں سے نہیں آتا۔

کتاب تو درحقیقت نقوش اور علامات ہیں۔ ان نقوش اور علامات کے حقائق سینوں کے اندر موجود ہیں۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا: ﴿ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾ ① یہ آیات بینات اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں۔

انہوں نے اس ریاضت و مجاہدہ اور امانت و دیانت سے سینوں میں لیا ہے۔ کتابوں کی سند نہیں ہوتی کہ اس سے پہلے کون سی کتاب چھپی تھی، اور اس سے پہلے کون سی۔ یہ دیکھیں گے کہ اسے کس نے پڑھایا اور اسے کس نے پڑھایا۔ تو محدثین سندوں میں شخصیتوں کو پیش کرتے ہیں۔ کتابوں کو پیش نہیں کرتے، اس لئے مرکزِ علم شخصیت ہوتی ہے، کتاب نہیں، کتاب علامت ہوتی ہے جس سے وہ علم موجود رہے اور غلطی کے وقت کتاب کی طرف رجوع کریں۔

آدابِ طریق...... اس لئے محض کتابوں اور پمفلٹوں سے اگر ہم دین حاصل کریں۔ کبھی دین حاصل نہیں ہوگا۔ دس رائیں پیدا ہوں گی۔ یہی وجہ ہے جو کتاب دیکھتا ہے اس کی اپنی ایک رائے ہوتی ہے۔ یہ جو ہو رہا ہے کہ ہر آدمی کہتا ہے کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے اب اسے کون سمجھائے کہ آیت کا مطلب سمجھنے کے لئے کچھ اصول موضوعہ بھی ہیں اور کچھ مقدمات بھی ہیں۔ وہ تو نے حاصل نہیں کئے۔ چاہتا یہ ہے کہ سارے مطالب میں سمجھ لوں۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے اقلیدس کی شکل حل کرنے کے لئے ایک دیہات کا گنوار یہ کہے کہ مجھے اقلیدس کی اڑتالیسویں شکل سمجھا دو۔ آپ اسے پوچھیں گے کہ اصول موضوعہ تجھے یاد ہیں؟ وہ کہے گا کہ وہ تو میں نے نہیں پڑھے۔ علوم متعلقہ تجھے یاد ہیں؟ کہ یہ بھی نہیں پڑھے۔ تو استاد کہے گا میں سمجھاؤں کس طرح؟ جب مبادی تیرے ذہن میں نہیں تو مقاصد کس طرح ذہن میں ڈالوں، غرض علم کے لئے بہت سے مبادی اور مقدمات کی ضرورت ہے اور وہ کتاب وسنت میں ہیں۔ وہ مقدمات ذہن میں ندارد، اور نتیجہ سمجھنے کے لئے آ جائے اور بحث کرنے کے لئے تیار، اب کس طرح سے ان کو سمجھایا جائے تو لٹریچر کی زیادتی سے یہ نقصان پہنچ رہا ہے کہ دس ہزار آدمی ہیں تو مسئلہ کے اندر دس ہزار رائیں ہیں، پھر ہر ایک اپنی رائے پر جمود کئے ہوئے ہے کہ اسے ہی مانو یہی امر حق ہے، یا پھر مجھے سمجھا دیں۔ اور جو چیز سمجھ میں نہ آئے۔ چاہے اسی کے نقصان فہم کی وجہ سے سمجھ میں نہ آئے وہ سمجھتا ہے کہ مسئلہ ہی غلط ہے۔ جو میں سمجھتا ہوں، وہ صحیح ہے۔ اس لئے علامات قیامت میں فرمایا گیا ہے کہ: " اِعْجَابُ كُلِّ ذِيْ رَأْيٍ بِرَأْيِهٖ" ② ہر شخص کو اپنی رائے پر اتنا اصرار اور جمود ہوگا کہ وہ اسے وحی خداوندی سمجھے گا کہ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اپنی رائے کے اوپر ایک گھمنڈ اور اتراہٹ ہوگی۔ لیکن جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں سامنے آئیں گی اور

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹.

② السنن للترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ المائدۃ ج: ۱۰ ص: ۳۲۱.

کتابِ مبین کی اغراض ومقاصد اور مرادات واضح ہوں گی۔ پھر خود بخود اپنا کھوٹ اپنے اوپر کھل جائے گا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں انسان سب سے پہلے اپنا کھوٹ دیکھتا ہے۔ اس کھوٹ کو زائل کر کے محبت اور اتباع کتاب سے اپنے اندر نورانیت پیدا کرتا ہے اور اطاعت کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں درکار ہیں، تو سننِ نبوی ہمارے عمل کے لئے راہنمائی کرتی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات روشنی پہنچاتی ہے، اور سیدھا راستہ کتابِ مبین ہے، اب ضرورت ہے چلنے کی تو چلنے والے ہم اور آپ ہیں۔ اگر ہم ہی نہ چلیں تو کتاب وسنّت کا کوئی قصور نہیں۔ گھر بیٹھے ہی ایک رائے قائم کر لیں تو کتاب وسنت پر وہ رائے عائد نہیں ہو سکتی اسی واسطے دین کے اندر مطیع و متادب بن کر چلنے کی ضرورت ہے۔

وسائلِ علم کا اَدب......دین کی بنیاد اَدب کے اوپر ہے۔

بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

جب ادب نہیں تو دین کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ دین کی بنیاد تا ادب پر ہے اللہ کا ادب۔ اللہ کے رسول کا ادب، کتاب اللہ کا ادب، بیت اللہ کا ادب، اہل علم کا ادب، اور وسائل علم کا ادب جب تک نہ ہو دین نہیں آ سکتا۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو واقعی آیت من آیات اللہ تھے اور اس زمانے میں قدیم محدثین کا ایک نمونہ اللہ نے علم درایت وتفقہ اور عمل کے لحاظ سے پیدا کر دیا تھا نے خود ایک دفعہ فرمایا: بات تو بڑی چھوٹی سی ہے مگر جب آدمی کرے تو اس پر استقامت بڑی مشکل ہے۔ فرمایا: ''پانچ برس کی عمر سے جب سے میں نے ہوش سنبھالا اور آج میری عمر ساٹھ برس کی ہے کسی دینی کتاب کو میں نے بے وضو ہاتھ نہیں لگایا''۔ یعنی قرآن کے بارے میں نہیں۔ حدیث کی کتاب ہو، فقہ کی ہو، اصول فقہ کی ہو، جس پر دینی فن کا اطلاق آ جائے فرمایا: اسے میں بے وضو ہاتھ نہیں لگاتا، اتنا ادب تھا تو حضرت شاہ صاحب بن گئے، بے ادب کا مقام تھوڑا ہی ہے کہ وہ شاہ صاحب بن جائے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ (1) ''اے ایمان والو! نبی کی مجلس میں نبی کی آواز سے اپنی آواز کو بلند مت کرو۔ کیوں کہ یہ بے ادبی ہے''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کی آواز سے اپنی آواز کو غالب بنانا چاہتے ہیں تو یہ گستاخی ہے ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں۔ معلوم ہوا کہ اعمال کی بقا ادب کے ساتھ ہے اگر بے ادبی ہوگی تو عمل حبط وضبط ہو جائیں گے اتنا کوئی اجر نہیں ملے گا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ خلقی طور پر جہری الصوت (بہت بلند آواز) تھے جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسجد نبوی میں آہستہ بولنے لگے تھے کہ لوگ ان کی باتوں کو کان لگا کر سنتے تھے، کہتے تھے کہ میری آواز بلند نہ ہو کہ میرے عمل اللہ کے ہاں حبط کر لئے جائیں۔ غرض یہ کہ ادب سکھلایا گیا۔ اسی طرح فرمایا

(1) پارہ: ۲۶، سورة الحجرات، الآية: ۲.

گیا: ﴿ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ﴾ ① رسول کو اس طرح مت پکارو۔ جس طرح آپس میں بے تکلف ایک دوسرے کو پکار دیتے ہو، بلکہ ادب وعظمت اور احترام کے ساتھ پکارو۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے یا محمد کہہ کر پکارا۔ تو تنبیہ فرمائی گئی: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! یَا نَبِیَّ اللّٰهِ! کہہ کر پکارو۔ نام لے کر مت پکارو۔

رعایتِ مقام..... خود حق تعالیٰ شانہ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو نام لے لے کر پکارا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے القاب سے پکارا۔

﴿ يَآدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ﴾ ② ﴿ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ ﴾ ③ ﴿ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ ﴾ ④ ﴿ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ﴾ ⑤ ﴿ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ ﴾ ⑥ ﴿ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَ بِكَلَامِىْ ﴾ ⑦

غرض ہر نبی کا نام لے پکارا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطاب فرمایا تو کہیں "یَا مُحَمَّدُ" نہیں فرمایا بلکہ کہیں ﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ﴾ ⑧ کہیں فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ ⑨ ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ﴾ ⑩

منصب کے لقب لئے جاتے ہیں۔ تاکہ حرمت واحترام واضح کر دیا جائے۔ اور نمونہ بتلا دیا جائے کہ نبی کا نام لے کر کوئی نہ پکارو۔ خطاب خداوندی سے پکارو۔ رسول و نبی آپ کا خطاب ہے۔

حبیب اللہ آپ کا خطاب ہے۔ تو جب حق تعالیٰ شانہ جن کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کئے ہوئے ہیں وہ احترام فرمائیں گویا اپنی بنائی ہوئی چیز ان کے نزدیک اتنی اعلیٰ ہے کہ خود بھی احترام فرما رہے ہیں تو ہماری اور آپ کی کیا مجال ہے کہ ہم بے حرمتی سے پیش آئیں۔ اگر بے حرمتی سے پیش آئیں گے تو عقائد و عمل اور دین بھی حبط۔

غرض اللہ کے رسول کا ادب بتلایا گیا۔ کتاب اللہ کا ادب بتلایا گیا ﴿ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ ⑪

"کتاب اللہ کو چھوئیں۔ صرف وہ لوگ جو طہارت حاصل کر چکے ہوں" وضو اور غسل جنابت کئے ہوئے ہوں۔ جو پاک ہوں وہ ہاتھ لگائیں، تو کتاب اللہ، رسول اللہ، بیت اللہ اور مساجد کا ادب بتلایا۔

لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ مساجد میں جمع ہو گئے ادھر ادھر کی بات چیت شروع کر دی تو اس کے بارے

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۶۳.
② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۳.
③ پارہ: ۱۲، سورۃ الھود، الآیۃ: ۴۸.
④ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۷.
⑤ پارہ: ۱۶، سورۃ مریم، الآیۃ: ۱۲.
⑥ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۵۵.
⑦ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۴۴.
⑧ پارہ: ۲۹، سورۃ المدثر، الآیۃ: ۱، ۲.
⑨ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۶۷.
⑩ پارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، الآیۃ: ۹.
⑪ پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۷۹.

میں فرماتے ہیں:﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَآ اُولٰٓئِكَ مَاكَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ﴾ ① اس سے زیادہ بدقسمت و بدبخت کون ہے جو مساجد میں ذکر اللہ کرنے والوں روکے اور مساجد کو ڈھائے۔ ایک مسجد کی صورت ہے جو اینٹ پتھر ہے۔ ان کے ڈھانے کا یہ مطلب ہے کہ عمارت گرادے اور ایک مسجد کی حقیقت ہے جو ذکر اللہ ہے اگر کوئی ذکر اللہ پر پابندی عائد کردے اور مخل بن جائے تو اس نے مسجد کی حقیقت کو ڈھادیا۔ دنیا کی باتوں سے ایسے مخل بن جائے کہ دوسرا نفلیں نہ پڑھ سکے زور زور سے دنیا بھر کی خرافات کر رہے ہیں۔ دوسرے کی تلاوت میں خلل پڑ رہا ہے۔ یہ حقیقت مسجد کو ڈھادینا اور گرادینا ہے ان لوگوں کے لئے یہ جائز نہیں تھا بلکہ ان لوگوں پر واجب تھا کہ مسجد میں خوف و دہشت زدہ اور ڈرتے ہوئے داخل ہوئے کہ یہ دربار خداوندی ہے نہ یہ کہ بے ادبی گستاخی لاپرواہی اور لاابالی پن سے داخل ہوتے۔

اسی طرح اولیاء اللہ کا ادب بتلایا گیا کہ اللہ کے جتنے اولیاء ہیں۔ انکی عظمت وحرمت کو ملحوظ رکھا جائے۔ حدیث میں فرمایا گیا: مَنْ صَلّٰى خَلْفَ عَالِمٍ تَقِيٍّ فَكَاَنَّمَاصَلّٰى خَلْفَ نَبِيٍّ ② جس نے کسی متقی عالم کے پیچھے نماز پڑھی اس نے گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی تو ربانیوں کی توقیر اور ادب بتلایا گیا۔ بہر حال علم کا ادب وسائل واشخاص علم کا ادب بتلایا گیا ادب کے بغیر دین حاصل نہیں ہوتا جس قوم کے اندر جسارت اور بے ادبی ہوگی۔ وہ دین سے محروم رہے گی۔

فسادِ کبیر...... صاحب ہدایہ نے ایک قطعہ لکھا ہے ۔

فَسَادٌ كَبِيْرٌ عَالِمٌ مُتَهَتِّكٌ	وَاَكْبَرُ مِنْهُ جَاهِلٌ مُتَنَسِّكٌ
هُمَا فِتْنَةٌ فِى الْعَالَمِيْنَ كَبِيْرَةٌ	لِمَنْ بِهِمَا فِىْ دِيْنِهٖ يَتَمَسَّكُ

وہ عالم فسادِ کبیر ہے جو بے ادب اور گستاخ ہو وہ دنیا کو بے ادبی کے راستہ پر ڈال دے گا تو عالم میں مفسدہ پھیلا رہا ہے اور اس سے بڑا مفسد جہالت کے ساتھ من گھڑت طریقوں پر عبادت کرے۔ اور جس راستہ پر چاہا بے سند چل پڑا۔ بے سند رسوم اختیار کیں۔ بدعات میں مبتلا ہوگیا۔ یہ جاہل بھی بے ادب عالم سے زیادہ فسادِ کبیر ہے جو جہالت سے عبادت کرے۔ مسئلہ اور فتویٰ نہ پوچھے۔ ایسا عالم اور جاہل یہ دونوں عالم کے اندر فتنے ہیں اور اس شخص کے لئے بھی فتنہ ہیں جو ان سے اپنے دین کا تمسک کرے اور انہیں اپنا راہنما بنائے۔ وہ بھی فتنہ میں گرفتار ہوجائے گا۔

عالم کا جوہر...... عالم کا جوہر یہ ہے کہ اس میں ادب ہو۔ ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ③ خوف خدا اور خشیۃ اللہ عالم ہی کے اندر ہوتا ہے جتنا جس میں علم ہے۔ اتنی ہی اس میں خشیت ہے۔ جتنا علم

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۱۴۔ ② علامہ زیلعیؒ نے اس روایت کو غریب قرار دیا ہے البتہ وہ فرماتے ہیں: معجم طبرانی میں اس کے مثل روایت موجود ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ان سرکم ان تقبل صلاتکم فلیؤمکم علمائکم فانهم وفدکم فیما بینکم وبین ربکم دیکھئے: نصب الرایۃ، باب الامامۃ، ج: ۲ ص: ۴۸۰۔ ③ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۸۔

سے کورا ہے۔ اتنا ہی اس میں بے خوفی ہے اور نڈر ہے تو بنیادی چیز ادب ہے۔ دین اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک ادب نہ کیا جائے۔ اس لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہم بارگاہ رسالت کے اندر ادب اختیار کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیں تو درود شریف پڑھیں۔ نام مبارک آئے تو کہیں: ''صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ''۔ ایک تو رسمی درود ہے کہ ہم نے ایک طریقہ باندھ لیا کہ بیٹھ کر پڑھو، درود شریف۔ یہ تو ایک رواجی چیز ہے اور ایک یہ ہے کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آئے تو درود پڑھے بغیر نہ رہے صلی اللہ علیہ وسلم ضرور کہے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اس سے زیادہ بخیل کوئی نہیں جس کے سامنے میرا نام لیا جائے اور وہ درود نہ پڑھے۔

اس لئے سب سے بڑی چیز ادب ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں درود شریف ادب کا مظہر ہے۔ اور اس سے بڑھ کر چیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واتباع ہے۔ اطاعت نام کو نہ کرے اور ادب کا مدعی بنے تو وہ ''عشق سعدی تا بزانو'' ہے عشق حقیقی نہیں۔ اس لئے کہ جب ادب اور عظمت ہوئی ہے تو اطاعت اس کے لئے لازم ہوتی ہے۔

بہرحال ان وسائل کا ادب اور تادّب لازمی ہے ورنہ اس کے بغیر عمل نہیں ہو سکے گا۔ یعنی راستہ پر آپ نہیں چل سکیں گے۔ یعنی راہ روکی جو قید تھی تو اس کے لئے یہ تین چیزیں ہیں کہ روشنی راہ، راہ اور ساتھ میں راہنما۔ تو راہ رو بھی ہونا چاہئے۔ تو اس میں شرط یہ ہے کہ متادب بن کر چلے اللہ کے راستہ میں سینہ ابھار کر نہ چلے۔ گردن جھکا کر چلے گا تو سربلند کیا جائے گا اور سینہ ابھار کر چلے گا تو پٹخ دیا جائے گا: ''مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ'' جو اللہ کے لئے تواضع اختیار کرے گا۔ اللہ اسے سربلند رکھیں گے۔

عبادت کا مفہوم...... اور اگر اکڑ کر چلے گا تو اس کے لئے دوسری چیز فرمائی گئی ہے: ''اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَآئِیْ وَالْعَظْمَۃُ اِزَارِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ فِیْھِمَا قَصَمْتُہٗ'' ① کبریائی اور تکبر میری چادر ہے۔ عظمت اور بزرگی میری لنگی ہے۔ جو اس میں کھینچا تانی کرے گا، اس کی گردن توڑ دوں گا۔ میں اس کو نیچا دکھا دوں گا۔ تواضع کرے گا تو اونچا ہوگا۔ اینٹھے گا تو نیچا ہوگا۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔ ؎

پستی سے سربلند ہوا اور سرکشی سے پست اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

ابھر کے چلتا ہے تو گرا دیتے ہیں۔ گر کر چلتا ہے تو اٹھا دیتے ہیں تو اس راہ کے اندر گردن جھکا کر چلنا پڑتا ہے۔ وہ اور راہ ہوگی جس میں آپ اکڑ کر چلیں۔ ہاں اگر وہ خود ہی ہمیں کہیں کہ اکڑ کر چلوں پھر ہم سو دفعہ اکڑ کر چلیں گے۔ انہوں نے حکم دیا: ﴿لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ ② خدا کی زمین پر اکڑ کر مت چلو۔ اور فرماتے ہیں: ﴿اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا﴾ ③ اے اکڑ کر چلنے والے! تو جو اینٹھ

① سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر: ۴/۵۹، رقم: ۴۰۹۰۔

② پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۳۷. ③ پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۳۸.

اینٹھ کر چل رہا ہے تو جو سینہ ابھار کر گردن اکڑا اکڑ کر چل رہا ہے تو تو زمین کو پھاڑ نہیں ڈالے گا۔ آسمان کو نہیں پہنچ سکے گا۔ اتنی ہی جگہ میں رہے گا جتنی میں ہے پھر کیوں اس مصیبت میں مبتلا ہے۔ اکڑ کر کہیں اوپر پہنچ جاتا تو ٹھیک تھا۔ اکبر (لسان العصر) نے خوب کہا ہے۔

تعجب نخوتِ اہلِ زمیں پر مجھ کو آتا ہے یہ کیوں اس پر اکڑتے ہیں کہ جس میں مر کر گڑنا ہے

جس چیز کے پیٹ میں سرنگوں ہو کر اور سر کے بل جانا ہے اس پر سر کو ابھارنا دانائی اور دانشمندی کے خلاف ہے اس لئے حکم دیا کہ اکڑ کر نہ چلو۔ لیکن اگر ہمیں حکم دیں کے اکڑ کر چلو جیسا کہ جس طواف کے بعد سعی ہوتی ہے تو اس کے ابتدائی تین پھیروں میں حکم ہوتا ہے کہ اکڑ کر چلو، ہم سو دفعہ اکڑ کر چلیں گے۔

گر طمع خواہد زمن سلطان دین خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

اگر بادشاہ یوں کہے کہ لالچی بنو تو ہم لالچی بن کر دکھائیں گے پھر ہمیں قناعت کی ضرورت نہیں اگر اللہ میاں یوں کہیں کہ تم لالچی بنو تو سو دفعہ لالچی بنیں گے پھر قناعت کے سر پر خاک ڈالیں گے۔ ﴿وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ ①

جنت کے بارے میں حریص بننا چاہئے کہ ایک دوسرے پر حریص بن کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ خوب لالچ کا مظاہرہ کریں۔ قناعت اگر کرنی ہے تو دنیا کے مال میں کرو۔ ہوسنا کی چھوڑ دو، لیکن آخرت کی نعمتوں کے بارے میں ہوسناک بنو۔ کسی حد پر نہ ٹھہرو۔

جنت کی نعمتوں میں علم اور معرفت بھی ہے اس لئے فرمایا کہ: مَنْهُوْمَانِ لَايَشْبَعَانِ: طَالِبُ الْعِلْمِ وَطَالِبُ الدُّنْيَا ② ''دو بھوکوں کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔ طالب علم اور طالب دنیا کا''۔ ''اَمَّا طَالِبُ الْعِلْمِ فَيَزْدَادُ رِضَى الرَّحْمٰنِ وَاَمَّا طَالِبُ الدُّنْيَا فَيَتَمَادٰى فِي الطُّغْيَانِ'' ''طالب علم جتنا پڑھے گا رضاء خداوندی بڑھتی رہے گی اور دنیا کی طلب میں جتنا بڑھے گا۔ سرکشی اور تمرّد بڑھتا رہے گا تو جہاں قناعت کرنی ہے وہاں قناعت کرے۔ جہاں لالچی بننا ہے وہاں لالچی بنے۔ اور دونوں حکم خداوندی کے تابع ہیں''۔

حاصل یہ نکلا کہ بندہ وہ ہے جو فرمان خداوندی کے تابع ہو۔ بندگی اور عبدیت کے یہی معنی ہیں کہ جس وقت جو حکم دیں اسے انجام دے۔ اگر وہ یوں حکم دیں کہ نماز پڑھو تو نماز پڑھنا عبادت بن جائے گا اور اگر یوں کہیں کہ ہرگز مت پڑھو۔ تو نماز کا چھوڑ دینا عبادت بن جائے گا پانچوں وقتوں میں حکم دیا کہ نماز پڑھو۔ تو نماز پڑھنا عبادت

① پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۲۶.

② سنن الدارمی، باب فی فضل العلم والعالم: ۱/۱۰۸ رقم ۳۳۲ . علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کا پہلا حصہ سنداً ضعیف ہے۔ البتہ دوسرا حصہ ''اما طالب العلم'' امام بیہقیؒ نے ''المدخل'' میں حضرت ابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت کیا ہے دیکھئے: الدررۃ المنتثرۃ فی الاحادیث المشتھرہ، حرف الواؤ، ج ۱۰ ص: ۲۰ کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۸۸.

اور تین وقتوں میں حکم دیا کہ ہر گز مت پڑھو۔طلوع ،غروب، اور استواءِ آفتاب کے وقت۔اس وقت نماز پڑھے گا تو گناہ گار ہوگا۔کوئی ثواب نہیں ملے گا۔اس سے معلوم ہوا کہ نہ نماز پڑھنا عبادت ہے نہ نماز چھوڑنا عبادت ہے۔کہنا ماننا عبادت ہے جو کہہ دیں وہ کرو۔

حکم دیا کہ روزے رکھو۔بہت اچھا۔بس یہ عبادت ہے۔عید کے دن حکم دیا کہ خبردار اگر روزہ رکھا تو گناہ گار ہوگا۔افطار واجب ہے اس سے معلوم ہوا کہ نہ روزہ رکھنا عبادت نہ اس کا چھوڑنا عبادت، کہنے کا ماننا عبادت ہے۔

خودکشی حرام کردی۔خون مت بہاؤ اسی طرح دوسرے کا بھی خون نہ بہاؤ۔فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ﴾ ① ”جس نے مسلمان کو عمداً قتل کیا۔اس کی جزاء جہنم ہے“۔

گویا قتل کرنا عظیم الشان معصیت ہے اور جہاں وہ فرمائیں کہ خوب قتل کرو۔وہاں وہ عبادت ہے۔چناں چہ جہاد میں جائے تو سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ آدمی خون بہادے تو معلوم ہوا کہ نہ خون کا بہانا معصیت نہ چھوڑنا معصیت کہنا نہ ماننا معصیت ہے اور ماننا اطاعت ہے۔ہر چیز میں یہی اصول کارفرما ہے۔

فطرت اور شریعت......اسلام معتدل مذہب ہے جسے اسپرنگ پالیسی کہتے ہیں وہ ہے اسلام میں، کہ دونوں پہلوؤں کی رعایت ہے کہیں ادھر کا حکم دیتے کہیں ادھر کا حکم دیتے ہیں۔علی الاطلاق کسی چیز کو معصیت نہیں قرار دیا۔ایسے ہی ”جھوٹ بولنا“ بلاشبہ معصیت ہے۔گناہ کبیرہ ہے بلاتوبہ کے معاف نہیں ہوتا لیکن انسان میں مبالغہ آمیزی کا ایک طبعی جذبہ ہے کہ جھوٹ بات بھی کہہ جاتا ہے۔زورِ کلام میں بعض دفعہ غلط چیزیں بھی کہہ جاتا ہے۔اس جذبے کو بھی شریعت نے پامال نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ محفوظ رکھو اگر کہیں نوبت آئے اور ہم اجازت دیں تو ضرور جھوٹ بول لینا۔

چناں چہ فرمایا ② اگر دو بھائیوں میں لڑائی ہو رہی ہو۔تلواریں کھنچ چکی ہوں۔ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو۔تم جھوٹ بول کر صلح کرا سکتے ہو تو کرادو۔تمہیں جھوٹ بولنے میں وہ اجر ملے گا جو نماز پڑھنے میں ملتا ہے۔آپ نے ایک بھائی سے جا کر یہ کہا۔”کہ بھائی تم کس سے لڑ رہے ہو وہ تو رات تمہاری بڑی تعریفیں کر رہے تھے اور رو رہے تھے کہ میرا بھائی مجھ سے جدا ہو گیا“۔

اس نے نے کہا اچھا! میرے بھائی کے دل میں اتنی گنجائش ہے میں تو سمجھ رہا تھا کہ بڑا دشمن ہے۔کہا آپ نے بالکل غلط سمجھا۔دوسرے سے بھی جا کر یہ کہہ دیا کہ تم کس سے دشمنی کر رہے ہو وہ تو رات بھر تمہارا ذکر کرتے رہے اور جدائی کا افسوس کرتے رہے۔

اس کی دشمنی بھی ڈھیلی ہوگئی۔اس کی بھی ہوگئی دونوں نے صبح مصافحہ کیا۔حالانکہ آپ نے جھوٹ بولا تھا۔اس جھوٹ پر آپ کو وہ اجر ملے گا جو آپ کو اطاعت وعبادت پر ملتا۔اگر سچ بول دیں اور اس سے فتنہ پھیلے تو وہ سچ

① پارہ:۵،سورۃ النساء،الآیۃ:۹۳. ② مسند احمد،حدیث ام کلثوم بنت عقبۃ ج:٦ ص:۴۰۳،رقم:۲۳۱۳.

حرام ہے۔ اسی لئے غیبت حرام ہے۔ غیبت سچ بولنے ہی کو کہتے ہیں۔ اس لئے کہ غیبت کی تعریف یہی ہے کہ کسی کی واقعی برائی کو اس کی پشت پیچھے بیان کرے۔ اگر جھوٹی بات کہی تو وہ افتراء ہے تو یہ سچ بولنا حرام ہے۔ کیوں کہ فتنے کا ذریعہ ہے اور وہ جھوٹ بولنا ضروری ہو جاتا ہے اس لئے کہ رفع فتنہ کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح دھوکہ دینا، مکرو فریب بہت بڑی چیز ہے۔ ''لَیْسَ مِنَّامَنْ غَشَّنَا'' ① ''وہ ہم میں سے ہے ہی نہیں جو دھوکہ بازی کرے''۔

لیکن فرماتے ہیں: ''اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ'' ② ''جہاد میں دھوکہ دینا بھی جائز ہے''۔ وہاں جاکے یہ عبادت بن گئی تو دھوکہ دہی کے جذبے کو شریعت نے پامال نہیں کیا۔ مگر اپنے کنٹرول میں رکھا ہے۔ جہاں ہم کہیں استعمال کرو۔ جہاں روکیں رک جاؤ۔ اس لئے کہ تم ہمارے بندے ہو۔ اپنے نفس کے بندے نہیں ہو کہ جو تمہارا نفس چاہے وہ کرو۔ نہیں جو ہم چاہیں وہ کرو نفس کو پیچھے پھینکو۔

تو جھوٹ مکروفریب یہ یقیناً معصیت ہیں اور انسان کے ضمیر کے اندر یہ معصیتیں رکھی گئی ہیں۔ جھوٹ بولنے کا انسان کے قلب میں ایک کونہ ہے اور مکروفریب کا بھی ایک کونہ ہے۔ غیض وغضب اور حسد کا بھی ایک کونہ انسان کے دل میں ہے تو شریعت اس لئے نہیں آئی کہ پیدائشی مادوں کو زائل کردے یا ختم کردے بلکہ اس لئے آئی ہے کہ مصرف بتادے اور ٹھکانے لگادے۔

غصہ کا جذبہ ہے۔ اس کو شریعت نے پامال نہیں کیا اگر غصہ نہ ہو تو آپ جہاد کیسے کریں گے؟ اگر جوش اور جذبہ نہ ہو تو باطل کے مقابلہ میں آپ کیسے آئیں گے؟ اگر سارے ہی ٹھنڈے ہو جائیں تو ملک کی حفاظت کون کرے گا۔ فوجی طاقت بھی تو ہونی چاہئے اور کبھی کبھی اس کا مظاہرہ بھی تو چاہئے تاکہ فتنوں کا استیصال ہو۔ اس لئے غصہ بھی اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے۔ اس کو پامال نہیں کیا۔ یہ کہا کہ جہاں ہم کہیں وہاں استعمال کرو۔ جہاں ہم نہ کہیں وہاں ٹھنڈے بن جاؤ۔ جہاں بے مصرف استعمال کروگے۔ گناہ گار بنوگے۔ جہاں مصرف صحیح میں استعمال کروگے، نیکوکار بن جاؤگے۔ غرض کوئی جذبہ جسے ہم برے سے برا سمجھیں اسے شریعت نے ختم نہیں کیا۔ ہاں ٹھکانے لگایا ہے۔ یہی معنی ہیں دین فطرت کے کہ کسی قوت کو زائل نہیں کیا بلکہ ہر قوت کے مصارف بتلا دیئے۔ تو اپنی قوت کا استعمال کرنا یہ فطرت ہے، مصارف کا بیان کرنا شریعت کا کام ہے۔ اس لئے فطرت کو پامال نہیں کیا۔

دینِ فطرت کی عجیب تعبیر...... اگر انسان ان قوتوں کو کھودے تو انسان ہی باقی نہیں رہے گا۔ پھر شریعت پر عمل کون کرے گا۔ ان چیزوں کے مجموعے ہی کا نام انسان ہے۔ ہاتھ اور پیر کے مجموعے کا نام انسان ہے۔ اگر ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دیں تو شرعی اعمال کون انجام دے گا؟ اگر پیر کو کاٹ کر پھینک دیں تو بیت اللہ اور مسجد میں کون جائے گا۔ ان اعضاء کو صحیح رکھ کر ہی دین پر صحیح عمل ہو سکتا ہے۔

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم، من غشنا فليس منا، ج ا ص: ۹۹، رقم: ۱۰۱۔ ② الصحيح للبخاري، كتاب الجهاد والسير، باب الحرب خدعة، ج: ۱۰ ص: ۲۲۹.

بعض مذاہب میں یہ ہے کہ قوتوں اور اعضاء کو زائل کردو یہ دین ہے کسی جوگی نے ہاتھ اٹھایا اور برس دن اٹھائے رکھا۔ حتی کہ وہ خشک ہوگیا۔ تو اس قوت کو زائل کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دین دار بن گئے۔ تو تعذیب جسمانی کا نام دین نہیں ہے۔ تہذیب روحانی کا نام دین ہے یہ جب ہوگی جب جسم کو استعمال میں لگاؤ۔ عمل کرو۔ تو ہاتھ کاٹ دینا یا مٹا دینا یہ دین نہیں ہے۔ ہاتھ کو شریعت کے مطابق صحیح مصرف میں استعمال کرنا یہ دین ہے۔ فرمایا گیا: "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ" ① "مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں"۔

تو یہ دین ہے کہ ہاتھ کو مار پٹائی کے لئے استعمال کرو۔ مگر مومن کے مقابلہ میں استعمال نہ کرو۔ سچے کے مقابلہ میں استعمال نہ کرو۔ جھوٹے کے مقابلے میں مجرم کے مقابلے میں استعمال کرو۔ تو اگر ہاتھ کی قوت زائل کردی تو مجرم کے اوپر ہاتھ اٹھانے والا کون ہوگا؟ دین دار بن کر سارے لنجے بن جائیں گے۔ غرض شریعت اسلام دین فطرت ہے اور دین فطرت کے معنی یہ ہیں کہ کسی بھی قوت کو پامال نہ کیا جائے۔ ہر قوت کا صحیح مصرف بتلایا جائے۔ تو غصہ، جھوٹ، دھوکہ اور جذبہ اطاعت اور تواضع کا بھی مصرف بتلایا۔ سب چیزوں کے مصارف کو متعین کرنا یہ شریعت کا کام ہے اور ان ساری قوتوں کے حقوق ادا کرنے کا نام اسلام ہے کسی ایک قوت کو آپ کھودیں اس کا حق ادا نہ کریں۔ اسی حد تک آپ کا اسلام ناقص ہوگیا۔ دین ناقص ہوگیا۔

ان ساری چیزوں کے مجموعے کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً کر کے دکھلا دیا۔ ہاتھ یوں اٹھاتے ہیں، چلتے یوں ہیں۔ غصہ یوں کرتے ہیں۔ مہربانی یوں کرتے ہیں۔ محبت کا یہ طریقہ، عداوت کا یہ طریقہ ہے۔ ان ساری سنتوں کو راہنما بنا کے اپنی اندرونی قوتوں کو استعمال کیجئے۔ نمونہ نبی کا سامنے ہو۔ جذبہ آپ کے اندر ہو تو آپ کا دین کامل و مکمل ہو جائے گا بہر حال راہ رو کے اندر رہروی کی طاقت ہونی چاہئے۔ اگر اس میں طاقت موجود ہے تو راستہ بھی موجود ہے۔ راستے کی علامتیں بھی موجود ہیں۔ روشنی بھی موجود ہے۔ راہنما بھی موجود ہے۔ فرق اتنا ہے کہ خلل جتنا ہے وہ راہ رو کے اندر ہے۔ ۔

راہ دکھلائیں کسے راہ رومنزل ہی نہیں

جود وعطا...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: روزانہ آسمان دنیا پر حق تعالیٰ کی تجلیات اترتی ہیں، اور ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ جیسا ہاتھ ان کی شان کے مناسب ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ:

اَنَا الْمَلِكُ مَنْ ذَاالَّذِیْ يَدْعُوْنِیْ   اَنَا الْغَافِرُ مَنْ ذَاالَّذِیْ يَسْتَغْفِرُنِیْ

اَنَا الرَّازِقُ مَنْ ذَاالَّذِیْ يَسْتَرْزِقُنِیْ

میں بادشاہ ہوں کوئی ہے مانگنے والا؟ میں مغفرت کرنے والا ہوں کوئی ہے بخشش طلب کرنے والا؟ میں

① الصحيح للبخاری، كتاب الايمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده: ١٣/١ رقم: ١٠.

رزق دینے والا ہوں کوئی ہے رزق طلب کرنے والا؟①

یعنی بندے کو تکلیف نہیں دی کہ تو اُڑ کر آسمان پر آ۔ اپنی تجلیات سے عرش سے آسمان دنیا پر نزول فرمایا۔ جو آپ کا آسمان ہے تو بجائے آپ کو تکلیف دیتے کہ اوپر چڑھو۔ خود بادشاہوں کا بادشاہ نیچے آتا ہے اور ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے۔

اور ہاتھ پھیلانا سائل کا کام ہے۔ مگر یہاں دینے والا ہاتھ پھیلا رہا ہے کہ مانگو کون مانگتا ہے، صبح صادق تک یوں ہی آوازیں لگتی رہتی ہیں جن کو اللہ نے توفیق دی ہے اٹھتے ہیں تہجد پڑھتے ہیں گڑگڑاتے ہیں۔ مانگتے ہیں۔ ان کو منہ مانگی مرادیں ملتی ہیں جو محروم القسمت ہیں وہ پڑے رہتے ہیں۔

رعایت وسہولت...... پھر آسانی کتنی کردی۔ تہجد کو ہی دیکھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بارہ رکعات بھی ثابت ہیں آٹھ بھی اور چار رکعات بھی ثابت ہیں حتیٰ کہ دو بھی ثابت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو بھی پڑھ لیں تو بھی آپ تہجد گزار ہیں، بلکہ ایک حدیث میں تو یہ بھی فرمایا گیا کہ اگر اخیر شب میں اٹھنا ذرا بھاری ہو تو عشاء کی سنتوں کے وتروں سے پہلے دو یا چار رکعات تہجد کی نیت سے پڑھ لیں وہ بھی تہجد ہی شمار ہوگا۔ یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اخیر شب میں تہجد پڑھی۔ بلکہ حدیث میں تو یہ بھی فرمایا گیا کہ قیامت کے دن ایک شخص حاضر ہوگا۔ حق تعالیٰ ملائکہ سے فرمائیں گے کہ اس کے نامہ اعمال میں لکھ دو کہ عمر بھر تہجد پڑھا۔ ملائکہ عرض کریں گے۔ یا اللہ اس نے تو ایک دن بھی نہیں پڑھا۔ کیسے لکھ دیں؟

حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب یہ سونے کے لئے لیٹتا تھا تو نیت کرتا تھا کہ آج ضرور اٹھوں گا۔ مگر آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ تو آنکھ نہ کھلنا یہ اس کے قبضے کی چیز نہیں تھی۔ وہ ہماری طرف سے تھا یہ تو نیت کر لیتا تھا اور "نِيَّةُ الْمَرْءِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ" آدمی کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے، جب عمر بھر روزانہ نیت کرتا تھا تو لکھ دو کہ روزانہ تہجد پڑھتا تھا۔ پوری عمر کا اجر وثواب (باوجود سوئے رہنے کے اس کو) مل جائے گا۔ تو میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی نہ پڑھے تو کم از کم سوتے ہوئے نیت ہی کر لیا کرے کہ اللہ میاں آج ضرور اٹھوں گا۔ یہ دوسری چیز ہے کہ اگر آنکھ کھل جائے تو تہجد پڑھ لو۔ اگر آنکھ نہ کھلے گی تو نیت کے لحاظ سے تہجد گزار بن جاؤ گے، تو اس سے زیادہ آسانی اور کیا چاہتے ہو۔ نیت کرنے میں ہلدی لگے نہ پھٹکڑی۔ نہ پیسہ نہ دھیلہ مفت کا ایک ثواب۔ اتنی بھی کوئی کوشش نہ کرے۔ تو اس محروم القسمتی کا کسی کے پاس کیا علاج ہے۔ بلکہ آدمی ہر خیر کی نیت کرے۔

انوار السنن...... اچھا خیر کی نیت بھی نہ کرو یہ جو روزانہ فرائض کے علاوہ اعمال انجام دیتے ہو۔ مثلاً بازار جا رہے ہو۔ سودا خرید رہو۔ کپڑا لا رہے ہو۔ دنیا بھر کے کام کرتے ہو اگر ان کاموں میں یہ نیت کرلو کہ حق تعالیٰ کے انعامات ہیں اور ہمیں حکم ہے کہ انعام کا استعمال کرو تو میں تعمیل حکم الٰہی کے واسطہ یہ چیزیں خرید رہا ہوں۔ تو وہی اجر ملنا شروع ہو جائے گا جو عبادت کے اوپر ملتا تو ذرا سی نیت کے پھیر سے آدمی چاہے تو عادت کو عبادت بنا لے اور ذرا

① مسند احمد، حدیث ابی هريرة رضی الله عنه، ج: ۲، ص: ۲۵۸، رقم: ۷۵۰۰۔

سی غفلت اور بے فکری سے عبادت کو چاہے تو عادت بنالے کہ بے اجر ہو کر رہ جائے۔

تو جب اللہ نے عادتوں پر بھی اجر رکھا ہے اور اس میں نیت کافی ہو جاتی ہے تو وہ آدمی بڑا محروم ہے کہ نیت ہی نہ کر پائے۔ جس پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ کوئی محنت نہیں بس ذرا سی فکر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب آدمی ایسا بھی کیا ہو کہ شتر بے مہار بن جائے کہ اسے نیت کرتے بھی تعجب ہو کہ میں خود بھی آزاد اور میری فکر بھی آزاد۔ تو پھر آزادی کے ساتھ جنگل میں چلے جانا چاہئے۔ شہر میں کیوں رہے۔ کسی بھی چیز کا پابند کیوں رہے؟

تو سنن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اتنی آسان ہیں کہ ان میں اگر آدمی ذرا فکر کرے تو محنت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ اور اجر و ثواب کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ لیکن ۔

اگر تو ہی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

خود اگر ارادہ نہ کرو تو اس کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔ لقمان حکیم کے پاس بھی اس کی دوا نہیں یہ ایسا لاعلاج مرض ہے۔ تو میرے بزرگو!

سب سے پہلے ادب اور عظمت پیدا کرو۔ دین کی اہل دین کی اور وسائل دین کی۔ اس کے بعد اپنی نیت صحیح کرو۔ نیت کی صحت کے ساتھ جذبہ رکھو کہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا اتباع کریں گے جو نور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں ہے وہ نور اور برکت تمہارے بنائے ہوئے نمونوں میں نہیں ہو سکتا۔ ہاں میں کہتا ہوں کہ مشائخ طریقت ہی بنائیں وہ ان کے حال کی بات ہوگی۔ لیکن نقالی جب کریں تو رسم پیغمبر کی کریں گے۔ اس لئے کہ رسم پیغمبر سے بہتر کوئی رسم نہیں ہو سکتی۔ جو طرز کلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اس میں جو نور ہے وہ کسی کے طرز کلام میں نہیں ہو سکتا۔ تو انوار و برکات اہل اللہ کے کلام میں بھی ہوتے ہیں۔ ان کے عمل میں بھی لیکن ع

از تو دہٗ کلاں بردار

جب اٹھانا ہی ہے تو بڑے ڈھیر میں سے اٹھاؤ۔ جس سے اونچے پہنچو تو اصل چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع ہے۔

آثارِ محبت...... تو محبت کا جذبہ رکھو اور محبت کے ساتھ اطاعت کا جذبہ رکھو۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''مَنْ أَحْيَاسنتي فَقَدْ أحبني وَمَنْ أحبني كَانَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ'' ① ''جس نے میرے ساتھ محبت کی وہ میری اطاعت ضرور کرے گا اور جو میری اطاعت کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ رہے گا''۔

معلوم ہوا کہ محبت کا ثمرہ لازمی اطاعت ہے اگر اطاعت اور اتباع سنت نہیں ہے تو دعویٰ محبت باطل ہے نیز عاشق دعویٰ نہیں کیا کرتا۔ عاشق تو عمل کرتا ہے جو کہتا پھرے کہ میں فلاں کا عاشق ہوں لوگ کہیں گے جھوٹا ہے مکار ہے عاشق کہیں دعویٰ کرتے پھرتے ہیں۔ عشق کی اولین منزل ترک دعویٰ ہے کہ دعویٰ نہ رہے فنائیت محضہ ہو جائے

① سنن الترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع ج: ۵ ص: ۴۶، رقم: ۲۶۷۸.

اور جو مدعی بنا ہوا ہے تو مدعی اپنی بقا کا قائل ہے اس میں فنائیت کہاں؟

غرض عاشق کے لئے دعوی کہاں؟ سب سے پہلی چیز عاشق کے لئے ترک دعوی ہے، اس لئے اگر کوئی عاشق رسول ہے تو اس کی علامت یہ ہے۔

کہ دعوی نہ ہو کہ میں عاشق رسول ہوں۔ بلکہ نادم ہو کہ جتنا عشق کرنا چاہئے تھا نہیں کر سکا۔ اور اس عشق کو اطاعت سے پہچانا جائے گا۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ: ''مَنْ اَحَبَّنِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ'' ''جو میرے ساتھ محبت کرے گا وہ میری اطاعت بھی کرے گا''۔

تو محبت کی علامت اور اس کے ظہور کا طریقہ یہ فی الحقیقت اطاعت ہے، جیسا کہ ایمان کی علامت عمل صالح ہے تو ایمان نام محبت ہی کا تو ہے۔

''لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ'' ① ''کوئی شخص تم میں سے اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کو میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ اتنی محبت نہ اپنے نفس سے ہو اپنے اہل وعیال اور ماں باپ سے ہو''۔

اور اس کا پتہ چلتا ہے جب مقابلہ پڑتا ہے کہ ایک طرف اللہ ہے اور ایک طرف اولاد ہے کس کو اختیار کروں؟ جو محبّ اور مومن ہوگا وہ یقیناً اللہ کو ترجیح دے گا۔ اولاد کو ترک کر دے گا۔

حدیث میں واقعہ آتا ہے کہ جب غزوۂ بدر ہوا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ایک صاحبزادے ایمان نہیں لائے تھے وہ کفار کی صف میں تھے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ادھر تھے۔ جب غزوہ بدر ختم ہو گیا اور وہ صاحبزادے ایمان لے آئے تو ایک دن انہوں نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ اے باپ! اس جنگ (بدر) میں کئی مرتبہ اس کی نوبت آئی کہ آپ ٹھیک میری زد کے اوپر آ گئے اور میں چاہتا تیر پھینکتا یا تلوار لگاتا تو یقیناً آپ کو ختم کر دیتا۔ مگر دل میں خیال آیا کہ میرا باپ ہے میں بیٹا ہو کر باپ پر حملہ کروں۔؟ یہ اس نے کہا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس غزوہ میں تو میری زد میں نہیں آیا۔ اگر آ جاتا تو خدا کی قسم سب سے پہلے تیرے گلے پر تلوار چلاتا۔ اس لئے کہ تو میرا بیٹا نہیں تھا۔ جب تو دشمن رسول اللہ بن گیا تو میں دشمنان رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ کر رہا تھا۔ آل اور اولاد کا وہاں کیا کام؟

تو محبت خداوندی کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ دوسری چیزوں سے پڑ جائے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایمان اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بیٹے کو ختم کر دینا چاہتے تھے تو محبت دو باتوں سے پہچانی جاتی ہے ایک یہ کہ دعوی ترک کر دے۔ دوسرے محبوب کا اتباع کرے۔ اتباع بھی نہ ہو اور مدعی بھی ہو۔ وہ جھوٹا دعوی ہے۔ حقیقی دعوی نہیں ہے۔ اس لئے دعوی بھی ترک کیجئے نیت بھی اپنی صحیح کیجئے۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبة رسول الله ﷺ اکثر من الاهل، ج: ۱، ص: ۶۳۔

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کیجئے۔

اسوۂ حسنہ......اگر جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور نمونہ جامع ہے جیسا کہ آپ خود دعوی کرتے ہیں کہ اللہ نے جامع رسول ہمارے پاس بھیجا۔ زندگی کا کوئی گوشہ خالی نہیں جس کا نمونہ عمل نہ دکھلایا ہو تو آپ کو ہر گوشہ زندگی میں دیکھنا چاہئے کہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فعل کس طرح انجام دیا۔ اگر غمی ہو جائے تو آپ دیکھیں کہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ غمی کس طرح انجام دی۔ آج تیجے دسویں اور چالیسیوں کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر شادی ہو تو میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح شادی کی۔ آیا اسی طرح سے برادریوں کے اندر نوید پھیری تھی۔ اسی طرح بڑھ چڑھ کر مفاخرت کی دعوتیں کی گئیں تھیں تو خوشی ہو یا غمی ہر چیز کے اندر مومن اور مسلم کی پہلی نگاہ اس پر جانی چاہئے کہ میرے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح کر کے دکھلایا تو کوئی وجہ نہیں کہ نماز میں تو آپ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں اور شادی بیاہ میں نہ کریں۔ موت اور غمی میں نہ کریں۔ یہ چیزیں آپ کے اختیار میں تھوڑا ہی دی گئیں۔ یہ چیزیں تو اہم چیزیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ معمولی معمولی چیزیں بھی آپ کے اختیار میں نہیں دی گئیں۔ لباس پہننا بھی آپ کے اختیار میں نہیں دیا گیا۔ آپ پابند ہیں کہ اسی نمونے کے مطابق پہنیں جو اللہ کے رسول کا نمونہ ہے۔

حدیث میں ہے کہ کرتہ پہنو تو دایاں ہاتھ پہلے دائیں آستین میں ڈالو بایاں ہاتھ بعد میں ڈالو۔ تو سنت طریقہ یہ تھا کہ دایاں ہاتھ پہلے ڈالو اور بایاں بعد میں ڈالو۔ آج موجودہ تہذیب کے مطابق بایاں پہلے ڈالتے ہیں اور محبِ رسول اور عاشق رسول ہیں، عاشق تو وہ ہوتا ہے جو لباس پہنے تو دیکھے کہ میں سنت کی مطابقت کر رہا ہوں۔ یا سنت کے خلاف کر رہا ہوں۔ محبوب کے طرز عمل پر چل رہا ہوں۔ یا اپنے نفس کو محبوب بنا رکھا ہے اس کے نمونے پر چل رہا ہوں۔ تو لباس میں بھی آپ آزاد نہیں ہیں۔ فرمایا گیا جب رات کو سوتے وقت لباس اتارو تو اسے زمین پر یا فرش پر ویسے نہ ڈالو وہ تین تہہ کر کے رکھو یا اوپر ٹانگو۔ فرماتے ہیں: "اِطْوُوْا ثِيَابَكُمْ تَرِدْ اِلَيْهَا اَرْوَاحُهَا"①

"کپڑوں کو لپیٹ کر رکھوں۔ کپڑوں میں ارواح ہوتی ہیں"۔ کپڑے کی ایک روح ہے۔ اگر وہ نکل گئی تو کپڑے کی برکت جاتی رہے گی۔ پہننے کا حظ اور لذت ختم ہو جائے گی تو معلوم ہوا کہ لباس اتار کر رکھنے میں بھی آزاد نہیں۔ ایک طریقہ ہمیں بتلا دیا گیا ہے۔

نیند کا مسنون طریقہ......اسی طرح ہم سونے میں بھی آزاد نہیں، سونے کے چار ہی طریقے ہیں یا آدمی الٹا لیٹ کر سوئے، یا چت لیٹ کر سوئے، یا دائیں کروٹ پر یا بائیں سوئے۔ الٹا لٹک کر یا کھڑے کھڑے نہیں سو سکتا۔ اس لئے یہی چار طریقے متعین ہیں۔

---

① المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم، من اسمه: محمد ج: ۱۲ ص: ۱۴۴۱ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی فی الاوسط وفیہ عمر بن موسی بن وجیہ وھو وضاع دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۵ ص: ۱۳۵۔

تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اوندھا لیٹ کر سونا مکروہ ہے۔ شریعت نے اسے پسند نہیں کیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں الٹے لیٹے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیر سے ٹھوکر ماردی اور فرمایا: ''یَاجُنْدُبُ! یَاجُنْدُبُ! اِنَّ هٰذِهٖ ضِجْعَةُ اَهْلِ النَّارِ'' ① ''یہ اوندھا لیٹنا جہنمیوں سے مشابہت ہے''۔

اہل جہنم اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈالے جائیں گے، مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ جہنمیوں سے مشابہت پیدا کرے۔ اس لئے اوندھا لیٹنا ناپسند کیا اور مکروہ قرار دیا۔

کوئی شخص چت لیٹے تو جائز تو ہے مگر پسندیدہ نہیں۔ اس واسطے کہ ضعیفوں کی سی ہیئت ہے۔ بیمار آدمی ہو تو چت پڑا رہتا ہے۔ ایسے ہی جو بے قابو گرتا ہے تو چت گرتا ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ فلاں پہلوان نے پچھاڑ دیا اور وہ چاروں شانوں چت گرا یوں نہیں کہتے کہ چاروں شانوں پٹ گرا۔ تو چت گرنا بے قابو ہونے کی علامت ہے ضعیفوں کی سی ہیئت بنانے کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔ چناں چہ فرمایا گیا:

اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ ② ''قوی مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے بہادر مسلمان بزدل مسلمان سے بہتر ہے''۔

بزدلی اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہوتی بہادری جمع ہوتی ہے تو ضعیفوں اور بے قابو لوگوں کی سی ہیئت بنانا پسندیدہ نہیں۔ اب رہا بائیں کروٹ پر لیٹنا یہ بھی جائز ہے مگر شریعت نے کچھ نامناسب سمجھا ہے اس واسطے کہ بائیں جانب قلب ہے، جب آپ بائیں رخ پر لیٹیں گے تو قلب کو سکون ملے گا اور جتنا زیادہ سکون ملے گا نیند گہری آئے گی اور جتنی گہری نیند آئے گی۔ آپ گھوڑے بیچ کر سوئیں گے۔ پھر نہ نماز کی فکر رہے گی، نہ تہجد کی۔ نہ قیام لیل کی تو اس سے عبادت کے نظام میں خلل پڑے گا۔ عبودیت کے اندر فرق پڑے گا تو نوم غریق (گہری نیند) کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔ چوکنا سونا شریعت نے پسند کیا ہے۔ اس واسطے یہ بھی ناپسند ہے۔

اب ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے، یعنی دائیں کروٹ پر لیٹنا۔ یہی سنت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور دائیں کروٹ پر جب آدمی لیٹے گا تو قلب بائیں جانب ہے وہ معلق رہے گا۔ جب معلق رہے گا تو گہری نیند کبھی نہیں آئے گی۔ چوکنا نیند آئے گی۔ اس وقت ارادہ کرکے سوئے گا جبھی آنکھ کھلے گی تو میں کہتا ہوں کہ ہم سونے میں بھی آزاد نہیں آپ سمجھتے تھے کہ یہ ایک عادت کی چیز ہے۔ طبعی چیز ہے طبعیات پر بھی شریعت نے آداب عائد کردیئے ہیں ہم تو سونے میں بھی پابند ہیں چہ جائیکہ شادی اور غمی میں آزاد ہو جائیں۔ چہ جائیکہ رسوم میں آزاد ہو جائیں تو لباس اور سونے کے اندر بھی قانون شریعت لاگو ہے۔

---

① سنن ابن ماجه، كتاب الادب، باب النهي عن الاضطجاع على الوجه: ۲/ ۱۲۲۷ رقم: ۳۷۲۴. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحيح وضعيف سنن ابن ماجة ج: ۸ ص: ۲۲۴، رقم ۳۷۲۴.

② الصحيح لمسلم، كتاب القدر، باب في الامر بالقوة وترك العجز... ج: ۱۳ ص: ۱۴۲.

رسوم وخیالات اور قانون شریعت...... حتی کہ ہمارے خیالات کے اوپر بھی یہ قانون لاگو ہے کہ خیالات میں بدبھی دل کے اندر نہ لاؤ۔ فکر بھی صحیح ہو عقیدہ بھی صحیح ہو قلب پاک چیز ہے پاک ظرف ہے اس کے اندر پاک چیزیں بھرو، ناپاک چیزیں مت بھرو، تو ہمارے قلب پر بھی قانون شریعت عائد ہے۔

سلاطین دنیا کا قانون بدنوں پر عائد ہوتا ہے اس لئے کہ بدن تک ہی ان کی رسائی ہے ہمارے قلب اور قلبی خیالات کو وہ نہیں جان سکتے لیکن جو ﴿عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ہو دلوں کی کھٹک سے واقف ہو اس کا قانون تو دل پر بھی عائد ہوگا۔ وہ دل کی حرکت کو بھی دیکھ رہا ہے تو دیانتاً ہم پر ضروری ہوا کہ تنہائی میں بیٹھ کر بدفکری بھی نہ کریں۔ خیالات فاسدہ بھی نہ لائیں۔ وساوس بھی سوچ سوچ کر نہ لائیں۔ غیر اختیاری طور سے آجائیں تو بلا سے آجائیں۔ تو جب قلوب کے خیالات، لباس، سونا اور جاگنا سب میں پابند ہیں۔ تو ہم دنیا اور معاشرہ کے اہم امور سے کیسے آزاد ہو جائیں گے۔ ان میں بھی ہم پابند رہیں گے۔ شادی ہوگی اس میں دیکھنا پڑے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی شادیاں کس طرح سے ہوئیں۔ غمی ہوگی تو ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے غمی کے وقت میں کیا کیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ تم بیان کر کے روؤ۔ بلکہ فرمایا: ''اِنَّ الْمَیِّتَ لَیُعَذَّبُ بِبُکَآءِ اَھْلِهٖ عَلَیْهِ'' ① ''تم بیان کر کر کے روتے ہو اس سے میت کو عذاب دیا جاتا ہے''۔

اور وہ عذاب یہ نہیں ہوتا کہ جہنم میں ڈال دیا جائے۔ بیان کرتے ہوئے جب یوں کہاں جاتا ہے کہ ''وَاجَبَلَاہ! وَاکَذَاہ'' ہائے تو تو پہاڑ جیسا تھا۔ ہائے تو تو سونے جیسا تھا۔ تو ملائکہ چوکے لگاتے ہیں کہ کیا واقعی آپ پہاڑ ہی تھے۔ آپ واقعی ایسے عظیم تھے۔ یہ جو طعن کا طرز ہوتا ہے۔ یہ برچھے ہے، زیادہ آدمی کو تکلیف پہنچاتا ہے تو یہاں ہم بیان کر کے مناقب بیان کرتے ہیں۔ وہاں عذاب دیا جا رہا ہے۔ شریعت کا منشاء یہ ہے کہ اگر بڑے سے بڑا غم پیش آجائے تو صبر کرو۔ تحمل سے کام لو۔ عمل کے نظام میں خلل نہ پڑے۔ رونا اور رونے کو لے کر بیٹھنا اور ماتم کرنا یہ بزدل عورتوں کا کام ہوتا ہے۔ مردوں کا کام نہیں ہے کہ رو رو کر گزاریں۔ بڑے سے بڑا صدمہ آئے تو مضبوط قلب ہو کر رہے۔ ماتم کے کیا معنی؟ تو رونے کا جب وقت آئے تو آپ اس وقت بھی شریعت کو دیکھیں گے کہ میرے نبی نے کیا کیا۔ آنکھوں سے رونا جائز ہے۔ بیان کر کر کے اور نوحہ کر کے رونا، یہ ناجائز ہے۔

ترکِ سنت کا وبال...... غرض شادی ہو، غمی ہو، چلنا ہو پھرنا ہو، اٹھنا ہو بیٹھنا ہو، سونا ہو جاگنا ہو، راہنما اس میں سنت بنے گی اگر سنت کو ترک کر دیا جائے اور حدیث کو قطع کر دیا جائے تو زندگی بنتی نہیں۔ قرآن تو دستور اساسی ہے۔ دستور اساسی سے معاشرہ تھوڑا ہی بنا کرتا ہے جب تک اس کا بیان کر کے اس کی جزئیات سامنے نہ آئیں اور بیان شدہ چیزوں میں سے استنباط کر کے سارے پہلو نہ کھول دیئے جائیں۔ تو عمل کی ہیئت نہیں بن سکتی اصول اور کلیات سے عمل تھوڑا ہی ہو سکتا ہے۔ عمل جزئیات سے ہوتا ہے جزئیات جب نکلتی ہے جب کلیات میں سے نکالی

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الجنائز، باب المیت یعذب ببکاء اهله علیه ج: ۴ ص: ۵۰۰.

جائیں اور کلی کا بیان کیا جائے تو بیانِ رسول کو اگر قطع کر دیا۔ تو کلیات ہی کلیات رہ جائیں گی عمل ممکن نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فقط قرآن پر اکتفا کرنے والے فی الحقیقت کام چوروں کی جماعت ہے۔ اس لئے کہ نہ انہیں عمل مقصود اور نہ عمل کی محنت اٹھا سکتے ہیں۔ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمیں لوگ پکا مومن سمجھیں۔ تو انہوں نے کہا کہ حدیث کا رشتہ (قرآن حکیم سے) قطع کردو۔ نہ ہوگا نہ عمل کی ضرورت پیش آئے گی۔ قرآن سے جتنا ہمارا جی چاہا کرلیا۔ جتنا جی نہ چاہا نہ کیا اس لئے میں نے عرض کیا کہ سنّت راہنما ہے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ایک روشن مینار ہے جس سے اللہ تک پہنچنے کا راستہ نظر آتا ہے، اور آپ کی سنتیں اس راستہ پر چلنے کی راہنمائی کرتی ہیں اور وہ راستہ کتاب اللہ ہے جو اللہ تک پہنچاتا ہے۔ اور چلنے والے آپ ہیں۔ اگر آپ میں طاقت ہے تو آپ چلیں گے اور طاقت نہیں ہے یا آپ پیدا بھی نہیں کرنا چاہتے تو چلنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اس کا الزام کتاب وسنت پر نہیں آئے گا۔ چلنے والوں کی کوتاہی پر آئے گا۔

نور اور کتاب...... یہی چند چیزیں ہیں جن کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے: ﴿قَدْ جَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ ○ يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ ① "حق تعالیٰ نے بشارت سنائی کہ تمہارے پاس نور آ گیا۔ اللہ کی جانب سے آیا ہے۔ معاذ اللہ کوئی بنا ہوا نہیں کسی نے افترا کر کے کہہ دیا ہو کہ میں نور ہوں۔ بلکہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا نور تمہارے پاس پہنچ گیا۔ مفسّرین لکھتے ہیں کہ نور سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی ہے جو روشنی راہ ہے اور آگے فرماتے ہیں کہ فقط روشنی نہیں آئی کتاب مبین بھی آئی ہے جو سیدھا راستہ ہے"۔ ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ ② "یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس پر چلو۔ یہ ایک ہی راستہ ہے۔ سبل متفرقہ پر مت چلو"۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مبتدع اور متبع سنت کی کچھ علامتیں ہیں، بدعت پسند کی علامت ہمیشہ مجادلہ اور بدکلامی ہے۔ اور متبع سنت کی علامت ہمیشہ سلامتی اور سادگی کے ساتھ مسئلہ بیان کرنا ہے۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جس قوم میں بدعت کا نزغہ پیدا ہوگیا۔ جدال ومجادلہ بدگوئی و بدکلامی اور جھگڑا اس کے اندر ضرور آجائے گا۔ اشتعال انگیزی اور فساد پھیلانا اس کا وطیرہ ہوگا اور جو سنت پر قائم ہوگا۔ وہ نبی کا طریقہ پیش کردے گا۔ نہ اس میں جذبات کی ضرروت ہے نہ برا کہنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال روشنی اور سیدھا راستہ نور اور کتاب مبین سے مراد ہیں۔ آگے فرماتے ہیں: ﴿يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ﴾ "اللہ اسے سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے۔ سلامتی کے راستے اس کے سامنے کھلتے ہیں۔ جو اس کی رضا کی پیروی کرے اور چاہتا ہو کہ اللہ راضی ہو جائے"۔

① پارہ:٦، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ١٥، ١٦۔ ② پارہ:٨، سورۃ: الانعام، الآیۃ: ١٥٣۔

اسلام قانون نہیں، دین ہے...... ایک تو یہ ہے کہ محض رسمی طور پر اسلام کو ایک لاء اور قانون کی طرح سمجھ کر اس پر چلیں تو یاد رکھئے اسلام لاء اور قانون نہیں ہے۔ دین ہے قانون اور دین میں فرق یہ ہے قانون روکھی دفعات کا نام ہے اور دین وہ ہے جس میں محبت اور عشق بھی شامل ہو تو اسلام قانون نہیں ہے بلکہ دین ہے تو دین کے اندر طریق ثواب بھی ہوگا، طریقِ عشق بھی ہوگا محبت بھی ہوگی اور قلب کے جذبات بھی ہوں گے، اس لئے فرمایا کہ: جو رضا کا طالب ہو۔ قانون پر اس لئے بھی چلتے ہیں کہ نہیں چلیں گے تو پٹائی ہوگی نہیں چلیں گے تو جیل پہنچ جائیں گے۔ کچھ جان کا خوف اور کچھ اپنے منافع پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ لیکن دین پر محض اس لئے چلتا ہے کہ میرا اللہ راضی ہو۔ محبوب کی رضا کے لئے اطاعت اور پیروی کرتا ہے اور جو رضا نہیں چاہتے تو فرمائیں گے کہ ہم اس سے راضی ہونا نہیں چاہتے۔ ہم تو ''غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ'' ہیں محتاج تو تم ہو جب تم راضی نہیں ہونا چاہتے تو ہم کیوں راضی ہوں؟

نورِ علم واخلاق...... مقصد اور نصب العین کیا ہے؟ ﴿یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ﴾ ''تاکہ اللہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر نور میں لے آئے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ نور سے مراد حسّی نور نہیں ہے۔ یہ تو پہلے سے بھی موجود تھا۔ سورج بھی روشن تھا۔ چاند بھی روشن تھا۔ اس میں لانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ معنوی نور ہے اور معنوی ہی ظلمت مراد ہوگی۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں۔ معنوی نور ہیں حسّی نور نہیں ہیں۔ اور معنوی نور جس سے اچھائی اور برائی میں تمیز ہو۔ وہ علم کامل اور عدل واخلاق ہیں جس سے آدمی کو سیاہ اور سفید میں تمیز ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس نور کا مجموعہ ہیں وہ نور علم اور نور اخلاق ہیں، جس پر نبوت کی بنیاد ہے۔

نبی علم وحی سے لے کر آتے ہیں اور اخلاق کاملہ اپنی فطرت اور اللہ کے دین سے پیش کرتے ہیں تو اخلاق کا نور اور علم کا نور، یہ دونوں چیزیں پیش کرتے ہیں علم کے نور میں حدت اور شدت ہوتی ہے اور اخلاق کے نور میں رقت اور رافت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ علم اللہ کا ہے علم میں ترفع کا خاصہ ہے۔ عالم کبھی گردن جھکا کر نہیں رکھتے علم ہمیشہ اسے اونچا لے جائے گا۔ رفعت کی طرف لے جائے گا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ بعض دفعہ تکبر پیدا ہو جاتا ہے بعض دفعہ نخوت پیدا ہو جاتی ہے بعض دفعہ غرور اور گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے تو علم کے گھمنڈ کے لئے بدرقہ عبدیّت ہے اور عبدیّت نہیں آتی جب تک کسی شخصیت کے آگے آدمی پامال نہ ہو۔

پیش مرد کاملے پامال شو

تو علم رفعت دکھلاتا تھا اور شخصیتوں کے آگے جھکنا تواضع سکھلاتا تھا ان دونوں کو جب ملایا تو وقار بھی جمع ہوگیا۔ تواضع بھی پیدا ہوگئی علم سے وقار آتا ہے۔ اور شخصیتوں کے آگے جھکنے سے قلب میں تواضع پیدا ہوتی ہے اگر علم نہ ہو اور شخصیتوں کے آگے جھکے تو ذلت نفس پیدا ہوگی جس سے شرک کا دروازہ کھلتا ہے اور اگر محض علم ہو اور شخصیتیں سامنے نہ ہوں تو کبر اور نخوت کا دروازہ کھل جائے گا۔ اس لئے جو اہل علم شخصیتوں سے وابستہ نہیں وہ عموما

متکبر ہوتے ہیں اور جو علم سے وابستہ نہیں۔ مگر شخصیتوں سے وابستہ ہیں۔ ان میں ذلت نفس پیدا ہوگی۔

علم بلا شخصیت...... اور دونوں کی مثالیں دو قوموں میں موجود ہیں یہود کی امت ایک علمی امت ہے تورات ان کو دی گئی۔ جس کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿ تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ ① ''ہر چیز کی تفاصیل بیان کی گئیں''۔ لیکن اہل تورات نے شخصیتوں سے اجتناب کیا، انبیاء علیہم السلام سے وابستگی کو کم کیا۔ ان کی توہین کی۔ ان کو قتل کیا:

﴿ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴾ ②

حضرات انبیاء علیہم السلام کی بے حرمتی کی اور کہا کہ وہ بھی آدمی ہیں ہم بھی آدمی، کتاب اللہ (تورات) ہمارے لئے کافی ہے۔ جب تورات موجود ہے، ہم اس کو سمجھیں گے اور چلیں گے۔ نبی کی ضرورت کیا ہے۔ تو شخصیتوں کا دامن چھوڑ دیا تو محض کتاب کا علم ان کے لئے نخوت و ترفع اور استکبار کا ذریعہ بن گیا۔ یہ متکبر قوم ہے جو نخوت شعار ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۭ ﴾ ③ ''ہم اپنی آیتیں پھیر دیں گے۔ اس قوم سے جو زمین کے اندر متکبر بنی ہوئی ہے۔ جس کا کام نخوت شعاری، کبر اور ترفع ہے کہ اس ترفع اور تکبر نے ان کے قلب کا ستیاناس کر دیا۔ قلب کے رخ کو غلط کر دیا ہے اور اس درجہ کجی اور زیغ پیدا کر دیا ہے کہ جب ہماری کوئی آیت سامنے آتی ہے تو ایمان نہیں لاتے جب سیدھی راہ سامنے آتی ہے تو کبھی اس راستہ پر نہیں چلتے اور جب کبھی کوئی غـــیّ طغیانی یا کجی کا راستہ آتا ہے تو فوراً چل پڑتے ہیں سنت پیش کرو نہیں چلتے۔ بدعت پیش کرو فوراً چل پڑتے ہیں''۔ بہر حال یہود کو متکبر کہا گیا اس لئے کہ فقط کتاب کو اختیار کیا اور شخصیتوں کو ترک کر دیا۔

شخصیت بلا علم...... نصاریٰ کی امت یہ عملی امت ہے اس کو علم زیادہ نہیں دیا گیا۔ انجیل میں احکام زیادہ نہیں ہیں۔ یہ فی الحقیقت تصوف کی کتاب ہے۔ اس میں تزکیۂ نفوس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے انہوں نے شخصیتوں کو اتنا پکڑا کہ کتاب کو چھوڑ کر شخصیتوں کو خدا کا قائم مقام بنا دیا۔

مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کہا، بعضوں نے اللہ کہا: ﴿ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ﴾ ④

انہوں نے اپنے علماء اور صوفیاء کو رب بنا دیا خدا بنا دیا تو اس درجہ شخصیتوں کا دامن پکڑا پھر جھکتے جھکتے ذلت نفس پیدا ہوگئی۔ اور شرک میں گرفتار ہوگئے تو ان سے علم چھوٹ گیا اور شرک آ گیا۔ یہود میں شرک نہیں تھا تو تکبر

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۴۵۔ ② پارہ: ۱ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۸۷۔

③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۴۶۔ ④ پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۳۱۔

پیدا ہو گیا تو فقط کتاب ہوگی تو تکبر پیدا ہوگا۔ فقط شخصیت کی پیروی ہوگی تو ذلت نفس پیدا ہوگی اور کتاب و شخصیت کو ملا دو تو وقار کے ساتھ تواضع للہ پیدا ہو جائے گی نہ کبر رہے گا نہ ذلت نفس باقی رہے گی۔ تو امّت مسلمہ نے یہ دونوں چیزیں سنبھال لیں ایک طرف اہل اللہ کا دامن پکڑتی ہے اور ایک طرف کتاب وسنّت کا دامن پکڑتی ہے۔ دونوں چیزوں کو ملا کر چلتی ہے تو وقار بھی ہے خودداری بھی ہے اور تواضع للہ بھی ہے۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " لَـتَـتَّـبِـعُـنَّ سُـنَـنَ مَـنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ بَاعًا بِبَاعٍ ذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ دَخَلَ اَحَدًا" الخ ① "اے مسلمانو! تم لوگ پچھلی امتوں کی خوب پیروی کروگے۔ بالشت بالشت بھر، ہاتھ ہاتھ بھر، دو دو ہاتھ بھر یعنی حقیر سے حقیر چیزوں میں اور بڑی سے بڑی چیزوں میں۔ حتیٰ کہ اگر پچھلی امتوں میں سے کوئی گوہ کے سوارخ میں گھسا ہوگا جو فعل لغو اور عبث ہے تم میں بھی ایسے پیدا ہوں گے جو یہ فعل لغو اور عبث کریں گے"۔ عرض کیا یارسول اللہ! وہ پچھلی امت کون سی ہے؟ فرمایا: وہی یہود ونصاریٰ۔

غرض فرمایا گیا کہ: تم یہود و نصاری کی پیروی کروگے۔ عبادات میں، اعتقادات میں، معاشرت میں، معشیت میں، گھریلو زندگی میں، اجتماعی زندگی میں ہو بہو پیروی کروے گے۔ حتی کہ صورتوں شکلوں اور معنویّت میں بھی ان کے پیرو بنے ہوئے ہونگے۔ تو یہود ونصاری کے دو نزنے بیان کئے۔ ایک متکبر امت ہے، جس نے کتاب کو لے کر شخصیتوں کو چھوڑ دیا۔

ایک عیسائیوں کی ضال اور گمراہ امّت ہے۔ جنہوں نے شخصیتوں کو لے کر کتاب کو چھوڑ دیا تو امت میں بھی دونوں نمونے موجود ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو کتاب اللہ کو ہاتھ میں لے کر چلتا ہے۔ سلف وآئمہ اور علماء سب کو ترک کرتے ہیں۔ "نَـحْـنُ رِجَـالٌ وَهُـمْ رِجَـالٌ" "ہم بھی آدمی وہ بھی آدمی"۔ ضرورت کیا ہے کسی کے سامنے جھکنے کی کتاب موجود ہے تو بلاشبہ اتنا دعوی تو صحیح کیا مگر فقط کتاب کا اثر یہ ہے کہ استکبار اور عجو دنیز رفعت و ترفع کی شان ان میں پیدا ہوگئی۔

ایک طبقہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ ہم نہیں جانتے کتاب اللہ کیا ہے، ہم نہیں جانتے کہ بخاری اور مسلم کیا ہے۔ یہ جو اہل اللہ اور اہل کمال شخصیتیں ہیں یہی ہمارے لئے کتاب ہیں۔ یہی ہمارے لئے طریقہ ہیں۔ جو یہ کہیں گے ہم وہ کریں گے۔

شریعت وطریقت کا مابہ الامتیاز...... ظاہر بات ہے کہ نبی کے بعد اہل اللہ میں سے معصوم کوئی نہیں۔ اور معصوم نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ گناہ کرتے ہیں۔ یعنی دینی اعمال میں بہت سی چیزیں غلبہ حال میں ایسی سرزد ہوتی ہیں کہ حقیقتاً صحیح ہوتی ہیں۔ مگر ظواہر شریعت کے خلاف ہوتی ہیں۔ مغلوب الحال جو ہوئے۔ اگر فقط شخصیتوں

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لتتبعن سنن من قبلکم، ج: ٦، ص: ٢٦٦٩، رقم: ٦٨٨٩.

کی پیروی رہ جائے اور کتاب وسنت کے اصول سامنے نہ ہوں تو ان کے احوال سے جو ان کی حرکتیں سرزد ہوئی ہیں ان میں بھی پیروی کریں گے تو گمراہ ہوں گے۔

منصور نے اگر وجد میں آ کر ''اَنَا الْحَقُّ'' کہہ دیا اور منصور کی ہر چیز شریعت بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا اَنَا الْحَقُّ کہے کہ میں بھی خدا ہوں۔ حالانکہ وہ غلبہ حال میں ایک کلمہ سرزد ہوا تھا۔ نہ یہ کہ وہ اصول ہے۔ تو شریعت قانون کلی کا نام ہے اور طریقت شخصی احوال کا نام ہے۔ قانون کلی تو ہر کس وناکس کے لئے پیغام ہوتا ہے اور شخصی احوال دوسرے کے لیے حجت نہیں ہوتے ہر ایک کی شخصی حالت الگ الگ ہے۔ اگر منصور نے ''اَنَا الْحَقُّ'' کہا تو میرے لئے فرض نہیں ہے کہ میں بھی ''اَنَا الْحَقُّ'' کہوں۔ ہاں اگر وہ حال میرے اندر پیدا ہو جائے پھر غیر اختیاری طور پر میں کہہ دوں تو پھر کسی کو روکنے کا کوئی حق نہیں ہے مگر حال نہ ہو اور ان کی وجدی حرکات کی نقالی کروں تو یہ محض رسوم کی پیروی ہے۔ بہر حال ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوا ہے کہ اس نے کہا کہ اصل کتاب ناطق تو یہ اہل اللہ ہیں ہم نہیں جانتے کہ کتاب میں کیا لکھا ہے اصل یہ ہیں۔ ان کے سامنے جھکے تو شرک اور بدعت میں مبتلا ہو گئے۔ اور دوسرا طبقہ کتاب پر اس درجہ جھکا کہ شخصیتوں کو چھوڑ کر کبر اور نخوت میں مبتلا ہوا۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: ''مَنْ فَسَدَ مِنْ عُلَمَاءِ نَا فَفِيهِ شِبْهٌ مِّنَ الْيَهُوْدِ وَمَنْ فَسَدَ مِنْ عُبَّادِنَا فَفِيهِ شِبْهٌ مِّنَ النَّصَارٰى'''' ہمارے علماء میں سے جو بگڑتا ہے وہ یہود کے نقش قدم پر ہوتا ہے اور عبّاد اور زہّاد میں سے جو بگڑتا ہے وہ نصاریٰ کے نقش قدم پر ہوتا ہے''۔ محقق کون ہے؟ جو نہ تکبر میں مبتلا ہو نہ ذلّت نفس میں بلکہ وقار کے ساتھ تواضع للہ انجام دیتا رہے۔ اور یہ جب ہوگا کہ کتاب اور شخصیت دونوں کو ملا کر ان کا دامن پکڑ کر آدمی چلے تو حقانی علم وعمل اس وقت تک نصیب نہیں ہوسکتا جب تک دونوں کو جمع نہ کیا جائے اور تادّب مع اللہ نصیب نہیں ہوسکتا جب تک دونوں کو جمع نہ کیا جائے۔

مدرسہ وخانقاہ...... واقعہ یہ ہے کہ اگر غور کیا جائے تو علم مدارس میں سکھلایا جاتا ہے اور تربیتِ اخلاق خانقاہ میں ہوتی ہے۔ مدرسی ہونے کے ساتھ جب تک آدمی خانقاہی نہ بنے تکمیل نہیں ہوتی، محض خانقاہ میں جائے گا تو آدمی وجدی بن جائے گا۔ اسے خانقاہ میں خوب وجد آئے گا اور کورا مدرس بنے گا تو نجدی بن جائے گا۔ تو اس راہ میں نہ وجدی ہونا کافی نہ نجدی ہونا کافی۔ نجد اور وجد دونوں کو آدمی جمع کرے۔ تبھی کامل بنے گا۔ ایک طرف آدمی علم لے جس کے لئے مدرسہ جانا پڑے گا اور ایک طرف تربیت بھی لے اس کے لئے خانقاہ جانا پڑے گا۔ بہر حال دونوں چیزوں کو جمع کرنا یہ محقق ہونے کی علامت ہے۔

یہ جو مولویوں اور صوفیوں کی لڑائی ہے میں کہا کرتا ہوں کہ ایک طرف کورے مولوی جن میں عشق کی کمی ہے اور ایک طرف کورے عاشق جن میں علم کی کمی ہے محقق اور کامل کبھی نہیں لڑا کرتا۔ اس کے ظرف کے اندر وسعت ہوگی تو کامل بننے کی کوشش کیجئے۔

برکفے جامِ شریعت برکفے سندانِ عشق　　　ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

"ایک ہاتھ میں جامِ شریعت ہونا چاہئے اور ایک ہاتھ میں جامِ عشق ہونا چاہئے"۔ آگ بھی ہو اور پانی بھی ہو، جلال بھی ہو اور جمال بھی ۔ جب جا کے آدمی میں کمال پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ کمال کی کوئی صورت نہیں ۔ اور اعتدال بھی تبھی ہوگا جب جلال و جمال جمع ہو جائیں گے۔

روح کا علاج...... تو فرمایا گیا: ﴿يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ﴾ "اللہ تعالیٰ اس آدمی کی رہنمائی فرمادیتے ہیں۔ جو ہماری رضا کی پیروی کرے"۔

اور رضا کا مقام ہے۔ رضا اسی کو حاصل ہوگی جو قلب کو متوجہ کرے گا۔ باطن سے گویا ابتداء ہوئی۔ اہل باطن سے آدمی اپنا علاج کرائے گا۔ جبھی تو رضا پیدا ہوگی۔

جیسے بدن پر بیماری آتی رہتی ہے۔ دل اور نفس پر بھی آتی ہے۔ بدن کی بیماریوں کے لئے طبیب کے پاس جاتے ہیں۔ جو کہتا ہے وہی کرتے ہیں۔ روح کی بیماری ہوگی تو روحانی طبیب کے پاس جانا پڑے گا۔ جو وہ کہے گا کرنا پڑے گا۔ وہ بھی دواء غذا اور پرہیز بتلائے گا۔ یہ بھی دواء غذا اور پرہیز بتلائے گا۔ یہ کہے گا معصیت سے پرہیز کرو۔ روزانہ کے اعمال شریعت غذا ہیں۔ ان میں کوتاہی نہ کرنا اور دوا ذکر اللہ ہے۔ اس کی اتنی تسبیح پڑھنا۔ اتنا اللہ کا نام لینا۔ تو دوا، غذا اور پرہیز سب ہی کچھ ہے۔

بہر حال جیسے بدن پر بیماریاں آتی ہیں۔ ایسے ہی نفس پر بھی بیماریاں آتی ہیں۔ جیسے بدن کے معالج ہیں، ایسے ہی نفس و قلب کے بھی معالج اللہ نے پیدا کئے ہیں۔ تو جو ان سے معالجہ کرائے گا۔ اس کے قلب میں مقامِ رضا پیدا ہوگا۔ اسی طرح عشق و محبت اور تفویض کا مقام پیدا ہوگا۔ اگر یہ نہیں ہے تو کچھ پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے باطن کی بھی ضرورت ہے۔ ظاہر کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے متعلق اشارہ فرمایا کہ مشعل راہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جس سے حق و باطل میں امتیاز ہو جاتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں راہنما ہیں اور کتاب اللہ صراط مستقیم ہے۔ مگر چلے گا وہ جس کا دل درست ہوگا۔ اور رضاء خداوندی کا اثر ہو۔

سیرتِ نبوی کے عناصر اربعہ...... اور مقصد کیا ہے؟ ﴿يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ مقصد نور میں لانا ہے۔ جیسی ظلمت تھی اس کا مد مقابل ویسا ہی نور ہوگا۔ جہالت مظالم اور معصیت کی ظلمت تھی۔ اس کے مقابل جو نور آئے گا، وہ علم، طاعت، کمال اور اخلاق ربانی کا ہوگا۔ جس کا مرکز بنا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے یہ عناصر اربعہ ہیں، تعلیم کتاب، تلاوت الفاظ، تعلیم حکمت اور تزکیہ نفس اور اس کے ساتھ یہ بھی صحیح کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشعل نور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں راہنما۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا راستہ قرآن اور اس پر چلنے والے مسلمان۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم اس راستہ پر چلیں۔ ان عناصر سے اپنے عنصر کو بنائیں۔ اپنے بدن اور روح کا علاج کریں۔ اپنے نفس کی تکمیل کریں۔ حق تعالیٰ شانہ

ہمیں توفیق دے کہ ہم مرضیات حق پر چلیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کریں اور من گھڑت راستوں کو ترک کریں۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم علم صحیح استعمال کریں، تا کہ کتاب وسنت کا مقام ہمارے قلوب کے اندر آجائے۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَالَاتُزِغْ قُلُوْبَنَابَعْدَاِذْهَدَيْتَنَاوَهَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ، اَللّٰهُمَّ اِنَّانَعُوْذُبِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَاظَهَرَمِنْهَاوَمَابَطَنَ رَبَّنَالَاتَجْعَلْنَافِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ تَوَفَّنَامُسْلِمِيْنَ غَيْرَخَزَايَا وَّلَامَفْتُوْنِيْنَ وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِخَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآاَرْحَمَ الرّٰاحِمِيْنَ

(۲۳ صفر ۱۴۰۵ھ)

اسلام عالمی مذہب ہے

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴿ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ ①
صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

حکیمانہ تشکر...... بزرگانِ محترم! میرے تعارف کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا۔ یہ اپنی عالی ظرفی اور بلند خیالی کا اظہار کیا گیا ہے۔ میرے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس میں ان حضرات نے اپنے ظرف کی بلندی ظاہر فرمائی۔ میری بلندی اس میں ظاہر نہیں ہوتی۔ اس لئے میرے ذمہ شکریہ ادا کرنا نہیں ہے۔ اس لئے کہ آپ تعریف اپنی کریں کہ ہم اتنے عالی حوصلہ یا وسیع الظرف ہیں اور شکریہ میں ادا کروں؟ آپ اپنی تعریف کریں تو مجھ پر شکریہ کب فرض ہے؟ میری آپ تعریف کرتے تو میں شکریہ ادا کرتا۔

اور تعریف کی بھی تو ایسی کہ اس کا واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی نے کہا کہ یہ چاند اور سورج ہیں تو میں کب چاند اور سورج ہوں میں انسانی مخلوق ہوں یہ کون سی میری تعریف، ہوئی جو واقعہ کے خلاف ہے۔ کسی نے کہا کہ بہت بڑا آدمی ہوں تو میں کب بڑا ہوں؟ غرض میری تعریف کرتے تو میں شکریہ ادا کرتا آپ نے میری تعریف نہیں کی۔ اس لئے میرے ذمہ نہیں ہے کہ میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کروں؟

دارالعلوم کا ایک طالب علم ...... جہاں تک تعارف کا تعلق ہے تو میں اپنا تعارف خود کرائے دیتا ہوں! میرا تعارف نہ چاند سورج سے ہوگا۔ نہ علم اور فضل سے ہوگا۔ اس لئے کہ علم اور فضل میں یہ حضرات مجھ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ آپ کے سامنے مولانا محمد حسن صاحب کھڑے ہوئے تھے وہ ہمارے دارالعلوم (دیوبند) کے استاذ

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۴۔

ہیں۔میں بھی ان کی تعظیم کرتا ہوں میں ان کے سامنے ایک طالب علم ہوں۔

مولانا انظر شاہ صاحب ہیں۔عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔مگر علم میں کہیں بڑھے ہوئے ہیں میں دل سے ان کی عظمت کرتا ہوں۔تو میرا تعارف یہ ہے کہ میں دارالعلوم دیوبند کا ایک طالب علم ہوں۔وہاں کے اساتذہ اور بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرنا میرا کام ہے اس کے سوا اور کوئی کام نہیں۔غرض اس سے زیادہ سمجھا بھی نہ جائے۔

اور یہ کوئی تواضع نہیں ہے۔اس لئے کہ یہ حضرات تو دن رات تعلیم میں لگے ہوئے ہیں۔ان کا علم تازہ ہے مجھے پڑھے ہوئے ساٹھ برس ہوگئے۔ان کا علم تازہ ہے اور میرا باسی۔اور باسی ہوکر بھی چوراسی ہوگیا۔گویا قریب الختم ہے۔اس واسطے میرا تعارف اس سے زیادہ نہیں کہ دارالعلوم کا ایک طالب علم ہوں۔اور ان حضرات کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔انہوں نے جو کچھ کہا اپنی عالی ظرفی سے کہا۔میرا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

ادائیگی فرض...... باقی شکریہ ادا کردینا میرا فرض تھا۔کہ جب آپ نے صدر بنادیا۔تو اصل میں تو صدر بنانے والے آپ ہیں۔جو گھٹیا آدمی کو بنا سکتے ہیں تو وہ خود صدر ہیں (بلکہ صدر ساز ہیں) جن کو بنانے پر قدرت ہے وہ خود صدر ہوں گے۔بہرحال جب آپ نے صدر بنادیا اور اس کرسی پر بٹھادیا۔تو لامحالہ اس کرسی کا وقار اور اس کی لاج رکھنا میرا فرض ہے۔اس سلسلہ میں چند باتیں مجھے گزارش کرنی ہیں۔لیکن مناسب یہ ہے کہ جو آیت میں نے تلاوت کی ہے جس کے بارے میں چند باتیں گزارش کرنی ہیں۔اس سے پہلے ایک مختصر سی تمہید عرض کردوں جس کے ذریعے آیت کا مفہوم سمجھنا بھی آسان ہوجائے گا اور آیت کا جو منشاء اور مقصد ہے وہ بھی انشاء اللہ واضح ہوجائے گا۔ابتداء میں تھوڑی سی تمہیدی باتیں ہیں۔

تمہید...... پہلی بات تو یہ ہے کہ اس وقت دنیا بین الاقوامی ہوگئی ہے۔یعنی ساری دنیا سمٹ کر ایک قبیلہ بن گئی ہے پہلے اگر دوسری ولایتوں کا مہینوں میں سفر ہوتا تھا اب وہ دنوں میں ہونے لگا ہے، جو سفر دنوں میں ہوتے تھے اب وہ گھنٹوں میں طے ہونے لگے ہیں جو گھنٹوں میں ہوتے تھے وہ منٹوں میں طے ہونے لگے تو ساری دنیا سمٹ کر ایک قبیلہ بن گئی ہے۔پہلے بچپن میں ہم لوگ اگر دس بارہ میل کا سفر کرتے تھے تو بڑی تیاریاں ہوتی تھیں۔کہ سفر درپیش ہے۔آج وہ سفر سفر نہیں رہا شہروں میں دس بارہ میل کا سفر تو روزانہ ہوتا ہے۔تو وسائل ایسے مہیا ہوگئے کہ جن کی وجہ سے مہینوں کا سفر گھنٹوں میں بدل گیا ہے۔ہوائی جہاز پہ آپ یورپ جائیں گے تو بارہ گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے پہلے دیوبند سے دہلی تک اڑتالیس گھنٹے لگتے تھے۔اور اب لندن بارہ گھنٹوں میں پہنچ جاتے ہیں۔تو ہزاروں میل کا سفر ایسا ہوگیا ہے جیسے چند فرلانگ کا سفر ہوتا ہے سواریاں ایسی ایجاد ہوگئیں کہ انہوں نے ساری دنیا کو لپیٹ کر رکھ دیا۔

نظریاتی یکسانیت...... اسی طرح سے علم وفضل کے وسائل اتنے بڑھ گئے ہیں کہ آج جو آپ یہاں علم رکھتے ہیں، وہی علم لندن والے بھی رکھتے ہیں۔وہی معلومات امریکہ وجرمنی میں ہیں۔کوئی خصوصیت کہیں کی باقی نہیں رہی۔حتی کہ تمدن کی خصوصیات مٹتی چلی جارہی ہیں یورپ وامریکہ اور ہندوستان کا تمدن یکساں سا ہوگیا ہے۔جو چیزیں آپ

لندن میں دیکھیں گے، وہی بمبئی اور کلکتہ میں دیکھیں گے، جو امریکہ میں ہیں وہی امریکن اسٹائل یہاں بھی نظر پڑیں گی۔ تو تمدن بھی یکساں، نظریات بھی یکساں گویا پوری دنیا بین الاقوامی بن گئی۔ مسائل ایک ملک کے ہیں اور دنیا کے سارے ملک مل کر طے کر رہے ہیں، تو کسی ملک کی سیاست اپنی اندرونی نہیں رہی بلکہ بیرونی سیاست کے تابع ہوگئے ہیں ہر ملک کا یہی معاملہ ہے کشمیر کا معاملہ آپ کے ملک کا ہے اور اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ درپیش ہے، آپ کے ملک کا مسئلہ ہے اور یورپ و امریکہ والے بیٹھ کر طے کر رہے ہیں۔ تو چھوٹے چھوٹے مسائل اقوام متحدہ میں پیش ہوتے ہیں۔ اور وہ فیصلہ کرتے ہیں۔ تو کسی ملک کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہی، اس لئے نظریات بھی یکساں ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جو نظریہ تمدن کے بارے میں یورپ کا ہے وہی آج آپ کا، امریکہ اور روس کا بھی ہے۔ تو مدنیت اور معاشرے کا ایک ہی ذریعہ ہو گیا ہے۔ کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ وہاں سے نظریات برآمد ہوتے ہیں۔ آپ کے ملک میں آتے ہیں۔ آپ قبول کرتے ہیں۔ تو ساری دنیا سمٹ کر ایک کنبہ بن گئی ہے۔ جس سے ہر ملک کی خصوصیات ختم ہوگئیں۔ نظریات ایک ہوگئے۔ ذہنوں کا رخ ایک بن گیا۔ پلیٹ فارم ایک بن گیا۔ اور دنیا یہ چاہتی ہے کہ سب کے اندر یکسانیت پیدا ہو جائے۔ یہ ایک نظریہ ہے جو اب چل رہا ہے۔

مذہبی یکسانیت...... تو میں عرض کرتا ہوں کہ یہ نظریات جب یکسانیت کے ساتھ قائم ہوگئے حتی کہ تمدن و معاشرہ بھی ایک ہو، تو قدرتی طور پر یہ مسئلہ سامنے آئے گا کہ پھر مذہب بھی ایک ہی ہو۔ دین بھی سب کا ایک ہی ہو۔ کوئی وجہ نہیں کہ معاشرت تو یکساں ہو اور مذہب الگ الگ ہو۔ تمدن ایک ہو جائے اور دین ایک نہ ہو، یہ فطرت اور طبیعت کے خلاف ہے۔ نظریات میں یکسانیت پیدا ہوگئی۔ مذہب کی یکسانیت کا مسئلہ باقی رہ گیا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ آتا جا رہا ہے۔ اور مذہبیت جاندار ہو رہی ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لَا يَبْقَى عَلَى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَبِذُلِّ ذَلِيْلٍ" ① "روئے زمین پر کوئی کچا اور پکا مکان باقی نہیں رہے گا۔ کپڑے کا گھرانہ ہو، جیسے خیمہ یا پتھروں کا گھرانہ ہو جیسے پہاڑوں پر مکانات ہوتے ہیں۔ یا اینٹ پتھر کا گھرانہ جسے آپ تعمیر کرتے ہیں۔ کوئی گھرانہ باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے گا" بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَ بِذُلِّ ذَلِيْلٍ کوئی رغبت سے قبول کرے یا مجبور ہو کر۔ مجبوری کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ مسلمان کسی کے گلے پر چھری رکھیں گے کہ یا قبول کرو، نہیں تو ذبح کر دیں گے۔ اس کی تو اسلام نے مخالفت کی ہے۔ صاف فرمایا گیا: ﴿لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ ②

دین کے اندر کوئی جبر نہیں ہے نیکی اور بدی، خیر اور شر خود کھل کر سامنے آگئی ہے جس کا جی چاہے اسلام قبول کرے۔ جس کا جی چاہے نہ کرے، کوئی جبری چیز نہیں ہے۔ حتی کہ یہاں تک فرمایا: ﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى

---

① مسند احمد، حديث المقداد بن الاسود، ج: ٦، ص ٤، رقم: ٢٣٨٦٥. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، باب وصبره على ذلك ج: ٢ ص: ٢٤٩. ② پارہ: ٣، سورة البقرة، الآية: ٢٥٦.

یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ﴾ ”اے پیغمبر! کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ لوگ مسلمان بنیں“۔ یہ آپ کا حق نہیں ہے۔ یہ اللہ کا حق ہے جس کے جی میں چاہے ایمان ڈال دیں آپ کا کام صرف تبلیغ اور دین کا پہنچا دینا ہے ماننا نہ ماننا ہر شخص کے اختیار میں ہے جس کو دوسری جگہ قرآن کریم نے فرمایا: ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا﴾ ① ”جس کا جی چاہے ایمان قبول کرے جس کا جی چاہے نہ قبول کرے ہم نے عذاب آخرت تیار کر رکھا ہے جس کا جی چاہے بچ جائے جس کا جی چاہے اپنے کو اس کے اندر جھونک دے“۔

تو دین میں کوئی جبر نہیں۔ اس لئے فرمایا: ”بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَبِذُلِّ ذَلِيْلٍ“ اسلام کا کلمہ ہر شخص تک پہنچ جائے گا خواہ وہ رغبت سے مانے یا مجبور ہو کر۔ تو مجبوری کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ مسلمان تلوار سے مجبور کریں گے۔ مجبور کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر شخص کو دھکے کھا کر مجبور ہو کر انہی اصول کے اندر پناہ ملے گی۔ جو اسلام نے لا کر رکھے ہیں۔ لوگ مجبور ہو کر قبول کریں گے۔ اس کے سوا چارہ کار باقی نہیں رہے گا تو یہ حاصل ہوا کہ گھر گھر اسلام کا کلمہ داخل ہو کر رہے گا۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ آج اس کی تمہید بڑھتی چلی جا رہی ہے تمدن ایک بن گیا۔ نظریات ایک بن گئے معاشرت ایک ہوتی جا رہی ہے۔ خود یہ سوال آئے گا کہ پھر مذہب کیوں نہ ایک ہو؟ دین کیوں نہ ایک ہو؟ ساری قومیں مل کر ایک پلیٹ فارم پر کیوں نہ جمع ہوں؟ اتحاد تو جبھی پیدا ہوگا۔ تو یہ نظریہ سامنے آنے والا ہے۔ بلکہ زبانوں پر آنے بھی لگا ہے۔ اب کھل کر آنے والا ہے چند دن کے بعد۔

عالمی دین...... تو مقصد یہ ہے کہ جب دنیا بین الاقوامی ہے تو لامحالہ ایسے دین کی طرف توجہ منعطف ہوگی جو خود بین الاقوامی ہو۔ اگر دین ایک ملک کا ہو کہ دوسرے ملک کا اس کے ساتھ تعلق نہ ہو وہ بین الاقوامی نہیں ہے، وہ تو ملک والوں کے لئے ہے۔ یا ایک خاندان کا ہو دوسرے خاندان کا نہ ہو تو دوسرا خاندان متوجہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو سارے ملکوں کا ہو سارے عالم کا ہو اس کی طرف خواہ مخواہ عالم کی توجہ ہوگی۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ كَافَّةً“ ② ”پہلے پیغمبر اپنی اپنی اقوام اور خاص خاص قوموں کی طرف۔ ان کو ہدایت کرتے تھے نصیحت کرتے تھے۔ تو اب یہ خاص کون ہیں؟“

تو بعض انبیاء علیہم السلام تو ایک خاندان کی طرف آئے ہیں جیسے بنی اسرائیل اس خاندان میں ہزاروں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے لیکن ہر نبی کا کام یہ تھا کہ اسرائیلی خاندان کی اصلاح کرے، انہیں دوسرے خاندانوں سے تعلق نہیں تھا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عیسیٰ علیہ السلام رسول ہیں مگر بنی اسرائیل کے۔

خود حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو اسرائیلی بھیڑوں کو جمع کرنے آیا ہوں کہ یہ منتشر نہ رہیں دوسری اقوام میں جو بھیڑیں ہیں ان سے مجھے تعلق نہیں۔ تو بعض انبیاء مخصوص خاندانوں کی طرف آئے۔ اسی خاندان کی

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ الکهف، الآیة: ۲۹. ② الصحیح للبخاری، کتاب الصلاة، باب قول النبی صلی الله علیه وسلم جعلت لی الارض مسجداً وطهوراً، ج: ۱، ص: ۱۶۸، رقم: ۴۲۷.

اصلاح ان کے ذمے تھی۔

بعض مخصوص ملکوں کی طرف آئے یا مخصوص قوموں کی طرف کہ جیسے حضرت یونس علیہ السلام کہ چار قوموں کی طرف مبعوث ہوئے انہی کے اصلاح کے لئے آئے تھے۔ اور قوموں سے انہیں کوئی تعلق نہیں تھا، اسی طرح سے اور انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی اقوام، خاندان اور قبیلوں کی طرف بھیجے گئے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔ ﴿ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ '' ہر قوم کے لئے ہم نے ہادی بھیجا اور ڈرانے والا بھیجا''۔ ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ ''کوئی امت ہم نے نہیں چھوڑی جس میں ڈرانے والے نہ بھیجے ہوں''۔ اور فرمایا گیا۔ ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ ''ہم کسی قوم کو عذاب نہیں دیتے جب تک رسولوں کو بھیج کر تمام حجت نہ کر دیں''۔

دین پیش کر دیں اور وہ نہ مانیں، حجت تام ہو تب ہم عذاب دیں گے، ورنہ ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں۔

تو قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی قوم اور ملک باقی نہیں ہے جس کے اندر انبیاء علیہم السلام نہ آئے ہوں۔ اب یہ حجت تام اتنی عام ہے تو کروڑوں کا ملک ہو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کے اندر اللہ کی طرف سے ڈرانے والے نہ آئے ہوں۔

آغازِ اسلام...... اور میں کہتا ہوں کہ سب سے پہلے پیغمبر تو ہندوستان ہی میں مبعوث ہوئے حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں ہی آئے تو ہندوستان میں ان کا نزول اور اترنا ثابت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ہندوستان سے عربستان کا سفر کیا ہے۔ اور ایک سو بیس حج کئے ہیں چالیس حج پیدل کئے ہیں اور بقیہ حج بیل پر سوار ہو کر کئے ہیں۔ تو سب سے پہلا دار النبوت اور دار الخلافت اللہ کا ہندوستان ہے جس سے مذہب کا آغاز ہوا۔ مذہب کی تکمیل عربستان میں ہوئی مگر آغاز ہندوستان سے ہوا۔ تکمیل کے لئے تو فرمایا: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ ① ''حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آج کے دن میں نے دین کو مکمل کر دیا۔ اور اپنی نعمتوں کو تم پر پورا کر دیا ہے۔ اور میں آج اسلام کے سوا تم سے کسی اور دین پر راضی نہیں ہوں''۔

اسلام لے کر تو حضرت آدم علیہ السلام آئے ہیں۔ آغاز ان سے ہوا۔ تکمیل عربستان میں ہوئی۔ بیچ میں انبیاء علیہم السلام آتے رہے۔ ہر ملک اور قوم کی طرف آتے رہے اور تبلیغ اسلام کرتے رہے مگر اللہ کا دین ایک رہا شریعتوں میں چوں کہ تغیر و تبدیل ہوتا رہا پچھلی شریعتوں میں ایک چیز حلال تھی تو اگلی شریعتوں میں اسے حرام کر دیا۔ یا پہلی شریعت میں حرام تھی۔ اگلی شریعت میں اسے حلال کر دیا۔ شرائع کے اندر تو تغیر و تبدل رہا۔ مگر دین ایک رہا۔

تکمیل شریعت...... دین کے معنی اصول کے ہیں۔ اللہ کی توحید، نبی کی عظمت، آخرت کا یقین جنت و دوزخ کا ہونا۔ ملائکہ کا وجود، پل صراط کا ہونا۔ عرش کرسی اور لوح و قلم کا ہونا یہ غیبی چیزیں ہیں جو سب انبیاء کے زمانے میں ایک رہی ہیں۔ البتہ حلال و حرام کے احکام جس کو ہم عملی پروگرام کہیں گے اس عملی پروگرام میں کچھ تغیر و تبدیل ہوتا رہا، اخیر

① پارہ ٦: سورة المائدة، الآية: ٣.

میں آ کر وہ بھی تکمل ہوگیا۔ شریعت بھی اتنی تکمل ہوگئی کہ اب اس میں کمی اور زیادتی کی گنجائش نہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے بچہ پیدا ہوا تو اس کے لئے کرتہ بنائیں تو بالشت بھر کا ہوگا۔ اور وہ بھی بلکہ بڑا ہوگا۔ بچہ اس میں چھپ جائے گا۔ لیکن اب جوں جوں بڑھتا جائے گا تو پیائش بڑھتی جائے گی۔ تو بچہ تو پیدائش سے لے کر ایک ہی ہے۔ مگر لباس اسکے بدلتے رہے۔ اسی طرح سے دین ایک ہے مگر عملی پروگرام کے لباس بدلتے رہے ہیں۔

وحدتِ دین...... انبیاء علیہم السلام آتے رہے تو تغیر و تبدل ہوتے رہے ہیں مگر دین سب کا ایک تھا۔ ''کَانَ دِیْنُ الْاَنْبِیَآءِ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ'' سارے پیغمبروں کا دین توحید تھا کہ ایک کو ہی مانو۔ ایک ہی کو سب کا کرتا دھرتا سمجھو، ایک ہی کو نفع ونقصان کا مالک سمجھو، ایک ہی کو ہادی سمجھو، ایک ہی کو زندہ کرنے اور موت دینے والا سمجھو، نہ کسی کے بس میں موت ہے نہ حیات نہ کسی کے بس میں ہدایت وراہنمائی ہے، یہ صرف اللہ کا کام ہے، نجات دینا اس کا کام ہے، تو توحید سارے انبیاء کا دین رہا۔ اور جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ ① ''کوئی رسول دنیا میں ہم نے نہیں بھیجا جس نے یوں نہ کہا ہو کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور اسی کی عبادت کرو''۔

نہ انبیاء علیہم السلام کی عبادت کرو نہ اولیاء اللہ کی عبادت کرو، نہ علماء ومشائخ کی، عبادت کے لئے سزاوار صرف ایک ہی ذات ہے، اور وہ ذات اللہ کی ہے، اس لئے کہ زندہ کرنے اور مارنے والا صرف اللہ ہے اگر زندہ کرنے میں معاذ اللہ اس کا کوئی شریک ہوتا کہ کچھ ہماری اور آپ کی قوت اور کچھ اللہ تعالیٰ کی قوت، مل ملا کر زندہ کر دیا۔ اسی طرح موت دینے میں اللہ کے کچھ اور بھی شریک ہوتے تنہا اللہ کی قوت کافی نہ تھی، کچھ اور لوگوں کو ملا کر فلاں کو موت دی جائے۔ تو اگر موت وحیات میں شرکت ہوتی تو عبادت میں بھی شرکت ہوتی، تو اللہ کی بھی عبادت کرتے اور جو ان کے شریک ہوتے، ان کی بھی عبادت کرتے۔

مگر زندگی، موت، صحت ومرض، رزق دینے والے وہ تنہا ہیں اور کل معاملات ان کے ہاتھ میں ہیں پھر عبادت بھی تنہا انہی کی ہوگی، یہ کیسے ممکن ہے کہ کام تو وہ کریں اور جھکیں دوسرے کے آگے، دوسروں کے آگے پیشانی رگڑیں، جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت کی باگ ڈور ہے، اسی کی عبادت کی جائے گی تو آیت شریفہ میں یہ بتلایا گیا کہ ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا جس نے یہ تعلیم نہ دی ہو کہ دیکھو! اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی عبادت کرو، اسی سے ڈرو۔ اگر اس سے ڈرو گے تو سب سے ڈرنا چھوڑ دو گے۔ اگر اس سے نہیں ڈرو گے تو سب سے ڈرنا پڑے گا، اگر اس کی عبادت کرو گے تو ہر ایک کی عبادت ترک کر دو گے۔ اگر اس کی عبادت نہیں کروں گے تو در در پر جھکنا پڑے گا۔

ترکِ توحید کی پھٹکار...... آج کوئی آپ کے آگے جھک رہا ہے کوئی پتھر کے آگے جھک رہا ہے، کوئی آگ کے

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۵.

آگے کوئی پانی کے آگے، تو میں کہتا ہوں کہ یہ شرک نہیں ہے یہ پھٹکار ہے کہ جب ایک کی عبادت نہیں کی تو ایک ایک چیز کے سامنے ناک رگڑ رگڑ کر یہاں بھی ذلیل بنو وہاں بھی ذلیل بنو، انسان کو اللہ نے معظم اور مکرم بنایا تھا کہ اللہ کے سوا کسی اور کے آگے اس کی پیشانی نہ جھکے، جب اس نے اپنے آپ کو خود عزت والے سے ہٹالیا تو ایک ایک مخلوق کے آگے اسے جھکنا پڑا، ذلیل ہونا پڑا۔ حالانکہ آگ پانی، مٹی ہوا تو ہمارے خادم ہیں۔ یہ معبود تھوڑا ہی ہیں۔ ان سے تو ہم کام لیتے ہیں، پانی سے نجاستیں اور گندگیاں دھوتے ہیں، پھر پانی کی طبیعت یہ ہے کہ نیچے کی طرف جائے۔ آپ اسے آٹھویں منزل پائپ کے ذریعے لے گئے، جانے پر یہ مجبور ہے آپ پانی سے مجبور نہیں ہیں، پانی آپ سے مجبور ہے، کہ وہ نیچے کو جانا چاہتا ہے اور آپ اس کی طبیعت کے خلاف اس کو اوپر لے جانا چاہتے ہیں۔ آگ کی طبیعت یہ ہے کہ وہ اوپر کو جاتی ہے اس کی لپٹ جب جاتی ہے تو اوپر کی طرف، نیچے کی طرف نہیں جائے گی، لیکن مشینوں کے ذریعے سے آپ اس کی لپٹ کو نیچے لے جاتے ہیں، وہ مجبور ہے کہ مشین چل رہی ہے لپٹ نیچے جارہی ہے، تو آگ نے آپ کو مجبور نہیں کیا آپ نے آگ کو مجبور کر دیا۔ زمین پر آپ کو قابو ہے، زمین کو آپ پر قابو نہیں ہے، چناں چہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ﴾ ①

زمین کو ہم نے تمہارے سامنے ذلیل بنا دیا ذلیل نہیں کہا بلکہ مبالغہ کا صیغہ ذلولا فرمایا، اس کو کھودیں، پھاڑیں، چکنا چور کریں، بیچاری چوں نہیں کرتی، اسی طرح اس میں پانی بہا دیں نالی کھودیں چوں نہیں کرے گی، تو زمین آپ کے سامنے مجبور ہے آپ اس کے سامنے مجبور نہیں ہیں۔

یہی صورت ہوا کی بھی ہے کہ ہوا کو آپ نے مجبور کر رکھا ہے، یہ ہوا جو فضا میں بھری ہوئی ہے، آپ کے قبضے میں جب آتی ہے تو جیسا چاہے تصرف کریں، سائیکل کے ٹیوب کے اندر آپ نے اُسے بند کر رکھا ہے، نکلنا چاہتی ہے مگر جا نہیں سکتی، پانچ آنے کی گیند آتی ہے اس میں الگ بند کر رکھا ہے، گیند کو نیچے ماریں گے وہ اچھل کر اُوپر جائے گی وہ ہوا ہی ہے نکلنا چاہتی ہے مگر نہیں نکل سکتی آپ نے اس کو قید کر رکھا ہے، غرض ہوا آپ کے سامنے مجبور ہے۔

یہی صورت آگ کی بھی ہے، اب یہ آپ کے سامنے بجلی ہے یہ پہاڑوں کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ اب جب انسان کے ہاتھ میں آگئی تو ایک پتلے سے تار میں باندھ رکھا ہے نہ چھوڑیں تو تار میں بند ہے۔ ذرا سوئچ نیچے دبا دیں فوراً خادم حاضر ہے۔ تو جو پہاڑوں کو چکنا چور کرتی ہے انسان کے ہاتھ میں آکر قید ہوئی، تو چوں نہیں کر سکتی ہے۔ گرفتار ہے، بجلی کیا ہوئی ایک خادم ہوئی۔ تو خادم کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کے آگے جھکے، انسان نے الٹا کام کر دیا خود اس کے آگے جھکنا شروع کر دیا کبھی آگ کے آگے کبھی پانی کے آگے، کبھی درخت کے آگے، یہ سب چیزیں تو تمہاری خادم ہیں، تمہارے استعمال کے لئے پیدا کی گئی ہیں، ان کا کام ہے کہ وہ تمہاری اطاعت کریں، نہ یہ کہ انسان جیسی

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۵.

معظم ومکرم چیز ان کے آگے جھکے اوران کی اطاعت کرے۔ تو جھکنے کے لئے ایک ہی ذات سزاوار ہے جس کے ہاتھ میں سورج بھی ہے چاند بھی ہے درخت بھی ہیں پہاڑ بھی ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴾ ① نہ تم سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو سجدہ کرو، اس ذات کو سجدہ کرو جس نے سورج اور چاند جیسی چیزیں تمہارے سامنے بنا کر رکھ دیں، اور تمہارے لئے بنائیں۔ تو صبح کو سورج نکلتا ہے روشنی پھینکتا ہے تاکہ تم اپنے کام کاج کرو۔ رات کو چاند نکلتا ہے۔ اگر رات کو بھی سورج رہتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔ تو رات کو وہ ستارے چمکائے جس میں ٹھنڈی روشنی ہے، دن میں وہ ستارے چمکائے جس میں گرم روشنی اور چاندنا کافی ہے، تو جس نے ان کے نوروں اور روشنیوں میں فرق ڈالا وہ اللہ رب العزت ہیں تو وہ عبادت کے لائق ہیں یا یہ چاند سورج عبادت کے لائق ہیں؟ یہ تو اس قدرت کے مظاہر ہیں کہ کسی میں گرم نور اور کسی میں ٹھنڈا نور چمکا دیا، پہاڑوں کو عظمت اور رفعت دے دی۔ آسمان کو بلند کر دیا مگر سب کی بلندیوں سے جو زیادہ بلند ہے وہ ذات بابرکات ہے، سب عظمتوں پر جس کی عظمت فائق ہے وہ اللہ رب العزت کی ذات ہے۔ تو سارے انبیاء کا دین یہی رہا توحید اور یہ کہ ایک کو کرتا دھرتا سمجھو اور اسی کے آگے جھکو۔

تاثیرِ توحید...... اسی میں قلب کی قوت بھی ہے

یک در گیر محکم گیر

ایک در کو مضبوط تھامو جو ایک کا ہو جاتا ہے اس کے قلب میں قوت آ جاتی ہے کہ میرا آقا موجود ہے، اور چند آقاؤں کا غلام کسی آقا کی خدمت نہیں کر سکتا ایک طرف جھکے گا اسے خطرہ ہوگا کہ دوسرا خفا نہ ہو جائے دوسرے کے آگے جھکے گا اسے خطرہ ہوگا تیسرا خفا نہ ہو جائے۔ تو چند آقاؤں کا غلام کسی آقا کی خدمت نہیں کر سکتا۔ غلام جب خدمت کرے گا ایک آقا کی کرے گا جو متعین ہو کہ اسی کے ہاتھ میں میرا مفاد ہے۔ تو حق تعالیٰ شانہ کے ہاتھ میں نفع ونقصان، وجود وعدم اور موت وحیات ہے، اس واسطے عبادت کے لائق وہ ہی ہے سارے انبیاء علیہم السلام نے یہی تعلیم دی ہے، تو میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ دین سارے انبیاء علیہم السلام کا ایک رہا۔ شریعتیں کچھ مختلف ہوتی رہی ہیں، جیسے آدمی کے لباس بدلتے رہتے ہیں مگر آدمی وہی رہتا ہے، وہی بچہ جس نے بالشت بھر کا لباس پہنا تھا وہی اب ڈیڑھ گز کا لباس پہنے گا کیوں کہ اس کی عمر اب بیس برس کی ہوگئی، لیکن جب اس کی نشوونما مکمل ہوگئی۔ اب اس میں بڑھنے کی گنجائش نہیں رہی۔ اب جو لباس پہنے گا اس کی پیائش متعین ہوگی وہ نہ کم ہو سکتا نہ زیادہ، اس لئے کہ کم زیادہ تو تب ہو جب انسان کے اندر بڑھنے کی گنجائش ہو کیوں کہ اس کی نشوونما اور بڑھوتری مکمل ہو چکی ہے۔ اب لباس کی پیائش متعین ہوگی۔ غرض دین تمام انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی رہا، شریعتیں بدلتی رہیں۔ اس لئے عبادت صرف ایک ہی ذات کی کی جائے گی۔

① پارہ: ۲۴، سورۃ حٰم سجدۃ، الآیۃ: ۳۷۔

عبادت و تعظیم کا فرق......البتہ کسی چیز کی تعظیم کا حکم ہو تو اس کی عظمت بجالائی جائے گی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ جو صاحب کشف و کرامات بزرگ اور اولیائے کاملین میں سے تھے، دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے، مولانا پر اکثر جذب کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ ایک دفعہ مولانا کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ گنگا کہاں سے نکلی ہے؟ جو ایک قوم کی قوم گنگا کی عظمت کر رہی ہے، اسی وقت اٹھ کر سفر شروع کر دیا تو دیوبند سے چالیس میل کے فاصلے پر گنگا بہتی ہے، مولانا نے چالیس میل کا سفر کیا۔ اور اس موضع مین پہنچے جہاں سے گنگا کا دہانہ پھوٹا ہے، جو ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں ہے، گنگوتری اس جگہ کا نام ہے، سات دن وہاں ٹھہرے اس کے بعد آ کر فرمایا کہ میں نے گنگا کے دہانے پر روزے رکھے، عبادتیں کیں ذکر اور تلاوت خوب کرتا رہا تو مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ جہاں سے دہانہ پھوٹا ہے وہاں سے مجھے انوار نبوت محسوس ہوئے، یا تو کسی نبی کی وہاں قبر ہے یا کسی نبی کی نشست گاہ ہے جہاں بیٹھ کر انہوں نے قوم کو ہدایت کی ہے، اسی برکات کے آثار اس پانی میں ہیں، اس لئے قوم کی قوم، اس کی عظمت کر رہی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ایک ہے کسی چیز کی عظمت کرنا اور ایک ہے عبادت کرنا۔ عبادت جائز نہیں عظمت سب کی ضروری ہے۔

زمزم شریف جو آپ کے ہاں پانی ہے اس کی آپ عظمت کرتے ہیں اس لئے کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کیساتھ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں اور چھوٹے سے بچے ہیں، پیاس لگ رہی ہے، اور ﴿وَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ﴾ جہاں بیت اللہ ہے، ارد گرد ریگستان ہے، پانی کا نشان نہیں۔ تو بچے نے پیاس کے اندر تڑپنا شروع کیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے آ کر پر مارا اور زمزم کا چشمہ جاری ہو گیا آپ اسے عظمت سے پیتے ہیں ہر پانی کے لئے بیٹھ کر پینا سنت ہے، لیکن زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا سنت ہے، یہ تعظیم کی وجہ سے ہے اور فرمایا گیا حدیث میں: ''مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ''① ''زمزم پی کر جو دعا مانگو گے، اللہ اسے قبول کرے گا''۔

تو زمزم پینے سے پہلے کچھ اپنی مراد مانگنی چاہئے، وعدہ خداوندی ہے کہ وہ مراد عطا کی جائے گی، عام پانیوں میں یہ بات نہیں ہے، زمزم میں یہ خصوصیت ہے، اس لئے سارے مسلمان مل کر زمزم کی تعظیم کرتے ہیں زمزمیوں میں بھر کر لاتے ہیں اس کا قطرہ زمین پر گرنے نہیں دیتے کہ معظم و مشرف پانی ہے لیکن اس کے سامنے سجدہ نہیں کرتے، سجدہ کے لئے صرف ایک ہی اللہ کی ذات ہے، عظمت و تعظیم اگرچہ کی جائیگی۔

تعظیمی سجدہ......اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی تعظیم آپ کے اوپر فرض ہے، ذرا بے عظمتی کوئی کرے گا تو اسلام سے خارج ہو جائے گا، یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نہیں، تمام ہی انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ہے تو تعظیم اتنی ضروری کہ جب تک نبی کی عظمت نہ کی جائے ایمان نہیں بنتا، مگر عبادت جائز نہیں کہ نبی کو سجدہ کرنے لگیں اس کو شریعت نے ممنوع قرار دیا۔

---

① السنن لابن ماجه، کتاب المناسک، باب الشرب من زمزم ج: ۹ ص: ۱۸۲.

حدیث میں ارشاد ہے کہ: ایک دفعہ ایک صحابی حاضر ہوئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا آپ نے فرمایا: تم نے یہ کیا حرکت کی؟ عرض کیا: یارسول اللہ! یہ قیصر وکسریٰ جو روم اور فارس کے بادشاہ ہیں۔ ان کے درباری جب آتے ہیں تو ان کو سجدہ کرتے ہیں تو اللہ کا رسول اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کو سجدہ کیا جائے، اس لئے میں نے سجدہ کیا۔

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام ہے اگر میں اجازت دیتا سجدہ کرنے کی، تو عورتوں کو اجازت دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں''۔ لیکن ان کے لئے بھی ممنوع اور ناجائز ہے، اس لئے یہ حرکت کبھی نہ کی جائے نبی ہو یا غیر نبی عبادت کسی کی جائز نہیں۔ تعظیماً بھی سجدہ نہیں کر سکتے اس لئے کہ صحابہ نے تو تعظیماً ہی سجدہ کیا تھا عبادت نہیں کی تھی اس کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع قرار دیا۔ تو غیر اللہ کے سامنے عبادت کی ہیئت بھی نہیں آنی چاہئے لیکن تعظیم ضروری ہے۔

معیارِ تعظیم...... ہم حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی بھی تعظیم کریں گے، اگر اولیاء اللہ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ بھی نکلے جو بظاہر شریعت کے خلاف ہو۔ تو اس کی تاویل وتوجیہ کریں گے یہ نہیں ہے کہ گستاخی یا توہین کرنے لگیں۔ تو اولیاء کی توہین جائز نہیں چہ جائیکہ انبیاء علیہم السلام؟ حتیٰ کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بعض کتابوں میں تحریر فرمایا کہ: ہندوؤں کے جو بڑے اور مقتدا ہیں جیسے شری کرشن جی ہیں یا شری رام چندر جی ہیں ان کا نام لے کر کبھی ان کی شان میں گستاخی نہ کرو، ممکن ہے اپنے وقت میں یہی پیغمبر اور مردانِ حق ہوں، اگر ہمیں سند سے معلوم ہو جاتا کہ یہ واقعی پیغمبر تھے تو ہم ان پر اسی طرح ایمان لاتے جیسے حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام پر ایمان لاتے۔ مگر سند سے ثابت نہیں اور احتمال ہے کہ یہ اپنے وقت کے پیغمبر ہوں۔ اس لئے حضرت نے تحریر فرمایا۔ کہ گستاخی کا کلمہ ان کی شان میں نہ کہا جائے۔ ممکن ہے کہ وہ مردانِ حق ہوں۔ اور اللہ کی طرف سے شریعتیں لے کر آئے ہوں مگر جیسے حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کی شریعتوں میں قوم نے تغیر کر دیا، شریعت اپنی ذات کی حد تک حق تھی جو آئی، بعد میں لوگوں نے تغیر وتبدل کیا اور تحریف کی، کتابوں کے اندر ردوبدل کیا اس کا وبال قوموں پر ہے، پیغمبر اس سے بری ہیں، وہ اپنے وقت میں حق تھیں۔ تو بدلنا قوموں کا کام ہے، لیکن جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے وہ آسمان سے نازل ہوئیں ان پر ایمان لانا ضروری ہے، جن پیغمبروں کا نام بتلایا گیا ان پر اور جن کا نام نہیں بتلایا گیا ان پر بھی بالاجمال ایمان لانا ضروری ہے۔ ﴿مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ ① ''بعض وہ ہیں جن کے واقعات بیان کر دیے نام بھی لیا اور بعض وہ ہیں جن کا نام ہم نے نہیں لیا''۔ جن کا نام لے لیا ہے، ان کا نام لے کر ان پر ایمان لاؤ، اور جن کے نام نہیں لئے ان کے بارے میں یوں کہو کہ جتنے اللہ کے پیغمبر آئے ان سب پر ایمان لاتے ہیں۔

تو تعظیم اور چیز ہے عبادت اور چیز ہے، تعظیم حضرات انبیاء اور اولیاء اللہ کی بھی ہوگی اور فرض ہے علماء ربانی اور مشائخ

① پارہ: ۲۴، سورۃ الغافر، الآیۃ: ۷۸۔

حقانی کی بھی تعظیم کی جائے گی مگر عبادت کسی کی نہیں کی جائیگی، عبادت صرف ایک اللہ رب العزت کی کی جائیگی کہ وہ مالک اور مختار ہے، اسی کے ہاتھ میں وجود وعدم کی باگ ڈور ہے تو انبیاء علیہم السلام جتنے بھی آتے ہیں ان سب کا دین توحید رہا ہے کہ ایک کو کرتا دھرتا مانو، کسی دوسرے کی طرف عبادت کے راستہ سے مت جھکو، تعظیم کے راستہ سے جھکو۔

اوصافِ معبودیت...... اس لئے آگ ہو یا پانی، ہوا یا مٹی۔ ہم ان کی توقیر کریں گے کہ یہ اللہ کے تبرکات ہیں، مٹی بھی اسی کا ایک عطیہ ہے جس سے ہمارے پھل اور دوسری چیزیں پیدا ہوتی ہیں، جس سے ہم خود پیدا ہوتے ہیں تو وہ ماں کی جگہ ہے، اسی لئے ایک عام مثل پھیل گئی کہ ''مادروطن'' یعنی وہ زمین جس پر آدمی پیدا ہوا اس کو اپنی ماں کہتا ہے اور بعض روایات میں بھی یہ لفظ آتا ہے کہ زمین مثل ماں کے ہے، تو مادروطن کا لفظ چلا، اس لئے کہ جس سے ہمارا خمیر بنا، جس سے ہمارا غذا نکلی۔ اس کو ہم ماں کی جگہ سمجھیں گے، تو اس کی توقیر کریں گے کہ اللہ کا ایک عطیہ ہے مگر اس کی عبادت نہیں کریں گے۔ آگ کو ایک عطیہ سمجھیں گے، اس کی عبادت نہیں کریں گے سردیوں میں اس کے بغیر تاپ نہیں سکتے، اسکے بغیر کھانا نہیں پک سکتا۔

اور اگر کوئی عبادت کرے گا تو میں کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ کیا بے عقلی کی بات ہے، اس لئے آگ کے سامنے اگر آپ جھکیں گے تو آگ کی لپٹ آئی تو سب سے پہلے اسی کو ہی جھلسائے گی جو سجدہ میں پڑا ہوا ہے، جس آگ کو یہ بھی تمیز نہیں ہے کہ یہ میرا ماننے والا پجاری ہے اس کو تو بچادوں دوسروں کو پل بھر میں ختم کردوں، جس معبود کو اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ یہ میرا عابد ہے اور یہ میرا عابد نہیں وہ عبادت کے لائق ہوگا؟ اسے دوست دشمن کی بھی پہچان نہیں۔

اسی طرح پانی میں آپ گئے آپ نے اس کی عبادت کی۔ جب موج آئے گی تو پہلے وہی ڈوبے گا جو عبادت کررہا ہے۔ اس پانی کو یہ خیال بھی نہیں آئے گا کہ اسے نہ ڈبوؤں یہ تو میری عبادت کررہا ہے، دوسروں کو جاکے ڈبوؤں۔ تو جس معبود کو یہ بھی تمیز نہ ہو کہ کون میرا عابد ہے اور کون نہیں؟ کون میرا مطیع ہے اور کون نہیں؟ تو وہ عبادت کے لائق ہوگا؟ عبادت کے لائق وہ ہے جو علیم وخبیر ہو: ﴿ أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ﴾ ''وہ پیدا کرنے والا ہے جو پیدا کرنے سے پہلے بھی جانتا ہے'' کہ میں کیا چیز پیدا کررہا ہوں پیدا کرنے کے بعد بھی جانتا ہے کہ میں نے کیا چیز پیدا کی۔ اس کے انجام کو بھی جانتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ تو اول سے لے کر آخیر تک جس کے سامنے سارا علم حاضر ہے وہی عبادت کے لائق ہے، تو سارے انبیاء علیہم السلام نے ایک ہی چیز کی تعلیم دی اور وہ توحید ہے۔

تکمیلِ توحید...... اور توحید کے لئے البتہ نبوت کا ماننا ضروری ہے۔ اس کے بغیر توحید مکمل نہیں ہوتی۔ اس واسطے کہ توحید کے معنی ہیں کہ ایک کو کرتا دھرتا مانو، ایک ہی کی رضا حاصل کرو ایک ہی کی مرضیات پر چلو، اور اس کی نامرضی چیزوں سے بچو، جس سے وہ خوش ہے اسے قبول کرو یہی دین کا حاصل نکلے گا کہ مرضیات خداوندی کے مطابق عمل کرو اور نامرضیات سے الگ رہو، جس کا حکم دیا ہے اس کو مانو جس سے روک دیا ہے اس سے بچو تو مرضی اور نامرضی کو پالینا یہی فی الحقیقت دین کی روح ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ کسی کی مرضی اس کے بتلائے بغیر سمجھ

میں نہیں آسکتی۔ دو حقیقی بھائی ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے سینے سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں تو ایک کے دل کے بات دوسرے کے دل میں نہیں آئے گی، جب تک کہ دوسرا زبان سے ظاہر نہ کرے کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں اور فلاں چیز سے ناخوش ہوں۔ تو حقیقی دو بھائی جو ایک جنس اور ایک نوع ہیں ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے ایک کے دل کی خبر دوسرے کے دل میں نہیں آتی۔ جب تک بتلانے والا خود نہ بتلائے۔ تو اللہ رب العزت جو نور مطلق ہیں اور انسان جو ظلمت محض ہے بلا بتلائے آدمی کے اندر کیسے آجائے گا جب تک وہ خود نہ بتلائے۔ تو اللہ رب العزت جو نور مطلق ہیں اور انسان جو ظلمت محض ہے وہ وراء الورراء اور یہ سافل درسافل کوئی نسبت بندے کو خدا سے نہیں، اس کی مرضیات کا علم بلا بتلائے آدمی کے اندر کیسے آجائے گا جب تک وہ خود نہ بتلائے کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں، فلاں چیز سے ناخوش ہوں فلاں چیز کو ترک کر دو، اور فلاں کو اختیار کرو، یہ میرا قانون اور آرڈر ہے۔

اب ایک تو صورت یہ ہے کہ اللہ میاں خود گھر گھر کہتے پھریں کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں فلاں چیز سے ناخوش ہوں ایک ایک گھر میں خود آئے اور اطلاع دی لیکن یہ اس کی شان اقدس کے لائق نہیں، دنیا کے معمولی بادشاہ جنہیں ہم بادشاہ بناتے ہیں خود ان کی بادشاہت ذات کی نہیں ہے، ہم نے ووٹ دیا تو بادشاہ بن گئے، ووٹ نہ دیں بادشاہ نہیں۔ لیکن بادشاہ بن جانے کے بعد بادشاہ کو بھی اس سے عار آتا ہے کہ وہ رعیت کے گھر گھر جا کر اپنے قانون کو پہنچائے کہ دیکھو میں اس سے خوش ہوں اور اس سے ناخوش ہوں وہ اپنے وزیر اعظم کو مقرر کرتا ہے، وزیر اعظم گورنروں کو مقرر کرتا ہے گورنر کمشنروں کو مقرر کرتے ہیں اور تحصیلدار ایک بھنگی کو بلا کر کہتا ہے کہ منادی کردو کہ بادشاہ کا حکم یہ ہے تو پھر رعیت کے دل میں آتا ہے، تو جب دنیا کے بادشاہ جنہیں ہم ہی بناتے ہیں انہیں غیرت آتی ہے کہ گھر گھر جائیں اور قانون کی منادی کریں تو اللہ رب العزت تو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کی جناب کے لائق کہاں ہے کہ وہ گھر گھر میں آ کے خود فرمائیں، وہ اپنے وزراء کو مقرر کرتا ہے وہ وزراء انبیاء علیہم السلام ہیں جن کے قلوب پر اپنی وحی اتارتا ہے، وحی کے ذریعے اطلاع دیتا ہے۔

یہ میرا قانون ہے، میں یکتا اور بے مثل ہوں، وحی سے حضرات انبیاء علیہم السلام نے جان لیا کہ ہمارا مالک ایک ہے اور یہ اس کی شان ہے۔ فرمایا گیا: ﴿ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ﴾ (1) ''موسیٰ علیہ السلام کے قلب پر وحی فرمائی کہ میں اللہ ہوں۔ میرے سوا کسی کی عبادت نہ کرو''۔

اپنی شان بیان فرمائی کہ: ﴿ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ﴾ (2) ''میری مانند کوئی نہیں، کوئی مجھ جیسا نہیں۔ نہ میرا کوئی جسم ہے نہ میرا کوئی ضد ہے نہ کوئی ند اور شریک ہے''۔ ﴿ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ﴾ (3) ''کہہ دواے پیغمبر! اللہ یکتا ہے''۔ ﴿ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ﴾ ''اللہ صمد ہے''۔

(1) پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔ (2) پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۱۱۔ (3) پارہ: ۳۰، سورۃ الاخلاص: ۱۔

صمد کے معنی یہ ہیں کہ سارے اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ زندگی نہیں مل سکتی جب تک ادھر رجوع نہ کرے موت نہیں آسکتی جب تک وہی موت نہ دے۔ ہم باقی نہیں رہ سکتے جب تک وہ باقی نہ رکھے۔ ہر چیز اس کے قبضہ قدرت میں ہے تو ہم اپنی موت وحیات اور حدوث وبقاء میں محتاج ہیں لیکن اللہ کسی کا محتاج نہیں اس کا وجود اپنا ہے وہ کہیں وجود مانگنے نہیں گیا۔ اس کی قدرت اپنی ہے، اس نے دوسروں سے قدرت نہیں مانگی۔ اس کا علم اپنا ہے اس نے دوسروں سے کب کہا تھا کہ مجھے علم دے دو۔

استحقاقِ عبودیت...... علم وقدرت اس کی اپنی صفات ہیں اس کے علم کا کچھ سایہ ہم پر پڑ جائے تو ہم بھی عالم کہلانے لگ جائیں، اس کی قدرت کی پرچھائیں پڑ جایں تو ہم اور آپ بھی قادر کہلانے لگ جاتے ہیں، کہ ہمیں بھی کچھ قدرت اور بس حاصل ہے، تو اصل میں قدرت والا ایک ہے، جس پر وہ اپنی قدرت کا نور فائز کردے اس میں قدرت آجاتی ہے، جس پر اپنا علم ڈالدے وہ عالم کہلانے لگتا ہے، جس پر اپنے اخلاق کا رنگ ڈال دے وہ درویش کہلانے لگتا ہے، عطا اور جود سب اس کی طرف سے ہے خود کسی کی ذات کے اندر کچھ نہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ انسان کی ذات کوری ہے نہ اس میں علم ہے نہ قدرت ہے نہ کوئی اور کمال ہے کمالات کو قبول کرنے کی صرف استعداد اور صلاحیت ہے، مگر پیدائشی طور پر ماں کے پیٹ سے کوئی کمال لے کر نہیں آتا چناں چہ ارشاد ہے: ﴿ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ ① ”ہم نے تمہاری ماؤں کے پیٹ سے تمہیں نکالا۔ اس حالت میں کہ ذرہ برابر تم علم نہیں رکھتے تھے، پیدا شدہ بچہ مضغہ گوشت ہوتا ہے، نہ اس کو اچھے کی خبر نہ برے کی خبر، نہ سیاہ کی تمیز نہ سفید کی، کوئی امتیاز اور علم نہیں تو ماں کے پیٹ سے لاعلم پیدا ہوتا ہے“۔ یہ انسان کی ابتداء ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ انتہا کیا ہے؟ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿ مَنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا ﴾ ② ”انجام کار ہم تمہیں ایسی رذیل عمر کی طرف لوٹا دیتے ہیں کہ عالم ہونے کے بعد تم پھر جاہل بن جاتے ہو“۔

نوے سو برس کی عمر ہوگئی آج آنکھوں نے جواب دے دیا تو جو دیکھ کر علم حاصل ہوتا تھا اس کے راستے بند ہوگئے کانوں نے جواب دے دیا۔ ثقل سماعت پیدا ہوئی تو سن سن کے جو علم حاصل ہوتا تھا وہ راستہ ختم ہوا۔ اب کچھ حافظے میں محفوظ تھا، کچھ پہلی معلومات جمع تھیں۔ مگر پچھلی عمر میں حافظہ بھی کمزور ہو جاتا ہے تو پچھلی معلومات بھی ختم ہوئیں۔ تو اگلی معلومات کا راستہ بند ہوگیا اور پچھلی معلومات نسیان کی نذر ہوگئیں نتیجہ آگے واضح ہوگیا تو جیسے کورے آئے تھے ویسے ہی کورے چلے گئے، تو حق تعالیٰ شانہٗ نے بتلا دیا کہ تمہاری ذات میں کوئی علم نہیں جب ہم نے چاہا ڈال دیا، اور جب چاہا نکال دیا، اگر یہ چیزیں تمہاری ذات میں ہوتیں تو پیدائشی طور پر تم عالم ہوتے اور مرتے دم تک عالم رہتے لیکن ذات میں نہیں ہے تو ہماری دین سے آتی ہیں۔ غرض ہمارا وجود، علم اور قدرت سب اسکی دی

① پارہ: ۱۴، سورة النحل، الآية: ۷۸۔ ② پارہ: ۱۴، سورة النحل، الآية: ۷۰۔

ہوئی ہیں۔ تو اسی کے سامنے جھکیں گے جس نے دی ہیں۔ دوسروں نے دی نہیں تو دوسروں کے آگے کیسے جھکیں گے؟ تعظیم و توقیر الگ چیز ہے مگر عبادت نہیں کریں گے ذلت اختیار نہیں کریں گے، تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سب ہماری دین ہے۔ یہ انسان کی حالت ہے کہ نہ پیدائشی طور پر اس میں علم ہے نہ اخلاقی کمالات ہیں، اور جتنے ہوں آخیر میں وہ بھی چھن جاتے ہیں، مثل مشہور ہے کہ بچہ اور بڑا ایک بن جاتا ہے۔ یعنی جیسے بچہ معصوم اور دوسروں کے ہاتھوں میں ہے وہ بھی دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ چل نہیں سکتا جب تک کوئی چلانے والا ہو، بیٹھ نہیں سکتا جب تک اس کو حرکت نہ دیں، غرض بالکل بچہ کی طرح دوسروں کے ہاتھ پڑ جاتا ہے، پھر اس پر معصومیت طاری ہو جاتی ہے تو واضح ہوا کہ انسان کی ذات کوری ہے، اس میں کچھ نہیں، جب انسان کی ذات کوری ہے تو انسان عبادت کے لائق نہیں بن سکتا، جو اپنی ذات سے جاہل ہو وہ معبود کیسے بن جائے، معبود کی شان یہ ہے کہ وہ عالم ہو۔

جب انسان معبود نہیں بن سکتا تو اور تو تمام انسان کے نیچے ہی نیچے ہیں تو کیا جانور معبود بنیں گے جو انسان کے نیچے ہیں، کیا آگ پانی معبود بنیں گے جن کو انسان خود عدم سے نکالتا ہے، دیا سلائی کھینچی تو آگ آگئی، پاؤں سے روند دی تو آگ ختم ہوگئی تو یہ آگ معبود بنے گی؟

جب انسان معبود نہیں تو ساری چیزیں انسان کے نیچے ہی نیچے ہیں وہ انسان کی خادم ہیں وہ کیسے معبود بن سکتی ہیں؟ ایک ذات سب کی معبود ہے اور ایک یہی کرتا دھرتا ہے۔ یہی انبیاء علیہم السلام بھی تعلیم دیتے ہیں تو انبیاء علیہم السلام ساری دنیا اور سارے ملکوں میں آئے اور ایک ہی چیز لے کر آئے۔

اختلافِ مذہب کے اسباب...... اور ابتداء میں سارے انسان ایک ہی دین پر تھے، لیکن جوں جوں لوگوں نے اپنی عقلیں چلائیں تو دین کے اندر فتنے پیدا ہوتے گئے اگر محض اتباع کرتے کہ جو اللہ کے رسول نے لا کر دے دیا اس پر آنکھ بند کر کے چلتے، کوئی نزاع نہ ہوتا۔ نزاع جب ہوتا ہے جب اوپر سے آئی ہوئی چیزوں میں آدمی عقلیں لڑائیں اور عقلی ڈھکوسلوں سے عقیدے بنانا شروع کریں یہیں سے آدمی کے اندر خلل پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔

اس طرح کبھی انتہائی محبت سے عقیدہ بگڑتا ہے کہ کسی ذات سے انتہائی محبت اور عقیدت ہے اس کو اتنی بڑائی دی کہ اس کو خدائی کے درجہ تک پہنچا دیا۔ کبھی انتہائی عدوات سے عقیدہ بگڑتا ہے، کہ کسی سے عداوت ہوئی کہ فلاں پر نام لے کر لعنت بھیجنی شروع کر دو، نام لے کر برا کہو۔ اس کا بھی ایک غلو ہے، تو کبھی غلو عداوت میں اور کبھی غلو محبت میں عقیدے بگڑتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: ”اے علی! تمہارے بارے میں بعض لوگ محبت کی وجہ سے تباہ ہوں گے اور بعض عداوت کی وجہ سے“۔

بعض لوگوں نے انتہائی محبت کی کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خدا تک کہا اور کہا کہ یہ خدا کا مظہر ہیں، اور اتنی انتہائی عقیدت کی کہ ان کے سامنے جھکے جیسے خدا کے آگے، یہ غلو محبت میں ہلاک ہوئے، اور رفض کا قصہ چلا۔ اور خوارج ان کی عداوت میں ہلاک ہوئے کہ ان کو مسلمان تک بھی نہ مانا، ان کا تبرا شروع کیا معاذ اللہ ان پر لعنت

بھیجنی شروع کی، تو بعض محبت میں اور بعض عداوت میں غلو سے تباہ ہوئے۔

یا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کہ نصاریٰ ان کی محبت میں تباہ ہوئے کہ ان کو اللہ کہا، اللہ کا بیٹا کہا خدائے مجسد کہا کہ ایک نورانی خدا ہے ایک جسمانی خدا ہے، نورانی خدا اوپر ہے جسمانی خدا نیچے ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں ان کے لئے علم غیب اور قدرت ثابت کی اور سارے وہ اوصاف جو اللہ کے لئے ہیں ان کے لئے ثابت کئے تو غلو محبت میں عقائد تباہ کئے۔ اور یہود عداوت میں برباد ہوئے حتیٰ کہ ان کے بارے میں کہا کہ یہ وَلَدِ غَیًّا ہیں۔ بازار والے آدمی یوسف نجار سے پیدا ہوئے اور حضرت مریم علیہا السلام پر انہوں نے تہمت لگائی۔

بہر حال عقائد میں ان دو چیزوں سے خلل پڑتا ہے اور کبھی عقل لڑانے سے اس لئے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی چیز ہو اس میں عقل کی گنجائش نہیں۔ مثلاً قرآن کریم یا حدیث میں فرمایا گیا کہ عذاب قبر برحق ہے اور وہ اپنی جگہ ہوتا ہے۔ اب لوگوں نے عقل لڑائی کہ ہم نے قبر کھود کر دیکھی ہمیں تو اس میں عذاب نظر آیا نہیں، وہاں تو ایک لاش پڑی ہوئی تھی وہاں نہ کوئی آگ تھی نہ سانپ نہ بچھو۔ تو ہم اس عقیدے کو کیوں مانیں، عقل لڑائی تو عقیدہ بگڑ گیا۔

حدودِ عقل...... حالانکہ یہ عمل سے بالاتر چیز ہے، وہ دوسرے عالم کی چیز ہے، لاش پڑی ہوئی ہو اور سب کچھ گزر رہا ہو ممکن ہے کہ آپ کو نظر نہ آئے۔ آپ ایک سوتے ہوئے آدمی کو دیکھیں کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے کہ میں بادشاہ بن گیا ہوں۔ تخت سلطنت پر بیٹھا ہوا ہوں اور میرے سامنے ہزاروں غلام خدام کھڑے ہیں، اور فوجیں سلامیاں دے رہی ہیں۔ مگر آپ یہ دیکھ رہے کہ یہ پڑا ہوا سو رہا ہے، نہ وہاں حشم وخدم ہیں نہ سپاہی اور اس پر سب کچھ گزر رہی ہے مگر آپ کو نظر نہیں آرہا۔ اس لئے کہ وہ ایک دوسرے عالم، عالم مثال سے گزر رہا ہے، روح نیند کے وقت نکل کر اس عالم میں پہنچی تو وہاں وہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ آپ کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

جب وہ خود سویا ہوا اٹھ کر بیان کرے کہ میں نے یہ خواب دیکھا آپ اس کی تصدیق کریں گے، تو خواب میں اس نے لذت وراحت بھی اٹھائی اور عزت بھی پائی آپ کو کچھ نظر نہیں آیا، مگر آپ نے یقین کیا۔ تو جیسے ایک سونے والے پر سب کچھ گزر رہی ہے مگر آپ کو کچھ نظر نہیں آتا تو حدیث میں ہے کہ: "اَلنَّوْمُ اُخْتُ الْمَوْتِ" "نیند موت کی بہن ہے"۔

تو جو چیز نیند میں گزرتی ہے وہ موت کے بعد بھی گزر سکتی ہے، فرق اتنا ہے کہ قبر میں عذاب ہو رہا ہے، آپ کو ایک لاش نظر آرہی ہے مگر اس پر سب کچھ گزر رہی ہے اس کی دوسرے کو اطلاع نہیں، جو دوسرے پر گزر رہی ہو۔

یا ایک چارپائی پر دو آدمی سو رہے ہوں، ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ میں بادشاہ بن گیا ہوں ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ سپاہی مجھے ڈنڈے مار کر جیل خانے میں لے جا رہے ہیں، ایک خواب میں ہنس رہا ہے اور ایک رو رہا ہے مگر ایک کو دوسرے کی خبر نہیں جو اس پر گذر رہی ہے اس کی دوسرے کو اطلاع نہیں، جو دوسرے پر گزر رہی ہے اس کی دوسرے کو خبر نہیں حالانکہ ملے ہوئے ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اگر ایک قبر میں دو مردوں کو دفن

کردیں ایک اللہ کا مطیع ہے ایک مجرم ہے۔ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ قبر میں بہترین نعمتیں میرے سامنے ہیں،اور ایک دیکھ رہا ہے کہ بدترین عذاب میرے اوپر ہے اس کی اسے خبر نہیں،اس کی اسے خبر نہیں اور آپ دیکھیں گے کہ دو لاشیں پڑی ہوئی ہیں نہ نعمت ہے نہ عذاب ہے۔

جب دنیا میں اللہ نے ایک نظیر رکھ دی ہے،اس میں جب نعمتیں اور مصیبتیں گزرتی ہیں تو مرنے کے بعد اگر قبر میں راحت،اور مصیبت گزرے،عذاب اور ثواب ہو تو اس میں کون سے تعجب کی بات ہے دنیا میں اس کی نظیر موجود ہے۔لیکن اگر عقل لڑائیں گے تو عقیدہ بگڑ جائے گا،اس لئے کہ عقل کا وہاں کام نہیں۔عقل ہوا مٹی آگ پانی کے اس دار فانی میں کام کرنے کے لئے ہے یہاں کی چیزوں میں عقل چلے گی۔ یہاں کی عقل سے وہاں کی چیزوں میں کام لینے لگیں تو وہاں یہ نہیں چلے گی۔

امور غیبیہ اور عقل...... یہ بالکل ایسا ہے جیسے ترازو جو پیتل کی چھوٹی سی ہوتی ہے،اس پر سونا اور چاندی تلتا ہے۔ایک ذرا بڑی ہوتی ہے اس میں حلوائی تلتا ہے،ایک اس سے بڑی ہے اس میں ایندھن اور سوختہ تلتا ہے اور ایک اتنی بڑی ہے کہ اس میں ہزاروں ٹن کا ریل کا ڈبہ تلتا ہے کہ اس میں اتنے ٹن وزن ہے،دس ہزار ٹن کا ایک جہاز ہے اس میں ایک مشین لگی ہوئی ہے،تو کانٹا بتلا دیتا ہے کہ اتنے ہزار ٹن کا جہاز ہے،اب اگر جہاز کو کانٹے پہ تو لنے لگیں تو کیا تل جائے گا؟ ایندھن تولنے کے ترازو پر آپ ریل کے ڈبے کو رکھ دیں تو کیا وہ تل جائے گا؟ حالاں کہ یہ بھی ترازو ہے وہ بھی ترازو ہے،مگر یہ ترازو سونا تولنے کی،یہ گیہوں تولنے کی اور یہ ترازو لکڑیاں تولنے کی ہے۔اور یہ ترازو ریل کا ڈبہ تولنے کی ہے ہر ترازو میں وہی چیز تلے گی جس کے لئے وہ بنائی گئی ہے،یہ نہیں ہوسکتا کہ چھوٹی ترازوؤں میں بڑی چیز تلنے لگے۔تو عقل بھی ایک ترازو ہے مگر اس میں محسوسات تولے جاتے ہیں،وجدان اور وحی بھی ایک ترازو ہے جس میں غیبی امور تولے جاتے ہیں،باطن بھی ایک ترازو ہے جس کے اندر قبر کا عذاب اور ثواب تولا جاتا ہے،اب اگر آپ آنکھ سے قبر کا عذاب اور ثواب تولنے لگیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے سونے تولنے کے کانٹے میں ریل کے ڈبے کو تولنے لگیں،وہ نہیں تلے گا بلکہ وہ ترازو ہی ختم ہو جائے گا،تو اگر عقل پر غیبی امور کا بوجھ ڈال دیا جائے تو وہ سسک کر مر جائے گی فیصلہ ان کا کیا کرے گی؟ تو آپ دنیا کی ترازو سے آخرت کی چیزیں تولنے لگیں تو وہاں عقل کیا کام کرے گی؟ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے سونے تولنے کی ترازو میں آپ لکڑی تولنے لگیں وہ نہیں تلیں گی۔بہر حال کبھی عقائد میں عقل لڑانے سے بگاڑ آتا ہے کہ عقائد غیب کی چیزیں ہیں عقل وہاں کام نہیں کرتی گویا آپ نے عقل کے کانٹے میں عقیدے کو تولنا شروع کر دیا۔

حدودِ ادراک......دنیا کے اندر آنکھ کا کام نظر ہے کہ صورتیں دیکھے اور رنگ دیکھے،آپ یوں کہیں کہ میں آنکھ سے خوشبو سونگھوں،نہیں سونگھ سکتے،اس کے لئے ناک ہی کام دے گی۔ناک خوشبو سونگھتی ہے آپ ناک کے ذریعے کسی چیز کو دیکھنا چاہیں کبھی نہیں دیکھ سکتے،کان آوازیں سنتے ہیں،آپ یوں چاہیں کہ کان سے رنگ دیکھ لوں

کبھی نہیں دیکھ سکتے، حالانکہ ایک چہرے میں یہ ساری چیزیں جمع ہیں، آنکھ، ناک، کان، گلہ ان میں انچ انچ بھر کا فاصلہ ہے مگر ایسی سدِ سکندری حائل ہے کہ آنکھ کے دائرے میں کان اور کان کے دائرے میں ناک کام نہیں کرسکتی، اپنے اپنے دائروں میں کام کرتے ہیں۔ تو عقل کا بھی ایک دائرہ ہے اور باطن کا بھی ایک دائرہ ہے اب اگر میں، گنگا کے کنارے پر بیٹھ کر معلوم کرنا چاہوں تو مجھے کیا معلوم ہوگا کہ گنگا کے اندر کیا برکت ہے، کون سے نبی آئے تھے کن کے آثار ہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو پتہ چل گیا۔ اس لئے کہ باطن کی آنکھ تھی ان پر منکشف ہوگیا کہ واقعی اس پانی میں کچھ برکات کے آثار ہیں، اور پیغمبروں کی طرف نسبت ہے اس لئے قوم کی قوم اس کی عظمت پر لگی ہوئی ہے۔

تو ہر چیز سے اس کے دائرے کی چیزیں تولی جاتی ہیں۔ عقل سے عقلی امور، آنکھ سے، رنگ وصورت، ناک سے خوشبو بدبو اور کان سے آوازیں۔ پھر ہر ایک کا دائرہ الگ الگ ہے۔ تو اسی طرح سے ایک دائرہ وحی خداوندی کا ہے وحی بتلا سکتی ہے کہ قبر کیسی ہے، جنت و دوزخ کیسی ہے۔ پل صراط کیسا ہے۔ میزان عمل ''جس میں اعمال تولے جائیں گے'' وہ کیسی چیز ہے۔ آپ عقل سے جاننے لگیں گے نہ سمجھ سکیں گے یہ عقل سے بالاتر چیز ہے، جو وحی سے سمجھ میں آئے گی، بہرحال ہر چیز کا ایک دائرہ ہے۔

منبع عقائد...... تو عقیدہ کبھی عقل سے بگڑتا ہے کہ ہے غیر عقلی چیز اس میں عقل لڑانی شروع کی تو یا سچے عقیدہ کا انکار کریں گے یا غلط عقیدہ گھڑلیں گے، دین برباد ہو جائیگا۔ اور کبھی عقیدہ غلو محبت سے بگڑتا ہے کہ اپنے اعتقاد والے بزرگوں سے اتنی محبت بڑھ جائے کہ آدمی فانی بن جائے جو وہ کہیں اسی کو آدمی شریعت سمجھ لے، جو وہ کہیں اسی کا عقیدہ بنالے، کیوں کہ عقیدے شریعت کے ہیں ان میں اس سے بگاڑ پیدا ہوگا اور کہا جائیگا کہ عقیدے پیغمبر سے لئے جائیں گے اولیاء سے عقیدے نہیں لئے جائیں گے، علماء عقیدے بنانے والے نہیں ہیں، مشائخ عقیدہ قائم کرنے والے نہیں ہیں، مشائخ خود پابند ہیں ان عقیدوں کے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں، علماء خود ان عقائد کے پابند ہیں جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ نے ارشاد فرمائے عقیدہ خدا کی خبر سے بنتا ہے، علماء کے کہنے سے عقیدہ نہیں بنتا، لیکن محبت میں ان کے ہر قول و فعل کو آدمی عقیدہ بنالے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ شریعت اور دین کے اندر خلل پیدا ہوگا۔

اور کبھی غلو عداوت سے عقیدہ بگڑتا ہے کہ کسی جماعت یا کسی شخص سے عداوت پیدا ہو جائے۔ ضد یا عناد پیدا ہو جائے، اچھی سے اچھی بات بھی کہیں گے، تو یہ غلط کہے گا، اس لئے کہ بدگمانی پہلے قائم کرلی۔ وہ صحیح عقیدہ بھی بیان کریں گے تو غلط کہے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ غلط عقیدے پر قائم ہو جائے گا، اور صحیح عقیدے سے محروم رہے گا تو عقائد کو بگاڑنے والی کبھی عقل ہوتی ہے کہ غیبی امور میں دخل دے۔

ضرورتِ اعتدال...... کبھی محبت کا غلو ہوتا ہے کہ بے جا محبت پیدا کرلے اور کبھی عداوت کا غلو ہوتا ہے کہ بے جا

عداوت پیدا کر لے، اس لئے شریعت نے اعتدال بتلایا۔ عربی کا ایک شعر ہے جس کا ترجمہ ہے: ''اگر کسی سے محبت کرو تو اعتدال سے کرو، افراط کے ساتھ مت کرو، ممکن ہے کہ کل کو دشمنی پیدا ہو جائے کہ آج محبت میں آ کے سارے راز کھول دیئے اور کل کو ہوگئی دشمنی تو خود اس کے ہاتھ میں آ گئے، جدھر چاہے تمہیں لے جا کے پٹخ دے، اب پچھتاؤ گے کہ محبت میں سارے راز میں نے کیوں کھول دیئے''۔ اور فرمایا: کہ کسی سے عداوت کرو تو اعتدال سے کرو ممکن ہے کہ کل کلاں دوست بن جائے، تو عداوت میں آ کر جو برا بھلا کہا ہے کل کو تمہاری آنکھ نیچی ہوگی کہ ہم نے بہت برا بھلا کہا تو کیوں افراط وتفریط سے چلتے ہو، محبت کرو تو اعتدال سے، عداوت کرو تو اعتدال سے، نفس کے جذبے سے نہ محبت ہو نہ عداوت ہو، اس لئے کہ اسلام کی یہی تعلیم ہے۔

کمالِ ایمان...... چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا: ''مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ'' ''جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے، نفس اور اپنی ذات کے جذبے سے نہیں کی، رضاء خداوندی کے لئے کی، عداوت باندھی تو اللہ کے لیے باندھی، کہ یہ اللہ کا دشمن ہے، مجھے بھی اس سے عداوت ہے۔ یہ اللہ کا دوست ہے میں بھی اس سے محبت کروں، کسی کو دیا تو اللہ کی رضا کے لئے دیا اور کسی سے ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے روکا۔ تو عطاء ومنع اور محبت وعداوت سب لوجہ اللہ ہوں تو اس شخص نے ایمان کامل کر لیا''۔ تو کمال ایمان یہ ہے کہ محبت اور عداوت لوجہ اللہ ہوں، ذاتی جذبہ اور غیض کا دخل نہ ہو، دینا اور لینا لوجہ اللہ ہو، محض ذاتی جذبہ نہ ہو کہ فلاں سے محبت ہوگئی تو سب دے ڈالو اور فلاں سے عداوت ہوئی تو روک لو نہیں! بلکہ یہ دیکھو کہ اللہ کے نزدیک اسے دینا پسندیدہ ہے یا نہیں۔ پسندیدہ ہو تو دو اگر چہ نفس نہ چاہئے اور اگر اللہ کے نزدیک دینا پسندیدہ نہیں تو ہرگز نہ دو، اگر چہ نفس دینا چاہے، تو اپنے نفس کو ایک طرف ڈالو، اللہ کی رضا کو مقدم رکھو، تو حاصل ایمان کا یہ ہے کہ۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ۔۔۔ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اگر آپ زندہ کریں تو آپ کی عطا ہے زندہ ہونے کو تیار ہیں اور اگر موت دیں تو میں آپ پر فدائی ہو جاؤں گا، دل آپ سے اٹک چکا ہے جو آپ کریں، جس سے آپ راضی اس سے میں راضی ہوں، تو بندے کا کام یہ ہے کہ رضاء خداوندی میں فنا ہو جائے کہ میری رضا کچھ نہیں جو رضاء ہے وہ اللہ کی ہے، میرا لینا دینا اور محبت و عداوت سب اللہ کی رضا کے تابع ہے۔

ممنونیت اِحسان...... اور خود میرے حق میں بھی نفس کے تابع نہیں ہے۔ کسی غلام سے کسی نے کہا تھا کہ تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو آقا کھلا دے۔ کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے کام کیا کریگا؟ جو آقا کام لے۔ اس نے کہا کہ آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا کہ اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو میں غلام ہی کیوں بنتا، میرے غلام بننے کے معنی یہ ہیں کہ اب میری مرضی بھی غلام، میرا ارادہ اور خواہش بھی غلام جو کچھ ہوگا آقا کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ وہ کھلا دیں گے تو کھالیں گے، نہیں کھلائے گا تو نہیں کھائیں گے وہ کام لے تو کام کریں گے، معطل چھوڑ دے تو

معطل ہو جائیں گے، تو ہم اپنے آقا کے تابع ہیں۔

جب ایک انسان، ایک انسان کے ذرا سے احسان کی وجہ سے اتنا تابع ہوتا ہے تو رب العزت تو سارے محسنوں سے برتر محسن ہیں جب اس کا بندہ بنیں تو بندگی کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز اس کے تابع کر دی نہ میری اپنی مرضی نہ اپنی رضا، نہ میرا اپنا ارادہ، جو کچھ ہو وہ آپ کا ہی ہے، یہ شان جب پیدا ہو گئی تو کہا جائے گا کہ آج انسان میں بندگی آگئی۔ آج اس کے اندر عبدیت آئی۔

شانِ عبدیت...... اگر اپنا ارادہ اور اپنے عزائم ہیں تو پھر وہ بندہ کیا ہے؟ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ نے اپنے ایک مرید کو خلافت دی اور فرمایا کہ: فلاں جگہ جاؤ اور جا کر دین پھیلاؤ، رخصت ہوتے وقت اس مرید خلیفہ نے عرض کی کہ حضرت مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔

فرمایا: دو نصیحتیں کرتا ہوں: ایک خدائی کا دعویٰ نہ کرنا اور ایک نبی ہونے کا دعویٰ نہ کرنا۔

وہ حیران ہوا کہ حضرت کیا مجھ سے آپ کو یہ توقع تھی کہ میں خدائی کا دعویٰ کر دوں، آپ کا مرید اور آپ کا نائب اور خدائی کا دعویٰ کرے۔ اور کیا آپ کو یہ توقع تھی کہ میں نبی ہونے کا دعویٰ کروں گا۔ یہ تو ادنیٰ مسلمان بھی نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ آپ کا مرید اور نائب خدائی اور نبوت کا دعویٰ کرے۔

فرمایا: پہلے اس کے معنی سمجھ لو، خدا کے معنی ہیں کہ جو کچھ وہ فرمائیں وہ ہو کر رہے وہ اٹل ہے، اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، اگر کوئی بندہ یہ کہے کہ جو میں چاہوں وہی ہوگا، وہ در پردہ خدائی کا مدعی ہے، چاہے زبان کے واسطے سے نہ کہے۔

اور نبی کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو فرمادیں، وہی صدق اور حق ہے ممکن نہیں کہ نبی کا کہا ہوا غلط ہو جو آدمی یوں کہے کہ جو میں نے کہا یہی صحیح ہے، اس کے علاوہ سب غلط ہے تو وہ فی الحقیقت نبوت کا مدعی ہے، چاہے زبان سے نہ کہے، اس لئے میں نے کہا کہ نہ خدائی کا دعوی کرنا نہ نبوت کا دعویٰ کرنا۔

انسان جب یہ دعویٰ کرے کو جو میں کہہ رہا ہوں، اٹل ہے، وہی ہوگا، یہ در پردہ خدائی کا دعویٰ ہے، جو میں کہہ رہا ہوں وہ اٹل ہے، یہ در پردہ نبوت کا مدعی ہے، اسے یوں کہنا چاہئے کہ جو اللہ نے کہا ہے وہی حق ہے، میرا کہا ہوا کوئی چیز نہیں جو اللہ کے رسول نے کہا وہی حق ہے، میرا کہا ہوا کوئی چیز نہیں، جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا میرا چاہا ہوا پورا نہیں ہو سکتا: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ﴾

اگر یوں کہے تو ہے بندہ۔ اور اگر یوں کہے کہ میں جو چاہوں وہی ہوگا تو در پردہ خدائی کا مدعی ہے، جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے، باقی سب غلط ہے، یہ در پردہ نبوت کا دعویٰ ہے، یہ تفویض اور عبدیت کے خلاف ہے، بندگی کے یہ معنی ہیں کہ جو کہا جائے یا کیا جائے وہ اس کی رضاء کے لئے ہو حتیٰ کہ ہر نقل و حرکت اس کی رضا کے لئے ہو۔ جیسے مولانا رومی نے فرمایا: ''اے اللہ اگر آپ ہمیں علم دیں اور ہم علم کے میدان میں آئیں تو آپ کے محل اور ایوان و قصر میں

داخل ہوگئے، اور اگر آپ جہالت میں رکھیں تو آپ کے جیل خانے میں داخل ہیں، آپ کے بندے علم میں لے آئیں تو آپ کے محل میں داخل ہوگئے اور اگر جیل میں لے آئیں تو آپ کے جیل خانے میں داخل ہوگئے''۔

اگر آپ سلا دیں تو ہم بے بس ہیں اور اگر آپ بیدار رکھیں تو آپ کے ہاتھ میں ہیں نہ خواب ہمارے نہ بیداری ہماری، جو کچھ دیا ہوا ہے وہ آپ کا ہے، تو بندگی کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ ادھر کا منشاء ہو اس کی آدمی تابعداری کرے۔ جب آدمی اپنی بات چلائے، عقل چلائے، غلو محبت یا غلو عداوت چلائے تو در پردہ الوہیت و نبوت کا مدعی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ اللہ کے آستانے کے آگے جھکے تو حید کے معنی ہی یہ ہیں کہ دل سے بھی ایک ہی کو یکتا اور کرتا دھرتا سمجھے اور عمل سے بھی ایک ہی کی طرف جھکے۔

اقسامِ توحید...... اسی لئے شریعت اسلام نے توحید دو قسم کی بتلائی ہے، ایک توحید اعتقادی یعنی اعتقاد بھی یہ کہ ایک ہی اللہ ہے جو معبود ہے، وہی علیم و خبیر ہے اور رحمٰن و رحیم، وہی آقا وہی مالک ہے، یہ عقیدہ ہے، عملاً یوں جھکایا کہ زندگی کا کوئی موڑ نہیں ہے جس میں اللہ کی طرف نہ جھکایا ہو اگر آپ سونے کے لئے لیٹیں، حدیث میں حکم ہے کہ دعاء پڑھو: ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ اَمُوْتُ وَاَحْيٰى''۔ ''اے اللہ! تیرے ہی نام پر مر رہا ہوں اور تیرے ہی نام پر صبح کو زندہ ہوں گا''۔ یہ بھی ایک مجازی موت ہے، اللہ کے نام پر خاتمہ ہونا چاہئے، جب آپ جاگے تو پھر شریعت متوجہ ہوئی کہ پھر اللہ کی طرف متوجہ ہوں۔ اور کہیں: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَحْيَانَا بَعْدَمَآ اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ'' ① ''حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے موت کے بعد پھر مجھے زندگی بخشی، اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کے جانا ہے''۔

آفتاب طلوع ہو تو فرمایا: اللہ کی طرف توجہ کرو اور یہ دعا کرو: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ جَلَّلَنَا الْيَوْمَ عَافِيَةً'' ② ''حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے سورج کو چمکا دیا، جس نے سورج کے ذریعے ہمارے کام آسان کئے''۔ جب غروب آفتاب ہو پھر فرمایا کہ: اللہ کی طرف متوجہ ہو اور یہ پڑھو: ''اَللّٰهُمَّ هٰذَا اِقْبَالُ لَيْلِكَ وَاِدْبَارُ نَهَارِكَ وَاَصْوَاتُ دُعَاتِكَ فَاغْفِرْلِىْ'' ③ ''اے اللہ! تیرے سورج کے جانے کا وقت ہے اور تیری رات کے آنے کا وقت ہے اور تیرے منادی نداء کر رہے ہیں کہ دوڑو نماز کی طرف، ایسے وقت میری مغفرت فرما''۔

غرض زندگی کا کوئی موڑ آئے شریعت نے فوراً متوجہ کیا ہے، کہ توجہ الی اللہ کرو تاکہ توحید میں خلل نہ پڑے، ایسا نہ ہو کہ تم سورج کو کرتا دھرتا سمجھ لو، ایسا نہ ہو کہ تم روشن دن کو یہ سمجھ لو کہ یہ ہمارا کام چلانے والا ہے، ایسا نہ ہو کہ رات کو تم موت دینے والی سمجھ لو کہ رات آگئی تو مر گئے سو گئے، نہ دن زندگی دیتا ہے نہ رات، جس نے رات اور دن بنائے وہی زندگی اور موت کا مالک ہے، لہٰذا بستر پر جا کر کہو: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا مكم ممن لا كافى له

① الصحيح للبخارى، كتاب الدعوات، باب وضع اليد اليمنىٰ تحت الخد الايمن، ۵/۲۳۲۷ رقم: ۵۹۵۵.

② عمل اليوم والليلة لابن سنى، ج: ١ ص: ٢٧٧.

③ السنن للترمذى، كتاب الدعوات، باب دعاء ام سلمة، ج: ١٢، ص: ١۴.

ولا مؤوی" ① "حمد ہے اس اللہ کے لئے جس نے ہمیں کھلایا جس نے ہمیں پلایا جس نے ہمیں ٹھکانا دیا" تاکہ ادھر توجہ نہ ہو کہ یہ کھانا کھانا زندگی کا بڑا سبب ہے، کھانے نے ہمیں زندہ رکھا ہے، کھانا کیا چیز ہے؟ فاقہ مست بھی زندہ رہتے ہیں، زندگی ایک اللہ کے ہاتھ میں ہے روٹی میں زندگی نہیں ہے تو روٹی کے وقت متوجہ کیا، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ روٹی کو خدا سمجھ بیٹھیں، اس کو خدا سمجھیں جس نے روٹی عطا کی، تو کھانا شروع کرو تو کہو بِسْمِ اللہِ اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں، ختم کرو تو کہو "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کثیرا بہت تعریف میرے پرودگار کے لئے ہے، جس نے کھلایا۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: اگر "بِسْمِ اللّٰہِ" سے کھانا شروع کرے اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا" پر ختم کرے "غُفِرَلَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ" اس کے پچھلے چھوٹے گناہ سب بخش دیئے جاتے ہیں، اس کی فضیلت بیان فرمائی۔ تو حاصل یہ ہے کہ زندگی کا کوئی موڑ ایسا نہ ہوگا جس میں توجہ الی اللہ نہ ہو۔ استنجا کیلئے جاؤ تو دعاء بتلائی گئی: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ ② "اے اللہ! میں ناپاک چیزوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں"۔ شیطان ہو یا کچھ اور ہو میں پناہ مانگتا ہوں۔

اور جب استنجاء کر کے نکلو پھر اللہ کو یاد کرو، اور کہو۔: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ" ③ "حمد ہے اس اللہ کیلئے جس نے اذیت کی چیزیں مجھ سے دور کردیں اور اب میں اس کی عبادت کے لئے تیار ہو گیا اور میرے قلب میں نشاط پیدا ہو گیا"۔

تو آدمی یوں نہ سمجھ جائے کہ استنجاء کرنا درحقیقت صحت ہے، میری صحت استنجاء کے ہاتھ میں ہے، قبض ہوگی تو بیمار ہوں، قبض نہیں ہوگی تو بیمار نہیں رہا، گویا قبض وبسط کے ہاتھ میں میری زندگی ہے، تو اس سے بچانے کیلئے کہا کہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ تو سونے جاگنے، استنجاء کرنے اور فارغ ہونے میں، سورج نکلنے اور غروب ہونے میں، دن کے آنے اور جانے میں اور اسی طرح گھر کے باہر نکلنے میں بھی کہ وہاں بھی متوجہ کیا کہ اب تم کام کاج کے لئے جارہے ہو تو اللہ کی طرف توجہ کرو اور کہو: "بِسْمِ اللّٰہِ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ. تَوَکَّلْنَا عَلَی اللّٰہِ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ" ④ "میں اللہ کے نام سے نکل رہا ہوں، میں اللہ پر ایمان لاچکا ہوں میں نے اللہ پر بھروسہ کرلیا ہے کہ جو کچھ پیش آئے گا، اس کی تقدیر سے پیش آئے گا، کوئی مجھے نقصان پہنچانے والا بجز ایک اللہ کے نہیں ہے"۔

اسی طرح گھر میں داخل ہو تو فوراً دعاء کرو: "بِسْمِ اللّٰہِ وَلَجْنَا وَبِسْمِ اللہِ خَرَجْنَا وَعَلَی اللّٰہِ

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب مایقول عند النوم واخذ المضجع ج:۱۳ ص: ۲۴۱. صحیح ابن حبان، کتاب الزینۃ والتطییب، باب آداب النوم، ج:۲۳، ص:۱۰۴.

② الصحیح للبخاری، کتاب الوضوء، باب الدعاء عند الخلاء، ج:۵، ص:۲۳۳۰.

③ سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب ما یقول اذا خرج من الخلاء، ج:۱ ص:۱۱۰، رقم:۳۰۱.

④ السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب مایقول اذا خرج من بیته، ج:۱۳، ص:۲۹۰. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح ابی داؤد، ج:۱۱ ص:۹۵ رقم ۵۰۹۵.

رَبِّنَاتَوَ کَّلْنَا". " اللہ ہی کے نام سے ہم گھر میں داخل ہو رہے ہیں، اور اللہ ہی کے نام سے نکلیں گے، اور ہمیں تو اللہ پر بھروسہ ہے" کسی غیر اللہ پر ہمیں بھروسہ نہیں ہے تا کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے، کہ آرام دینے والا یہ گھرانہ ہے، گھرانے آدمی سے چھنتے رہتے ہیں، آج بڑی جائیداد اور کئی گاؤں کا مالک، لیکن کل کو غریب بن گیا، تو وہ خدا نہیں ہے وہ دینے والا نہیں ہے، وہ اسباب کے درجہ میں ہے۔

غرض ہر موقع پر اللہ کی طرف توجہ کرائی ہے۔ تو ایک توحید اعتقادی ہے کہ دل میں یہ یقین رکھے کہ اللہ کی ذات اور ساری صفات یکتا ہوں، اور ایک ہی میں ہیں دوسرا اس کا مثل نہیں۔ اور دوسری عملی توحید ہے کہ زندگی کے ہر گوشے میں ایک ہی کی طرف متوجہ کیا ہے، فقط نماز روزے ہی میں نہیں معاشرت میں چلنے پھرنے میں، گھر آنے جانے میں مسجد میں داخل ہونے اور نکلنے میں سفر میں جانے اور آنے میں بھی ہر موقع پر اللہ کی طرف توجہ کرو، یہ توحید عملی ہے تا کہ عمل کے ایک ایک گوشہ میں تم اللہ ہی کی طرف پہنچو، کسی دوسرے تک نہ جاؤ۔

اسلام کا مزاج..... تو جس دین نے ہمیں سونے جاگنے، چلنے پھرنے میں ایک ذات کی طرف متوجہ کیا تو کیا وہ دین غیر اللہ کی طرف متوجہ کرے گا کہ ہم غیر اللہ کو سجدہ کریں اور غیر اللہ سے ہم پناہ مانگیں، غیر اللہ سے ہم مرادیں مانگیں، اس دین کا یہ مزاج ہی نہیں، یہ مزاج لوگوں کی عقلوں نے پیدا کیا ہے، لوگوں کی غلو محبت اور غلو عداوت نے پیدا کیا ہے اور عقائد انہیں اسباب سے بگڑتے ہیں۔ تو جب عقیدہ کا معاملہ آئے تو ان سب چیزوں سے ہٹ کر اللہ کی طرف اور عشق رسول طرف رجوع کرو جو ارشاد خداوندی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد ہے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کریں گے، ہماری عقل اور طبعیت اس قابل نہیں، تو عقائد کا مخزن قرآن کریم یا حدیث نبوی ہے جن سے عقیدہ بنتا ہے۔

عقائد صحیحہ کی پہچان...... اور قرآن کریم میں اگر خلجان پیدا ہو تو حدیث اس کی شرح ہے، حدیث کے سمجھنے میں خلجان پیدا ہو تو صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل اس کی شرح ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو چیز قبول کی اور جو ان کا عمل جاری ہوا اس سے ہم دیکھیں گے کہ اللہ کے رسول کا یہی مطلب ہے ورنہ تو سب سے اول قرآن کریم ہے اس کے بعد حدیث نبوی ہے اس کے بعد تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم ہے حدیث اور تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم سے کٹ کر قرآن کریم میں محض عقل لڑائے تو وہ ہمارا عقلی عقیدہ ہوگا، خدا کا بھیجا ہوا عقیدہ نہیں ہوگا، خدا کا بھیجا ہوا عقیدہ وہی ہے جسے خدا خود فرمائے، اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کی شرح کرے، ان کی شرح صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل و تعامل کردے، تو اول کتاب اللہ، پھر سنت رسول اللہ پھر تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم کا درجہ ہے۔

اور اعمالِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اگر خلجان ہو پھر عام امت کا عمل ہے، یعنی علماء امت اور ربانیوں کا عمل ہے کہ جو دین پہنچانے والے ہیں ان کا طریق عمل کیا رہا ہے؟ محدثین فقہاء، متکلمین وغیرہ یہ حضرات کس چیز پر جمے ہوئے ہیں تو اس سے عقیدہ واضح ہو جائے گا، قرآن نے اجمالاً کہا حدیث نے اس کی شرح کی، فقہ نے تفصیل کی، تعامل صحابہ نے اسے مضبوط بنایا، اور اب امت کے علماء ربانی نے اس کو موکد کر دیا، ان چیزوں سے مل کر عقیدہ بنتا

ہے، ان میں سے ایک چیز کو بھی آپ رکھ دیں، گے تو عقیدہ صحیح نہیں بنے گا، اس واسطے ضرورت پڑے گی کہ عقیدہ درست ہو اور عمل درست ہو۔ خیر بات دور نکل گئی، میں کہنا کچھ اور چاہ رہا تھا، یہ بیچ میں آ گئی۔

بین الاقوامی دین کی علامت...... میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انبیاء علیہم السلام ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی دین لے کر آئے ہیں، اس واسطے قرآن کریم نے ہم پر واضح کیا کہ سارے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لاؤ: ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ ① ”حکم ہے کہ مسلمانوں کو کہہ دو، اعلان کر دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، اور اللہ نے جو ہم پر (قرآن وحدیث) نازل کیا، اس پر ایمان لائے، اور ابراہیم علیہ السلام پر جو صحف نازل ہوئے ان پر بھی ایمان لائے کہ وہ اپنے زمانے میں حق تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی تمام اولاد تو اس میں بنی اسرائیل کے تمام پیغمبر آ گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو نازل ہوا، اور دیگر انبیاء علیہم السلام پر جو نازل ہوا خواہ وہ کسی بھی ملک سے آئے ہوں، ہم سب پر ایمان لاتے ہیں، ہم تفریق نہیں کرتے کہ اس نبی پر ایمان لاؤ اور اس پر نہ لاؤ سب کو ہم اللہ کا فرستادہ سمجھتے ہیں“۔

ظاہر بات ہے کہ تعصب جو پیدا ہوتا ہے وہ شخصیتوں سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ میرا متبع ہے میں اسے مانتا ہوں اور یہ تمہارا متبع ہے میں اسے نہیں مانتا یہیں سے جھگڑا شروع ہوتا ہے، اور جو سارے مقتداؤں کو مانے تو جھگڑا کہاں باقی رہا؟ اسلام نے سارے مقتداؤں کو ماننا بتلایا، تو بین الاقوامی دین اسلام ہی ہو سکتا ہے اگر اسلام یوں کہے کے عرب میں جو پیغمبر آئے ہیں انہیں تو مانو، شام حجاز اور ہندوستان وسندھ میں جو آئیں انہیں مت مانو، یہ تعصب ہوتا۔ یہ بین الاقوامی دین کی علامت نہیں ہوتی، بین الاقوامی دین کے معنی یہ ہیں کہ تعصبات کی جڑ کاٹ دی جائے، تعصب شخصیتوں سے پیدا ہوتا ہے، جب ہم ساری شخصیتوں پر ایمان لائے ہیں، تو ہندوسندھ میں کوئی بھی پیغمبر آئے ہوں، ہمیں نام معلوم ہوں یا نہ ہوں ہم بالاجمال ایمان لاتے ہیں، تو اقوام کے اندر سے غیض اور غصہ نکل جائے گا، غصہ تو جب ہو جب ہم کسی پیغمبر کو برا کہیں، وہ ہم سے لڑے گا، ہمارے پیغمبر کو برا کہے تو ہم لڑیں گے، اگر آنے والا یوں کہے کہ میں تمہارے پیغمبر کو بھی مانتا ہوں اپنا جان کر اور تم میرے پیغمبر کو بھی اپنا جان کر مانو، لڑائی ختم ہو گئی، تو پہلا تعصب شخصیتوں کا ہے، اسلام نے اس کو مٹا دیا یہ علامت ہے کہ وہ بین الاقوامی دین ہے وہ پوری دنیا کے لئے آیا ہے پوری دنیا اس کی طرف متوجہ نہ ہوتی اگر وہ برا بھلا کہتا کہ فلاں جگہ کے نبیوں کو مت ماننا اور ہندوسندھ کے پیغمبروں کو مت ماننا تو سندھ وہند کی اقوام ہم سے الگ ہوتیں، ہم ان سے الگ ہوتے، اور جب سب کو مانا تو کسی کے دل میں غیض نہیں رہا۔ تو یہ بین الاقوامی دین کی علامت ہے۔ اور اگر کوئی یوں کہے کہ میرے

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۶۔

پیغمبر کو مانو اور فلاں جگہ کے پیغمبر کو مت مانا تو یہ تعصب و تنگی اور مقامیت کی علامت ہے۔

ایک یہودی سے گفتگو...... میرا افریقہ جانا ہوا تو ہمیں پرس (یعنی بٹوے) خریدنے تھے۔ اس لئے کہ ہمیں افریقہ سے حجاز مقدس جانا تھا تو احرام میں گھڑی، مسواک کاہے میں ڈالتے، کپڑا تو نہیں پہن سکتے۔ تو ہمارے میز بانوں نے کہا کہ پرس بنانے کی ایک بہت بڑی فیکٹری ایک یہودی کی ہے، وہاں انواع واقسام کے پرس بنتے ہیں آپ وہاں چلیں، بہتر سے بہتر پرس ملے گا، چناں چہ ہم وہاں پہنچے، تو ہمارے میز بانوں نے پہلے جا کے کچھ میرا تعارف کرا دیا کہ ہندوستان سے آیا ہے اور دار العلوم دیو بند کا ذکر وغیرہ، وہ یہودی جوارب پتی تھا، وہ استقبال کے لئے باہر نکلا، بڑی آؤ بھگت کر کے اپنی فیکٹری میں لے گیا۔ خیر اس نے کہا کہ اپنے پرس پسند کر لیں، بعد میں بیٹھ کر بات چیت کریں گے، ہم نے پرس پسند کئے مگر ہم نے کہا کہ ان پرسوں میں جو ہینڈل ہے وہ چھوٹا ہے ہمیں گلے میں ڈالنے کے لئے چاہئے، اس نے کہا میں ابھی بنوائے دیتا ہوں اس نے آرڈر دیا کہ ان کا جو فیتا ہے وہ لمبا کر دو تاکہ گلے میں ڈالنے کے قابل ہو جائے وہ دیدیئے اور کہا کہ وہ بن کر آجائیں گے اتنے میں ہم آپس میں بات چیت کریں، وہ بات چیت ہوتی رہی، اس میں اس نے کہا کہ کوئی مذہب کی بات بتایئے، میں کہا کہ میں مذہب کی کیا بات بتلاؤں آپ اپنے مذہب پر ہیں میں اپنے مذہب پر ہوں۔

﴿ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ﴾ ① کہنے لگے: آپ کچھ کہئے۔ میں نے کہا آپ برا تو نہیں مانیں گے؟ کہنے لگا، بالکل نہیں مانوں گا۔ میں نے کہا: پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ ہمارے دشمن ہیں، ہم آپ کے دوست ہیں۔ کہنے لگا: یہ کیسے؟ میں نے کہا کہ ہم تو آپ کے دوست ہیں۔ اس لئے کہ آپ کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ہم ان کو اپنا پیغمبر جانتے ہیں کہ ذرہ برابر اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان میں گستاخی ہوئی تو آدمی اسلام سے خارج ہو جائے گا، اس لئے جو آپ کے پیغمبر ہیں وہ ہمارے پیغمبر ہیں۔ اس لئے ہم مسلمان بن نہیں سکتے جب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائیں اور آپ یہودی بن نہیں سکتے جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ جھٹلائیں اور یہ نہ کہیں کہ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کہا وہ غلط تھا تو آپ انہیں جھٹلائے بغیر یہودی نہیں بن سکتے ہم تصدیق کئے بغیر مسلمان نہیں بن سکتے، تو ہم آپ کے دوست ہیں آپ ہمارے دشمن ہیں۔ اب وہ بے چارہ چپ ہو گیا۔ چپ ہو کر کہنے لگا کچھ اور کہئے۔ میں نے کہا کہ ہم ایماندار ہیں آپ بالکل ایمان سے خارج ہیں۔ کہنے لگا کہ یہ کیسے؟ میں نے کہا ایمان ماننے کا نام ہے، نہ ماننے کا نام ایمان نہیں ہے، ہم سب کو مانتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی، حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام اور سارے پیغمبروں کو بھی، آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے ہیں نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں تو نہ ماننے والے کا ایمان نہیں ہے ماننے کا نام ایمان ہے، اس لئے آپ ایمان سے خارج ہیں ہم ایمان میں داخل ہیں۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الکافرون: ٦.

کہنے لگا: اور کچھ کہئے ۔ میں نے کہا: اب رہنے دیں ۔ کہنے لگا: کچھ تو کہئے ۔ میں نے کہا: آپ کے اندر عداوت بھری ہوئی ہے، ہمارے اندر محبت بھری ہوئی ہے۔ اس لئے کہ ایمان محبت کا نام ہے۔ جب ہم ایمان لائے تو سارے انبیاء سے محبت رکھتے ہیں۔ آپ کے ہاں نہ ماننے کا نام ایمان ہے اور وہ عداوت کا سرچشمہ ہے، اس واسطے آپ عداوت سے بھرپور ہیں ہم محبت سے بھرپور ہیں۔

کہنے لگا! بس کافی ہوگیا، اب زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، اب میں بات چیت کرنے کو برا مانوں گا۔ تو حقیقت یہی ہے کہ ایمان ماننے کا اور محبت کا نام ہے، مومن وہی ہے جو سارے اللہ والوں کو مانے، وہ مومن نہیں ہے جو بعض انبیاء علیہم السلام کو مانے اور بعض کو نہ مانے، مومن وہی ہے جو سارے اولیائے کرام کا نام عظمت سے لے، ان کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دے، بعض اولیاء کو مانے اور بعض کو نہ مانے بعض کی تکفیر کردے اور بعض کو مومن مانے، حقیقت میں یہ شخص محبت سے خالی ہے۔

بہرحال ایمان ماننے اور محبت کا نام ہے۔ اور ایمان توکل اور بھروسہ کرنے کا نام ہے، تو اللہ پر بھروسہ اور انبیاء علیہم السلام کا ماننا اور ان کی اطاعت میں سرگرم رہنا، اور اطاعت بھی اس طرح کہ عقیدہ بھی درست ہو ایک ہی کو کرتا دھرتا مانے اور عمل بھی درست ہو کہ ہر موقع پر ایک ہی کی طرف توجہ ہو۔

بین الاقوامی دین کی دوسری علامت...... اور جو کچھ میں نے عرض کیا کہ صبح کو بھی اللہ کی طرف متوجہ۔ گھر سے نکلتے وقت نماز کے وقت بھی اللہ کی طرف متوجہ۔ یہ سارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اعمال ہیں، آپ سے ہی یہ ساری دعائیں منقول ہیں کہ جب آپ گھر میں داخل ہوتے تو یہ دعاء پڑھتے اور جب گھر سے خارج ہوتے تو یہ دعاء پڑھتے مسجد میں جاتے تو یہ دعاء پڑھتے، تو مقصود اس سے یہی ہے کہ انسان کے قلب میں صرف ایک ذات سے محبت و تعلق ہونا چاہئے ایک ہی کی طرف دھیان اور لگاؤ ہو۔

اور ایک سے تعلق رکھنا جب انفرادی طور پر آسان ہے ایسے ہی اجتماعی طور پر آسان ہے ایک ہی کی ذات کی نسبت سے دنیا کے تمام انسان ایک لڑی میں آسکتے ہیں شخصیت وطن رنگ و نسل کی نسبت سے اجتماعی وحدت پیدا ہونا ممکن نہیں اور جب تک اجتماعی وحدت نہ ہو ان امور کے لحاظ سے دین بھی مختلف ہوتا رہے تو کبھی بھی دین میں بین الاقوامیت نہیں آسکتی بین الاقوامی دین وہی ہوسکتا ہے جو رنگ و نسل اور شخصیت و وطن کے بتوں کو پاش پاش کردے اور ان سب چیزوں سے وراء الوراء کسی ایسی مقدس ذات سے انسان کو جوڑے جو سب کے لئے قابل قبول ہو اور وہ ذات اقدس اللہ رب العزت کی ذات ہی ہوسکتی ہے، اللہ رب العزت کی حقیقی پہچان اسلام دیتا ہے تو اسلام ہی بین الاقوامی دین ہوسکتا ہے کوئی اور دین نہیں ہوسکتا۔

بین الاقوامی دین کی تیسری علامت...... بہرحال اسلام نے شخصی تعصب کو بھی ختم کیا اور سب کو ماننے کا حکم دیا۔ اسی طرح وطنی تعصب کو بھی ختم کیا۔ تا کہ اس کی بین الاقوامیت ہر پہلو سے واضح ہوجائے اور اس پر کوئی حرف

نہ آسکے۔ چنانچہ اگر کوئی یوں کہے کہ میرا وطن بہت عمدہ ہے تمہارا وطن گھٹیا خواہ مخواہ جذبات کو مشتعل کرتا ہے کہ میرے وطن کو برا کہہ دیا اور اپنے وطن کو اچھا کہا میری زمین کو برا کہا، اپنی زمین کو اچھا کہا۔ تو اس سے آدمی میں وطنی تعصب پیدا ہوتا ہے کہ میری زمین ایسی اور تمہاری زمین گندی۔ اس سے بھی قوموں میں لڑائیاں پیدا ہوتی ہیں، زمین کے ٹکڑے بھی لڑائیاں کرا دیتے ہیں، اس تعصب سے بھی کبھی عقیدے اور مذہب میں خلل پڑتا ہے کہ میری زمین سے جو مذہب اگا ہے وہی مذہب ہے تمہاری زمین پر جو مذہب اگا ہے وہ ہمارا مذہب نہیں ہے۔ بھلا مذہب کو بھی گیہوں چنے کی طرح پیدا وار سمجھ لیا تو اس سے ایک تعصب پیدا ہوتا ہے۔

اس لئے اسلام نے ہم وطنوں کی بھی تقدیس کی، احادیث کو آپ دیکھیں یمن، شام کی مدح فرمائی گئی، حجاز کی فضیلت بیان کی گئی ہندوستان کے مناقب الگ بیان کئے ہند اور سندھ کے بارے میں بھی تعریفی کلمات فرمائے گویا ملک کی تقدیس کی اور ہر ملک کی خوبی بیان کی تو اسلام نے وطنیت کی جڑ نکال دی یہ مذہب کی تفریق کا ذریعہ بنتی تھی، جب سارے ملک ایک ہو گئے۔

ہر ملک ملکِ ما است کہ ملکِ خدائے ما است

ہر ملک ہمارا ملک ہے کہ ہمارے خدا کا ملک ہے اور خدا سب کا ایک ہے تو ہمارے سارے وطن! تو تعصب کہاں سے پیدا ہوگا؟ لڑائی کیسے پیدا ہوگی؟ تو اسلام نے جب وطنوں کی تعریف کی، معلوم ہوا اسلام بین الاقوامی مذہب ہے اور بین الاوطانی مذہب ہے ورنہ یوں کہتا کہ صاحب! عرب کی زمین میں جو فضیلت ہے نہ وہ ہندوستان میں ہے نہ یمن میں نہ شام میں، ان ملکوں کے آدمیوں سے ہمیں کوئی تعلق نہیں۔

افضلیت کا بین الاقوامی معیار...... ہم تو عرب کے لوگوں کو جانتے ہیں۔ بلکہ یہ فرمایا دیا گیا: ''لَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ فَضْلٌ اِلَّا بِالدِّيْنِ وَتَقْوٰى'' ① ''کسی بھی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے، فضیلت ہے تو تقویٰ، پارسائی اور پاکدامنی سے ہے۔'' کہیں کا رہنے والا ہو جو متقی ہوگا وہ اللہ کے ہاں معظم اور مکرم ہے جو تقویٰ نہیں اختیار کرے گا خدا سے نہیں ڈرے گا، پاکدامن پارسا نہیں بنے گا وہ اللہ کے ہاں محبوب نہیں چاہے وہ عرب ہی کا رہنے والا ہو، تو وطنیت کی جڑ نکال دی، سارے وطنوں کو اپنا وطن کہا۔ یہ دلیل ہے کہ اسلام بین الاقوامی دین ہے کوئی مقامی مذہب نہیں ہے کہ ایک زمین سے نکلا تو اس زمین والوں کے لئے ہے دوسری زمین والوں کے لئے نہیں ہے، تو شخصیت کا تعصب مٹایا، وطنیت کا تعصب بھی مٹایا۔

بین الاقوامی دین کی چوتھی علامت...... کبھی رنگ سے تعصب پیدا ہو جاتا ہے جیسے افریقہ میں ہو رہا ہے کہ وہاں کالے اور گورے کی بڑی سخت تفریق ہے کالوں کی گاڑیاں الگ اور گوروں کی الگ کالوں کی بسوں میں

① مسند الحارث زوائد الهيثمي، باب التبليغ، ج: ۱، ص: ۳۴۸، رقم: ۵۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۳ ص: ۲٦٦.

گورے اور گوروں کی بسوں میں کالے نہیں بیٹھ سکتے، گوروں کے لئے عالی شان اسٹیشن ہے اور کالوں کے لئے ایک معمولی ساویٹنگ روم بنا ہوا ہے، گورے ادھر نہیں آسکتے کالے ادھر نہیں جاسکتے ہوائی اڈے پر جو اعلیٰ ترین حصہ ہے وہ گوروں کا ہے اور ایک معمولی ہال بنا ہوا ہے اس میں کالے بیٹھتے ہیں تو اس تفریق کی وجہ سے ایک خاص تعصب وہاں پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ کالے گوروں کے اور گورے کالوں کے دشمن بنے ہوئے ہیں، کالوں کے بس میں آجائے تو گوروں کو گولی سے اڑادیں اور گوروں کے بس میں آجائے تو کالوں کو ختم کردیں تو رنگ کی وجہ سے تعصب پیدا ہو گیا۔ مگر اسلام نے اس تعصب کو مٹادیا اور ارشاد فرمایا: ”بُعِثْتُ اِلَی الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ“ ”میں کالے اور گورے سب کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں“ ①

کالے بھی میرے ہیں گورے بھی میرے ہیں، جو میرے خدا کا حکم مان لے وہ میرا ہے۔ چاہے وہ کالے رنگ کا ہو چاہے وہ گورے رنگ کا ہو۔ تو گورے اور کالے رنگ کا فرق مٹایا۔ اور شخصیتوں کا فرق الگ مٹایا، یہی تو اس دین کے بین الاقوامی ہونے کی علامت ہے۔ اگر زمین کے ساتھ مقید ہوتا تو مقامی دین ہوتا، شخصیتوں کے ساتھ مُقید ہوتا تو شخصی دین ہوتا، رنگ کے ساتھ مقید ہوتا تو رنگین دین بنتا، لیکن رنگ، وطن اور شخصیتوں سے بھی بالا تر ہے تو یہ اس کی علامت ہے کہ پورے عالم کے لئے یہ مذہب ہے اس لئے یہ فرمایا گیا کہ: ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ پہلے تو یہ کہو کہ جتنے بھی انبیاء ہیں ہم سب پر ایمان لائے، ان انبیاء پر جو کتابیں نازل ہوئیں ان سب پر ہم ایمان لائے اپنے اپنے وقت میں وہ سب حق تھیں، اگر برائی پیدا کی تو اقوام نے پیدا کی، انبیاء اور کتابیں اس سے بری ہیں، تغیر اور تبدل اقوام نے کیا ہے۔ پھر یہ انبیاء علیہم السلام سارے وطنوں میں آئے جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ ② ﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ﴾ ③

تو جن رسولوں پر ہم ایمان لائے، جب وہ ہر وطن میں ہیں تو سارے وطن ہمارے نزدیک مقدس ہیں، جس وطن میں پیغمبر آئے ہم کہیں گے وہ وطن ہمارے نزدیک مقدس ہے، وہاں بھی اللہ والے ہیں، جب ہم کسی وطن کو برا نہیں کہیں گے، سارے وطنوں کی خوبیاں ہمارے ذہن میں ہیں، تو معلوم ہوا کہ اسلام سارے وطنوں کے لئے ہے کسی ایک وطن کیلئے نہیں ہے وہ سارے افراد بنی آدم کے لئے ہے کسی ایک شخص کے لئے نہیں ہے کسی ایک قوم کے لئے نہیں ہے وہ سارے رنگوں کو اپنا کہتا ہے تو اس میں کالے گورے کی کوئی تمیز نہیں تو جس میں یہ تفریقیں مٹ جائیں، سمجھو کہ وہ مذہب بین الاقوامی ہے جہاں یہ تفریقیں موجود ہیں سمجھو کہ وہ مقامی مذہب ہے، وطنی مذہب ہے، تو کسی دوسرے کو حق نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے وطن میں جاکے داخل ہو۔ یہ حق تو بین الاقوامی مذہب کو ہے کہ وہ ساری دنیا میں پھیلے۔

بین الاقوامی دین ہونے کا معیار...... یہ میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ دھڑے بندی مت کرو ایک اللہ کی

① مسند الرویانی، حدیث ابی موسیٰ رضی الله عنه: ۱/ ۳۲۱ رقم ۴۸۵۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے: ارواء الغلیل، اول الکتاب ج: ۱ ص: ۳۱۶۔ ② پارہ: ۱۳ سورۃ الرعد، الآیۃ: ۷۔ ③ پارہ: ۱۱ سورۃ یونس، الآیۃ: ۴۷۔

طرف متوجہ ہو کر یہ کوشش کرو کہ اللہ کا پیغام سند کے ساتھ ہمیں کہاں ملے گا۔ اس لئے کہ دین نقلی ہے اور نقل کے لئے روایت کی ضرورت ہے اور روایت کے لئے سند کی ضرورت ہے تو سند تلاش کرو مقصد یہ کہ سندی اور تاریخی طور پر کون سا دین پیغمبر تک پہنچتا ہے اور بیچ میں پہنچانے والوں کو، سب کو ہم پہچانتے ہوں کہ یہ اس کا راوی ہے یہ اس کا راوی تو سند کے ساتھ جو دین پیغمبر تک پہنچ جائے وہ واجب الاعتقاد ہوگا، جس کی سند نہ ہو گویا قصے اور کہانی کے طور پر آ رہا ہے، ہوسکتا ہے اس میں غلطیاں داخل ہوگئی ہوں، ہوسکتا ہے اس میں کچھ برائیاں داخل ہوگئی ہوں۔ لیکن سند کے ساتھ جو چیز آئے گی اس میں برائی نہیں آسکتی۔ قرآن کو یا حدیث کو دیکھو ایک ایک آیت کی سند پیغمبر تک پہنچی ہوئی ہے مثلاً اگر میں یوں کہوں کہ میں نے قرآن کریم حضرت قاری عبدالوحید خاں صاحب مرحوم سے حفظ کیا، انہوں نے قاری عبدالرحمٰن صاحب مرحوم سے حفظ کیا انہوں نے قاری عبداللہ صاحب مرحوم سے، قاری عبداللہ صاحب نے قاری محمود صاحب مصری سے اور قاری محمود صاحب نے اپنے استاذ سے اور اس طرح سند میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دوں پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن جبریل علیہ السلام سے پہنچا اور جبریل امین کے قلب میں حق تعالیٰ شانہ نے القاء کیا گویا ایک حافظ کی سند حق تعالیٰ شانہ تک پہنچی ہوئی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ دنیا میں شاید کوئی مذہب اس طرح سند نہیں پیش کر سکے گا، اگر انجیل والوں سے پوچھو کہ یہ انجیل کہاں سے آئی تمہارے استاذ کون ہیں، ممکن ہے ایک دو اساتذہ تک بتلا دیں۔ آگے غائب، یہودیوں سے پوچھو کہ تورات لانے والے کون ہیں راوی کون کون ہیں؟ تاریخ ندارد ہے کیا خبر کسی نے کیا تصرف کیا۔ زیادہ کیا یا کم کیا۔ جب سندی دستاویز نہیں تو تصرفات ہوسکتے ہیں تو سب سے پہلے دیکھنے کی چیز تاریخ اور سند متصل ہے کہ اللہ تک ملی ہوئی ہو تو قرآن و حدیث کے سوا ہم انصافاً کہتے ہیں کہ کوئی سند ملی ہوئی نہیں۔ اس کی رو سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انجیل بھی حق ہے۔ اگر قرآن نہ بتلائے تو ہمیں خبر نہیں تھی کہ انجیل حق ہے یا نہیں قرآن نے کہا کہ تورات حق ہے تو سند صحیح کے ساتھ معلوم ہوا کہ واقعی حق ہے۔ تو اسلام نے سند متصل کے ساتھ پیغمبروں کا پتہ دیا۔ ہم نے مانا، ایمان لائے۔

تو اصل چیز ایمان لانے کی سند ہوتی ہے۔ اگر آج حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبری ماننے کے قابل ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری زیادہ ماننے کے قابل ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ نے معجزے نازل کئے کہ ہاتھ گریبان سے نکالا تو سورج کی طرح روشن۔ اور عصا پھینک دیا تو اژدھا بن گیا اور یہ ان کی نبوت کی دلیل ہے تو اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں معجزے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے عطا کئے۔ آپ کی انگشتان مبارک سے چشمے پھوٹ پڑے اور چودہ سو آدمیوں نے اپنے مشکیزے بھر لئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارے سے چاند شق ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے لئے عرش تک پہنچایا گیا۔ پتھروں نے آپ سے سلام کیا۔ درندوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت دی کہ: "اَشْهَدُ اَنَّکَ رَسُوْلُ اللّٰهِ" ایسی روایات سند متصل کے ساتھ اور نقل صحیح کے ساتھ موجود ہیں، جن کی سند ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا سکتے ہیں، مسلمانوں نے

پچاس ہزار آدمیوں کی جو حدیث کی روایت کرنے والے ہیں ان کی تاریخ مرتب کردی کہ یہ ان کا کیریکٹر تھا، یہ ان کا خاندان تھا، یہ ان کی نسل تھی، یہ ان کی سچ اور جھوٹ کی کیفیت تھی، ایک ایک چیز جمع کی۔ تو آج جس سند سے ہم روایت کریں گے اس سند کے ایک ایک فرد کی تاریخ بھی بیان کرسکیں گے کہ ہمارے استاد یہ تھے تو ان کی یہ شان تھی، ان کے استاد یہ تھے تو ان کا یہ کردار تھا، اسی طرح آگے سلسلہ ہے اس طور پر پچاس ہزار آدمیوں کی تاریخ مرتب ہے جن سے قرآن وحدیث ہم تک پہنچا تو سب سے پہلی چیز سند و روایت ہے، تو قرآن کی سند سے بڑھ کر کوئی سند نہیں۔ اور کتابوں کی ہم سند ہی نہیں پاتے۔ قرآن حکیم کی سند کے ہر ایک کے زمانے میں لاکھوں افراد موجود ہیں، جنہوں نے قرآن کریم حفظ کیا اگر معاذ اللہ کوئی قرآن کریم کو دریا برد بھی کردے تو منٹ بھر میں پھر لکھا جائے گا ہزاروں لاکھوں حفاظ موجود ہیں: ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ① ”اللہ نے یہ آیتیں اہل علم کے سینے میں محفوظ کردی ہیں“۔

اگر صندوقوں میں قرآن محفوظ ہوتا تو صندوقوں کو دریا میں بہایا جاسکتا تھا۔ زمین میں دفن کرتے تو زمین اس کو گلا دیتی۔ ہوا میں رکھتے تو ہوا کاغذوں کو اڑا دیتی۔ اللہ نے ایسی جگہ حفاظت کی کہ نہ وہاں آگ جاسکے نہ پانی نہ مٹی اور وہ اہل علم کے قلوب ہیں، ان میں محفوظ ہے اسی طرح وہاں شیطان اور جن بھی نہیں جاسکتے، تو قرآن کی حفاظت یہ ہے کہ ایک وقت میں لاکھوں حفاظ موجود ہیں، حدیث کی حفاظت یہ ہے کہ ایک ایک ٹکڑے کے لئے اللہ کے رسول تک سند موجود ہے۔ تو اتنا مستند کلام تو معتبر نہ ہو اور جس کی کوئی سند نہ ہو وہ معتبر ہو جائے؟ اگر وہ ماننے کے قابل ہے تو سب سے پہلے یہ ماننے کے قابل ہے۔ اگر حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لانا ضروری ہے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ان سے زیادہ ضروری ہے۔ جو وہاں دلائل ہیں ان سے بڑھ کر یہاں دلائل موجود ہیں اس لئے اسی دین کو اختیار کرنا چاہئے۔

فکرِ فردا...... ایسے دین کے ہوتے ہوئے ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنی موت اور آخرت دیکھ کر آخرت کو سیدھا کرے، دین کا بڑا کام یہ ہے کہ آخرت درست کرے، اس لئے کہ مرنا مجھے بھی ہے، تمہیں بھی۔ یہ سارے قصے یہیں ختم ہو جانے والے ہیں، نہ کوئی بوڑھا باقی رہے گا، نہ کوئی جوان، بالآخر اسی پروردگار کے آگے جانا ہے جس نے پیدا کیا ہے اور جہاں سے ہم آئے ہیں: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ﴾ ② جس نے ہماری ابتداء کی ہے اسی کی طرف ہماری انتہا بھی ہے، وہی مبدا بھی ہے وہی معاد بھی ہے وہیں سے چلے ہیں وہیں لوٹ کر جانے والے ہیں، تو جب ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ ہمیں اللہ کے آگے کھڑا ہونا ہے، ایک ایک چیز کا حساب دینا ہے، تو آدمی غور کرے اور سمجھے کہ میں وہاں کے لئے تو کچھ سامان کروں۔ اور وہاں کا سامان روٹی کا ٹکڑا تو ہے نہیں؟ وہ دین ہی ہوسکتا ہے تو دین وہ ہو جو مستند ہو سند متصل کیساتھ پیغمبر تک پہنچا ہوا ہو، جس پر آدمی یقین کرسکے کہ یہ دین ہے۔ تو غور و

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹. ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۷.

فکر کرنا ہم سب کا فرض ہے خواہ ہندو ہو یا مسلمان ہو۔ ہر ایک کو اس کے ہاں جانا ہے اور ہر ایک کو اس سے ملنا ہے۔
اور موت کا کوئی وقت ہمیں تو معلوم نہیں۔ خدا جانے کب آ جائے، یہ تو اللہ ہی کے علم میں ہے۔ یہ خیال کرنا کہ ابھی تو جوانی ہے، بڑھاپا جب آئے گا دیکھی جائے گی۔ ابھی تو ہم تندرست ہیں بیماری آئے گی تو دیکھی جائے گی، کیوں کہ موت تو بیماری سے آتی ہے۔ تو بھئی! موت کے لئے نہ بڑھاپا شرط ہے نہ بیماری شرط ہے نہ بچپن شرط ہے، بوڑھے بچے جوان سبھی مرتے ہیں تندرست بھی مرتے ہیں مریض بھی مرتے ہیں۔ بعضوں کے ہارٹ فیل ہو جاتے ہیں۔ اچھے بھلے تندرست ہوتے ہیں مگر منٹ بھر میں ختم ہو جاتے ہیں تو یہ شیطانی دھوکہ ہے کہ جب بڑھاپا آئے گا تو بہ کر لیں گے اور غور کر لیں گے کیا خبر ہے بڑھاپا آئے گا بھی یا نہیں؟ کیا پتہ پہلے ہی چلتے بنیں۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں جوان زیادہ مرتے ہیں۔ بوڑھے کم مرتے ہیں، زیادہ موت جوانوں کو آتی ہے بوڑھوں کو نہیں۔ اس لئے کہ آپ مجمعوں پر نگاہ ڈالیں تو بوڑھے کم نظریں پڑیں گے جوان زیادہ نظر آئیں گے، یہ اس کی علامت ہے جوان زیادہ مرتے ہیں اس لئے اگر سارے بوڑھے ہو کر مرا کرتے تو بوڑھے مجموں میں زیادہ نظر پڑتے مگر وہاں جوان زیادہ نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپے تک پہنچ ہی نہیں پاتے، پہلے ختم ہو جاتے ہیں تو نوجوانوں کو زیادہ موت آتی ہے، بوڑھوں کو کم آتی ہے، بڑھاپے تک لوگ کم پہنچتے ہیں، غرض اس دھوکہ میں آپ نہ رہیں کہ جب بڑھاپا آئے گا جب سوچ لیں گے، جب بیماری آئے گی جب سوچ لیں گے، موت کی جب علامتیں شروع ہوں گی جب سوچ لیں گے۔ وہ تو یکدم آ جاتی ہے، کھڑے پیر آ جاتی ہے۔

درپیش منزل...... تین پیغمبر ہیں جن کو اچانک ہی موت واقع ہوئی ہے، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت یوسف علیہم السلام تینوں کی موت اچانک ہوئی ہے تو جب انبیاء علیہم السلام اس دنیا سے اچانک گزر سکتے ہیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ ہم کس چیز پر غرہ کریں؟ بہر حال موت کے لئے ظاہری علامت ضروری نہیں کئی آدمی بیٹھے بیٹھے گزر گئے۔ ہزاروں واقعات اس قسم کے ہیں۔ اس لئے جب سب کو یہ منزل درپیش ہے تو سب کو اس کی فکر کرنی چاہئے، اور اپنے ضمیر سے سوچنا چاہئے۔

دینِ حق کی آسان پہچان...... آدمی کا دل بڑا مخلص ہوتا ہے۔ دل منافق نہیں ہوتا۔ دل آدمی کو صحیح مشورہ دیتا ہے ادھر ادھر کے دوست غلط مشورہ بھی دے دیں مگر دل مطمئن نہیں ہوتا، جب تک آپ صحیح بات سوچ کر سامنے نہیں رکھ دیں گے اس لئے اپنے ضمیر سے سوچیں اور غور کریں کہ دینوں کے اندر واقعی کون سا دین حق ہے، سند اور روایت کے لحاظ سے کون سا دین حق ہے، تعلیمات کے لحاظ سے دیکھو تو کس کی تعلیم زیادہ ستھری، منقّٰی اور ممتاز تعلیم ہے کہ حق و باطل اس میں نکھرا ہوا ہے۔ اور جب ذہن میں آ جائے اور دل گواہی دے تو فوراً آدمی کو قبول کرنا چاہئے، پھر اس پر نہ رہے کہ قوم کیا کہے گی۔ اور میرے رشتہ دار کیا کہیں گے۔ وہاں نہ رشتہ دار کام آئے گا نہ قوم کام آئے گی۔ وہاں تو اپنا دین اور عمل کام آئے گی۔ اور اللہ کے آگے تو تنہا پہنچنا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں

فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ﴾ ① ''حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ آ گئے تم تن تنہا ہمارے پاس جیسے ہمارے پاس سے تنہا گئے تھے، کیوں کہ تمہارے پیدا ہونے میں کوئی شریک نہیں تھا۔ ہم نے تنہا بھیجا اور تم تنہا پہنچے۔ آج اسی طرح ہمارے پاس آئے ہو جیسے ہم نے پیدا کیا تھا اور جن چیزوں پر تم نے بھروسہ کر رکھا تھا، انہیں اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ جن کو تم نے دوست سمجھ رکھا تھا، کہ یہ ہمیں بخشوالیں گے۔ (ان سب کو پیچھے چھوڑ آئے ہو؟) آج ہم تمہارا کوئی سفارشی نہیں دیکھتے۔ کوئی مددگار نہیں دیکھتے، جن کو تم یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے شریک ہیں جو اللہ کے ساتھ مل کر ہمیں نجات دلائیں گے۔ آج وہ تمہارے شفیع اور سفارشی کہاں ہیں؟ وہ سب امیدیں تمہاری قطع ہو گئیں۔ اور جو کچھ تم نے سوچ رکھا تھا وہ سب گنبد سرا ہو گیا''۔

اس لئے میری گزارش یہ ہے کہ دین کے بارے میں آدمی اپنے ضمیر سے غور کر لے، اپنے دل سے مشورے اپنی موت اور اپنی آخرت کو سامنے رکھ کر سوچے یہ سامنے رکھ کر نہ سوچے کہ میرے ساتھ سامان کتنا ہے، میرے ساتھ مشورہ دینے والے کتنے ہیں؟ میرے عزیز کتنے ہیں؟ یہ کوئی نجات دلانے والے نہیں، نہ کوئی ساتھ جانے والا ہے، ضمیر ساتھ جائے گا۔ اعتقاد اور ایمان ساتھ جائیگا۔ عمل ساتھ جائے گا اسی لئے انہیں کو اپنے ساتھ رکھو۔

حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ...... حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہیں اور خلیفہ بھی ہیں، بزرگوں سے میں ہیں۔ حضرت شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تینتیس (۳۳) برس رہے وہیں تربیت پائی اور تعلیم باطن حاصل کی۔ تینتیس برس کے بعد شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ تینتیس برس میرے پاس رہے تم نے کیا حاصل کیا؟ عرض کیا کہ میں نے آٹھ مسئلے سیکھے ہیں: فرمایا کہ کل آٹھ مسئلے؟ عرض کیا جی ہاں کل آٹھ مسئلے! فرمایا کہ میرا بھی وقت ضائع کیا اپنا بھی وقت ضائع کیا۔ بندۂ خدا تینتیس برس میں کل آٹھ مسئلے؟ فرمایا: آخر وہ آٹھ مسئلے کیا ہیں؟ عرض کیا کہ:

انتخاب محبوب...... پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں نے دنیا میں دیکھا کہ ہر ایک کو کسی نہ کسی سے محبت ہے اور وہ اپنے محبوب کی فکر میں ہے کہ وہ مجھ سے راضی ہو اور میں اس سے مل جاؤں مجھ میں اور اس میں جدائی اور فراق نہ ہو۔ لیکن مرنے کے بعد یہ سارے محبوب جدا ہو جاتے ہیں۔ نہ کوئی محبوب قبر میں ساتھ جاتا ہے، جس سے محبت کی تھی نہ وہ دستگیری کرتا ہے اس واسطے میں نے قرآن کریم میں یہ دیکھا کہ عمل آدمی کے ساتھ جاتا ہے تو میں نے اعمال صالحہ کے ساتھ محبت کی، اور سب سے محبت ترک کر دی تا کہ میرا محبوب قبر میں بھی میرے ساتھ رہے اور الگ نہ ہونے پائے۔

تو ایک مسئلہ تو میں نے یہ سیکھا ہے کہ سارے محبوب چھوڑ کر ایک عمل صالح کو محبوب بنا لیا ہے، اس لئے کہ کوئی

---

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۴۔

محبوب قبر میں ساتھ نہیں جائے گا، نہ بیوی نہ دوست نہ بچہ، عمل آدمی کے ساتھ جائے گا، اس لئے اس کو محبوب بنالیا اور سارے محبوبوں کو ترک کر دیا۔

تعیینِ دشمن...... دوسرا میں نے یہ دیکھا کہ دنیا میں ہر ایک کو کسی نہ کسی سے عداوت بھی ہے اور وہ اس سے بچنے کی کوشش اور فکر میں رہتا ہے۔ اور دوسرا اس کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہتا ہے تو آپس میں دشمنی ٹھن جاتی ہے، لیکن سارے دشمن ایک دن ختم ہو جاتے ہیں اور پھر یہ تن تنہا رہ جائے گا، اب کس کی دشمنی سے آدمی بچے، فوج سے بچے، سپاہی سے بچے، بچھو سے بچے، سانپ سے بچے، سارے دشمن ہی دشمن ہیں تو بچنے میں مشکل ہوگی۔ ہزاروں دشمن ہیں اور آدمی کا دل ایک ہے تو بچنے کے لئے کہاں کہاں جائے؟۔ تو میں نے قرآن کریم دیکھا۔ اس میں ہے کہ: ﴿إِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ ① ''شیطان تمہارا دشمن ہے جو اخیر تک دشمنی کرے گا''۔

تو میں نے ایک سے دشمنی بنا کے سب سے دشمنی قطع کر لی، تو میں شیطان سے لڑتا ہوں اس سے لڑوں گا تو سب دشمن ختم ہو جائیں گے، ساری دشمنی کی بنیاد، شیطان ہی ہے۔ لہٰذا میری کسی سے دشمنی نہیں، کسی سے عداوت نہیں تو دوسرا مسئلہ میں نے یہ سیکھا۔

با اعتماد ذات...... تیسرا مسئلہ یہ ہے میں نے دیکھا کہ دنیا میں ہر ایک نے کسی نہ کسی پر سہارا کر رکھا ہے، کسی نے روپے پر سہارا کر رکھا ہے کہ میرے گھر میں دولت ہے جو چاہوں گا کروں گا۔ کسی نے غلّہ پر سہارا کر رکھا ہے، کسی نے حکومت پر سہارا کر رکھا ہے، کسی نے رشتہ دار پر سہارا کر رکھا ہے میں نے قرآن کریم میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ سارے سہارے ختم ہو جائیں گے صرف ایک اللہ کا سہارا ہے جو باقی رہے گا۔ ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ ② ''جو اللہ پر بھروسہ کرے اللہ اس کے لئے کافی ہے''۔

تو میں نے ایک کو سہارا بنایا، باقی سہاروں کو ترک کر دیا۔ تو یہ میں نے تیسرا مسئلہ سیکھا۔ اسی طرح سے انہوں نے اور مسائل بیان کئے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ ایک کو اپنا سہارا بنالو، ایک کو معبود بنالو، پھر اسی کی طرف جھکو، دنیا کی عداوت بھی چھوڑو، دنیا کی محبت بھی چھوڑو اگر محبت کرو تو اللہ کے لئے عداوت باندھو، تو اللہ کیلئے، جس کا مطلب یہ ہے کہ محبوب تمہارا ایک ہی ہے اور مبغوض شیطان ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دشمن سمجھو، اس سے دشمنی ٹھان لو۔ اللہ سے دوستی کر لو اور اپنے ضمیر سے فیصلہ کر لو۔ تو مطلب یہ ہے کہ دین اور آخرت کی بات آدمی کو تنہا سوچنی ہے، اس میں کوئی سہارا نہیں خود اپنے ضمیر سے فیصلہ کر لو۔ اپنے دل سے سوچ لو اور خوب چھان بین کر لو، جب حق واضح ہو جائے۔ علی الاعلان اس کو مان لو یہ نہ دیکھو کہ کون کیا کہے گا؟ کون کیا کہے گا؟ کہنے والے کہا ہی کرتے ہیں ان کی باتوں کا قطعی دھیان نہ کیا جائے، اپنے ضمیر کی آواز کو دیکھا جائے۔

صاحب دور کا اتباع مدار نجات ہے...... تو قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ: تم اپنے ایمان کو مضبوط کرو۔ ایمان کو

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ٦. ② پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۳.

تعصبات میں دخل نہ دو۔ نہ شخصیتوں کے تعصبات کو، نہ رنگ و بو کے تعصبات کو، نہ زمین کے ٹکڑوں کے تعصبات کو نہ وطن اور قوم کے تعصبات کو، صرف ایک اللہ پر بھروسہ کرو، ایک نبی کی بات کو مانو، کہ اس دور میں صرف انہی کے ماننے میں نجات منحصر ہے، جس کا دور اور زمانہ ہوگا اسی کے ماننے پر نجات منحصر ہے۔ یا کوئی یوں کہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہوں اور نجات ہو جائے گی، یہ غلط ہے، صاحب زمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ان کا دور ہے، ان کے ماننے میں نجات ہے، دوسروں کے ماننے میں نجات نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: ''لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا لَمَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِىْ'' ''آج اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہو کر آئیں گے تو میری اتباع کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔''

ان کی نجات بھی میرے ہی دین کے ماننے میں ہے۔ اس لئے کہ میں صاحب وقت اور صاحب زمان ہوں، میری شریعت کا دور دورہ ہے آج پریزیڈنٹ وقت فخر الدین علی احمد ہیں، ہندوستان کا قانون ان کے دستخطوں سے جاری ہو رہا ہے۔ آج پچھلے لوگ صدر نہیں اگر ان سے کوئی زندہ بھی ہوا اور کوئی یوں کہے کہ میں اس قانون کو مانتا ہوں جو پچھلے صدر کے زمانے میں جاری ہوا۔ اور ان کے قانون کو نہیں مانتا تو وہ باغی سمجھا جائے گا اس کو پھانسی کی سزا ہوگی، کہا جائے گا کہ آج ان کا دور ہے انہی کے قانون میں نجات ہے۔ آج کسی اور صدر کا قانون نہیں چلے گا۔

یا کوئی سابقہ صدر یوں کہے کہ میں چوں کہ پریزیڈنٹ رہ چکا ہوں اب بھی میرا وہی مقام ہے، میں چاہے کسی کی مانوں چاہے نہ مانوں۔ میں اب بھی پریزیڈنٹ ہوں، گورنمنٹ مقدمہ کرے گی کہ آج کا پریزیڈنٹ فخر الدین علی احمد ہے آج تم نہیں ہو، تمہیں ان کا اتباع کرنا پڑے گا، جو وہ قانون دیں تمہیں ماننا پڑے گا۔ اب تمہاری صدارت کا زمانہ نہیں ہے۔ تو جو صاحب دور اور صاحب زمان ہوتا ہے اس کے ماننے میں نجات منحصر ہوتی ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور مبارک جب آ گیا اور آپ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ نے شریعت اور قانون لاکے رکھا تو آج نجات اسی کے ماننے میں منحصر ہے۔ آج کوئی کہے کہ میں تورات کو مانتا ہوں یا کہے انجیل کو مانتا ہوں نجات نہیں ملے گی، ان کا دور ختم ہوا۔ آج کا دور قرآن کا ہے۔ اسی کے ماننے میں نجات منحصر ہے۔ بہر حال اس آیت سے یہ مسئلہ نکلا کہ سات سوبات میں دخل مت دو ایمان قبول کرو ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ ''ہم ان میں تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں۔ ہم سب کے مطیع اور فرمانبردار ہیں''۔ ہم سب کے بارے میں تسلیم و رضا اختیار کرتے ہیں۔

انکارِ قرآن تمام کتب کے انکار کو مستلزم ہے...... اور یہ ہمیں کس نے منوایا؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے، آپ کا ماننا سب سے پہلے ہے۔ آپ کو ماننا سب کو ماننا ہے۔ قرآن کو مانا تو انجیل اور تورات کو بھی مانا۔ زبور کو بھی مانا۔ قرآن کریم کا انکار کیا تو کسی چیز کو بھی نہ مانا۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی تو سند صحیح موجود ہے اور تورات و انجیل کی سند موجود نہیں۔ یہ تو قرآن کریم نے بتلایا کہ یہ آسمانی کتابیں ہیں اس لئے قرآن کے ذریعے ان

کو بھی مانیں گے، اس لئے قرآن کریم نے فرمایا: ﴿وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾

قرآن کریم تمام کتب سماویہ کا محافظ...... قرآن کریم تمام پچھلی کتابوں کا محافظ ہے کہ ان کے اندر جو تعلیم حق ہے وہ قرآن نے جاری کر دی، اور قوموں نے جو رلا ملا دیا تھا قرآن نے اس کو نکال کر پھینک دیا۔

اس لئے ایک مسلمان جب اسلام لائے گا تو مسلمان ہونے کے بعد سچا عیسائی بنے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح معنی میں ایمان لائے گا۔ اسی طرح جو مسلم بنا وہ صحیح معنی میں موسائی بنا۔ کہ اس نے سند متصل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صحیح طور پر سمجھا۔ وہی ابراہیمی بنا وہی آدمی بھی بنا۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو مانا۔ تو سند متصل کی دنیا میں ایک ہی کتاب ہے، اس نے دنیا کی کتابوں کا تعارف کرایا، اس کا ماننا سب کا ماننا ہے اس میں داخل ہونا ساری چیزوں کو اپنے سامنے لے آنا ہے اس واسطے ہم سب کا فرض ہے کہ دین کے بارے میں تعصبات کو چھوڑ دیں۔ دین کے بارے میں اس بات کو چھوڑ دیں کہ فلاں کیا کہتا ہے، فلاں کیا کہتا ہے، خود اپنے ضمیر پر غور کریں، اور اگر ماننے کی چیز ہے تو مانیں اور برملا اس کا اظہار کریں۔

یہ چند باتیں اس آیت کی روشنی میں مجھے عرض کرنی تھیں خدا جانے کہ میں اس میں کامیاب ہوا کہ نہیں اور آیت کے سلسلہ میں جو مقاصد ہیں وہ پیش ہو سکے یا نہیں؟ مگر بہر حال جو استطاعت تھی وہ چند جملے میں نے عرض کر دیئے، خدا کرے کہ نافع ثابت ہوں۔

اور جب آیت میں آپ غور کریں گے تو یہ باتیں منکشف ہو کر آپ کے ذہن میں گھومیں گی، جتنا آپ سوچیں گے اتنا انشاء اللہ آپ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، اور اس سے اچھے نتائج اخذ کریں گے، بہر حال یہ چند باتیں میں نے عرض کر دیں، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو حق دکھلائے اور باطل کو باطل دکھلائے۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ. اَللّٰهُمَّ لَا تَنْزِعْ مِنَّا صَالِحَ مَآ اَعْطَيْتَنَا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. (آمین)

۱۴. ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ

برسبیلِ تذکرہ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا

۷۔۸ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۱۔۲۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء دارالعلوم حقانیہ کا وہ عظیم الشان سالانہ دستار بندی اجلاس منعقد ہوا۔ جو ظاہری و معنوی امتیازات و برکات کے لحاظ سے دارالعلوم کی تاریخ میں امتیازی اور افادی حیثیت سے دور رس نتائج کا حامل رہے گا۔ اپنی روایتی آب و تاب، مسلمانوں کے بے پناہ خلوص و محبت، اکابرین و عمائدین ملک وملت کی بزرگانہ و مخلصانہ ہمدردیوں اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ حضرت حکیم الاسلام فخر الاماثل مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم کی شمولیت بابرکت نے اجلاس کی رونق افادیت اور کامیابی کو اوج کمال تک پہنچا دیا۔

اللہ تعالیٰ کے بے پناہ انعامات و اکرامات ہی کا ثمرہ ہے کہ ابتداء تاسیس دارلعلوم حقانیہ سے اکابرین دیوبند و بزرگان و مشائخ عظام کی مبارک توجہات اور نیک دعائیں اس جانب مبذول ہیں اور دارالعلوم حقانیہ نے اپنے مادر علمی، گہوارہ علم و عمل مرکز عقیدت، حصن حصین اسلام دارلعلوم دیوبند کے رشتہ محبت اور وابستگی کو سعادت وفلاح کامیابی و ترقی کا بہت بڑا سرمایہ سمجھا ہے، چناں چہ اس سال جب سالانہ اجلاس دستاری بندی کے لئے حضرت المخدوم المعظم قاری صاحب مرحوم کو دعوت دی گئی تو انہوں نے شرف پذیرائی بخشتے ہوئے مذکورہ تاریخیں مقرر فرما کر ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو دارالعلوم میں قدم رنجہ فرمایا۔

۲۱ اکتوبر کو فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی فرمائی اور جامع مسجد دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھا، ان تقریبات میں حضرت قاری صاحب مدظلہ کے علاوہ پاکستان کے اکثر اکابر ’’جیسے شیخ الحدیث مولانا نصیرالدین غورغشتی رحمۃ اللہ علیہ حافظ الحدیث مولانا عبداللہ درخواستی، شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی، علامہ مولانا شمس الحق صاحب افغانی، مولانا محمد مفتی نعیم لدھیانوی مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا عبدالحنان صاحب ہزاردی اور بے شمار ارباب علم وفضل موجود تھے۔

۲۱۔۲۲ اکتوبر کی درمیانی رات کو حضرت مہتمم صاحب مرحوم کی وہ بہترین سحر انگیز حکیمانہ تقریر ہوئی جس نے اہل علم وفضل وارباب فکر وفہم اور عامۃ المسلمین کے ہزاروں کے مجمع کو گھنٹوں تک یکساں محور رکھا تھا۔ ہر ہر جملہ میں حضرت حجۃ الاسلام سیدنا الامام محمد قاسم النانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے انوار و تجلیات کی جھلک اور قاسمی علوم و معارف کا شان استدلال وعقلیت نمایاں تھا، مظہر انوار قاسمیہ حضرت مہتمم صاحب مرحوم نے اپنے اس مخصوص روایتی دلکش

خطاب میں قرآن وسنت کی روشنی میں عقل ودرایت کی پختگی کے ساتھ فلسفیانہ مگر عام فہم انداز میں کائنات عالم کے اس اشرف واعلیٰ نوع مخلوقات انسان کی حقیقت اور پھر اس کے مقاصد ومنافع تخلیق اور وجوہات افضلیت اور امتیازات خصوصیت پر سیر حاصل بحث فرمائی اور اس ذیل میں بے شمار اسرار وحکم کی طرف رہنمائی کر کے فکر ونظر کے لئے ایک شاہرہ کھول دی۔

الحاد و دہریت، سائنس اور مادیت کے اس ہیجانی وطوفانی دور میں ایسے ہی استدلال، زور بیان اور تجربہ د حقائق سے مادیت اور مغربیت زدہ پریشان اذہان وافکار کو چیلنج کیا جاسکتا ہے اور گم گشتہ راہ انسانیت کو اپنی حقیقت و مقام سے شناسا کرایا جاسکتا ہے آخر علوم الٰہیہ ربانیہ کے سواوہ کون سی خوبی ہوسکتی ہے جو اس ادنی وضعیف مخلوق خاکی انسان کو خلافت ربانی کے مقام جلیل پر کھڑا کرسکتی ہے؟ معارف نبوت ورسالت کے سواوہ کون سی روشنی ہے جس کو لے کر انسان ہدایت وسعادت کی بام رفیع ''نیابت نبوت'' پر فائز ہوسکتا ہے؟

انہی حقائق ومعارف کی جانب حضرت قاری صاحب موصوف نے اپنی تقریر میں ہماری رہنمائی کی ہے، بیان کی دلکشی، تقریر کی جاذبیت، مضامین کی افادیت اور جامعیت اور خود حضرت موصوف کی جامع الکمالات پر کشش شخصیت نے مجمع میں كَاَنَّ عَلٰى رُءُ وْسِهِمُ الطَّيْرَ...... کا منظر پیش کر دیا تھا۔ اور جلسہ کے اختتام کے فوراً بعد ملک کے اطراف واکناف سے اس تقریر کی مانگ شروع ہوگئی خود دارالعلوم حقانیہ نے بھی ضروری سمجھا کہ ان ارشادات کو افادۂ عام کے لئے شائع کیا جائے دوران تقریر میں بعض حضرات خصوصاً برادر عزیز مکرم ومحترم مولانا شیر علی صاحب فاضل و مدرس دارالعلوم حقانیہ نے حتی الوسع بلفظہ قلم بند کرنے کی کوشش کی۔ تاہم ضبط بیان میں قدرے اجمال وکوتاہی ہونی لازمی تھی۔ جسکی وجہ سے ضروری سمجھا گیا کہ حضرت قاری صاحب مسودہ تقریر پر نظر ثانی فرمادیں، چناں چہ اسی غرض سے تیار شدہ مسودہ حضرت موصوف کی خدمت میں دیوبند بھیج دیا گیا، حضرت قاری صاحب مرحوم نے توالئی اسفار، کثرت مشاغل کے باوجود گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر مسودہ پر نظر ثانی فرمائی۔ اور توضیح تعبیرات تفصیل مضامین کے لئے خود حضرت کے الفاظ میں ''باوجود غیر معمولی مصروفیت کے رات دن لگ کر اسے مرتب کیا اور گویا سارا مسودہ ازسرنو خود ہی لکھنا پڑا''۔

اس بنا پر اب یہ بصیرت افروز تقریر ایک گرانمایہ تصنیف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور اگر چہ کچھ دیر سے شائع ہو رہی ہے لیکن قیمتی اضافوں اور بے شمار فوائد کی بنا پر یہ تکوینی تاخیر، خیر وحسن کا موجب بن رہی ہے، رب جلیل اس علمی وتبلیغی احسان کے بدلے حضرت قاری صاحب کو تمام اہل علم اور مسلمانوں کی جانب سے اجر جزیل عطا فرماوے شَكَرَ اللّٰهُ مَسَاعِيَهُمْ اور قارئین کو فرمان خداوندی ﴿ وَهُدُوْا اِلَى الطَّيِّبِ ﴾ الایۃ کے مصداق زمرہ میں شامل کردے، برادر محترم مولانا سید شیر علی شاہ صاحب شکریہ کے مستحق ہیں، جن کی شبانہ روز سعی ومحنت سے یہ گنج گرانمایہ قارئین کے ہاتھ تک پہنچ رہا ہے۔ تسہیل فہم اور ترتیب مضامین کے لئے عنوانات ضروری سمجھے گئے، جو ناچیز کے

لگائے ہوئے ہیں اس لئے تعبیر مفہوم میں نقص وکوتاہی کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ کتاب کی اہمیت وعظمت کی بناء پر اسے ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ کیا جائے، تاہم ناتجربہ کاری کی بناء پر پورے طور پر کامیابی نہیں ہوسکی۔دوسرے ایڈیشن میں انشاء اللہ العزیز اس کا تدارک کیا جائے گا۔یہ مجموعہ حضرت قاری صاحب کے تجویز کردہ نام ''انسانی فضیلت کا راز'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وَالْكِتَابُ يُقْرَءُ مِنْ عُنْوَانِهٖ

دادیم ترا ز گنج مقصود نشان　　　　گر ما نرسیدیم شاید تو برسی

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا وَاِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ

محمد سمیع الحق كَانَ اللّٰهُ لَهٗ

دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

۳ شعبان ۱۳۷۸ھ-۱۲ فروری ۱۹۵۹ء

تہنیت (تبریک ودعوت)

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

آج بتاریخ ۶ ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ احقر حسب دعوت حضرت مولانا محمد عبدالحق صاحب بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک حاضر ہوا۔ اور دارالعلوم ہی میں قیام کیا۔

آٹھ سال کے بعد اس سرچشمہ علم میں حاضری کا یہ دوسرا موقعہ ہے سن ۱۹۵۰ء میں احقر اس وقت حاضر ہوا تھا جب کہ اس مدرسہ کے لئے نہ کوئی مستقل جگہ تھی نہ مکان۔ ایک مسجد میں غریبانہ انداز سے اساتذہ وتلامذہ نے کارِ تعلیم شروع کر دیا تھا لیکن آٹھ سال کے بعد آج دارالعلوم کو اس شان سے دیکھا کہ اس کے پاس شاندار عمارت بھی ہے۔ وسیع میدان بھی ہاتھ میں ہے۔

اس کے وسیع نظم ونسق کے لئے مختلف انتظامی شعبہ جات بھی ہیں۔ شعبہ تعمیر مستقل حیثیت میں اپنا کام بھی کر رہا ہے۔ اور تعمیرات بھی روز افزوں ترقی پر ہیں۔ طلبہ کی کثرت ہے۔ اساتذہ ماہر فنون کافی تعداد میں جمع ہیں۔ ۲۶۰ طلبہ فارغ التحصیل کی دستار بندی بھی ہوئی جن میں مختلف پاکستانی علاقوں کے علاوہ کابل وقندھار کے طلبہ بھی ہیں، ایک عظیم الشان مسجد کی بنیاد بھی رکھی جا رہی ہے۔ خلق اللہ کا رجوع ہے، اعتماد ہے اور وہ پورے بھروسہ کے ساتھ پروانہ وار اس شمع علم کے ارد گرد فدائیت وعقیدت کے ساتھ ہجوم کر کے آ رہے ہیں۔

حتیٰ کہ مدرسہ کے جلسہ نے ایک ''عظیم الشان علمی جشن'' کی صورت اختیار کر لی ہے اور بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج اسے صوبہ سرحد کی سب سے بڑی اور مرکزی درسگاہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ سات سال کی مختصر مدت میں یہ ظاہری وباطنی ترقیات بجز اس کے کہ کارکنوں کے، اخلاص وللّٰہیت کا ثمرہ کہا جائے، اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ ان مخلصین میں رئیس المخلصین حضرت مولانا عبدالحق صاحب اکوڑوی ہیں جن کے اخلاص وایثار کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب سے وہ دارالعلوم دیوبند کے ایک ماہرِ فن استاد کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں مقیم تھے۔ تقسیم ملک کے بعد بہ مجبوری اٹک میں مقیم ہوئے اور دارالعلوم دیوبند آج تک ان کی جدائی پر نالاں ہے۔

ان کی سادہ بے لوث اور مخلصانہ طبیعت اور خدمت ہی نے اس سات سال کی قلیل مدت میں اس مکتب کو مدرسہ اور مدرسہ سے دارالعلوم بنا دیا ہے۔ اس دارالعلوم کے احاطہ میں پہنچ کر احاطہ دارالعلوم دیوبند کا شبہ ہونے لگتا ہے اور بالآخر یہ شبہ یقین میں بدل جاتا ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ حقیقتاً اس نے اپنی صورت وسیرت میں

دارالعلوم دیوبند کی صورت وسیرت کومحو کرلیا ہے اور وہ دارالعلوم دیوبند ہی بن گیا ہے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس سرچشمۂ فیض اور اس کے بانی کو اپنے فضل وکرم کے سایہ میں تادیر قائم رکھے اور مسلمانانِ پاکستان کے لئے یہ مدرسہ نورِ ہدایت اور مینارہ روشنی ثابت ہو!

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد

محمد طیب غفرلہ
مدیر "دارالعلوم دیوبند" وارد حال اکوڑہ خٹک

انسانی فضیلت کا راز

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ .﴿ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ ھٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ o قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَاعِلْمَ لَنَآاِلَّامَا عَلَّمْتَنَا،اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ o قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْبِئْھُمْ بِاَسْمَآءِ ھِمْ ج فَلَمَّآاَنْبَاَھُمْ بِاَسْمَآئِھِمْ ،قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَاتُبْدُوْنَ وَمَاکُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ o وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ، اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ.﴾ ① صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَاالْعَظِیْمُ.

دارالعلوم کا موضوع اور مقصد...... بزرگانِ محترم! یہ اجتماع دارالعلوم حقانیہ کی طرف سے منعقد کیا گیا ہے جس میں آپ اور ہم سب اس جگہ جمع ہوئے ہیں اور دارالعلوم کا موضوع اور مقصد سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو ظلمت جہالت سے نکال کر علم کی روشنی کی طرف لے جاتا ہے۔اس موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے موزوں و مناسب یہی تھا کہ میں تقریر کے لئے علم ہی کا موضوع اختیار کروں اور غالباً اسی مناسبت سے اور حضرات مقررین نے بھی اپنی تقریروں میں اب تک علم ہی کا موضوع اختیار کیا ہے اور اسی موضوع پر تقریریں ہوتی رہی ہیں تا کہ علم کی ضرورت، فضیلت اور مطلوبہ تعلیم کی نوعیت پر روشنی پڑے،اسی مناسبت سے میں نے یہ آیتیں اس وقت تلاوت کی ہیں،جن میں ان مذکورہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے اور جن میں اللہ تعالیٰ نے علم کی مطلوبہ نوعیت و اہمیت بیان فرمائی ہے اور واضح فرمایا ہے کہ علوم کی لائن میں وہ کون سا علم ہے جو مطلوب اور نافع ہے؟ اور کیا اس کے آثار ہیں؟

اس وقت ان کی مختصر الفاظ میں آپ حضرات کے سامنے شرح کرنا مقصود ہے،خدا کرے آپ سمجھ سکیں ،میری

① پارہ: ۱،سورۃ البقرۃ،الآیۃ: ۳۱،۳۴.

زبان اردو ہے اور اوپر کی کچھ طالب علمانہ بھی ہے۔ جس میں طبعی طور پر کچھ عربی الفاظ بھی آئیں گے۔ ممکن ہے کہ اس کے سمجھنے میں صوبہ سرحد کے بھائیوں کو کچھ دقت ہو۔ تاہم میں سعی کروں گا کہ زیادہ سے زیادہ سہل الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کروں، اور بات کو دلوں میں اتارنے کی کوشش کروں۔ امید ہے کہ اگر کوئی خاص لفظ یا جملہ سمجھ میں نہ آسکے تو مجموعی طور پر مطلب ضرور سمجھ میں آجائے گا۔ ورنہ اور بھی کچھ نہیں تو ثواب تو بہر حال مل جائے گا۔ جو سمجھنے پر موقوف نہیں صرف سنتے رہنے پر موقوف ہے۔

مقدمہ وتمہید...... قبل اس کے کہ میں ان آیات کی تفسیر کے متعلق کچھ عرض کروں ایک مختصر بات جو بطور مقدمہ و تمہید ہوگی، بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں، جس سے آیات کے مقصد کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور وہ یہ ہے کہ اس کائنات کے مالک نے یہ کائنات بنائی تو اسے پوری طرح سجایا اور آراستہ بھی کیا اور اس میں طرح طرح کی ضرورتیں بھی مہیا فرمائیں۔ زمین کا فرش بنایا اور اطلاع فرمائی کہ: ﴿جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا﴾ ① اور زمین کو فرش بنایا اور فرش پر آسمان کا خیمہ تانا اور اسے ایک محفوظ چھت بنادیا۔ چناں چہ بتلایا کہ: ﴿وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ ''اور ہم نے بنایا آسمان کو محفوظ چھت'' اس چھت میں روشنی کے قندیل لٹکائے تا کہ اس مکان کی فضائیں روشن رہیں اور فرمایا: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا﴾ ② ''برکت والی ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج رکھے اور ان میں روشن چراغ (سورج) اور روشنی بخش چاند رکھا''۔ پھر ان ستاروں کو چھت کیلئے سامان زینت بھی کر دکھایا اور اطلاع دی کہ: ﴿اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ ِالْكَوَاكِبِ﴾ ③ ہم نے آراستہ کیا آسمان دنیا کو زینت سے جو ستارے ہیں۔ پھر اس فرش خاک کو بستر بنا کر ایک وسیع ترین دستر خوان بھی بنایا جس سے ہر قسم کے غلے، ترکاریاں، پھل غذائیں اور دوائیں اگائیں۔ جس سے ہر قسم کے میٹھے کھٹے نمکین اور دوسرے ذائقوں کے پھل اور دانے نکلتے چلے آتے ہیں اور مطلع فرمایا کہ: ﴿وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ﴾ ④ ''ان سبزیوں کو نمایاں کرنے اور حیات بخشنے کے لئے پانی سے بھری ہوئی ہوائیں رکھیں اور فرمایا کہ:'' ﴿وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ﴾ پھر زمین کو فرش اور خوان نعمت بنانے کے ساتھ راہ دار بھی بنایا جس میں جگہ جگہ چلنے پھرنے کے راستے رکھے اور فرمایا کہ: ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا﴾ ⑤

مقصودِ تخلیق کائنات...... غرض یہ کائنات ایک عظیم ترین بلڈنگ اور رفیع الشان قصر کی حیثیت سے تیار فرمائی

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲. ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۱. ③ پارہ: ۲۳، سورۃ الصافات، الآیۃ: ۶.
④ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۹. ⑤ پارہ: ۲۹، سورۃ النوح، الآیۃ: ۱۹-۲۰.

جس میں کھانے پینے، چلنے پھرنے، رہنے سہنے، سونے جاگنے اور کام کاج کرنے کے سارے سامان فراہم فرمائے، اس کائنات کی یہ ساخت اور بناوٹ کا یہ خاص انداز پکار پکار کر زبان حال سے بتا رہا ہے کہ ضروریات زندگی سے لبریز یہ مکان کسی ضرورت مند مکین کے لئے بنایا گیا ہے، خود مقصود نہیں ہے، یعنی اس میں کسی کو بسانا مقصود ہے، محض مکان بنانا مقصود نہیں اور بلاشبہ کسی ایسے مکین کو آباد کرنا مقصود ہے جو ان سامانوں کا حاجت مند بھی ہو اور اس میں ان سامانوں کو استعمال کرنے کی صلاحیت بھی ہو، تاکہ یہ سارے سامان ٹھکانے لگیں اور اس مکین سے اس مکان کی آبادی اور زینت ہو، کیوں کہ مکان مکین کے بغیر ویرانہ، وحشت کدہ اور بے رونق ہوتا ہے، سو اس عالم میں ارادی کاروبار اور اختیاری، تصرفات دیکھنے سے انداز ہوتا ہے کہ اس بلڈنگ میں بسنے والی ذی شعور اور حساس مخلوق جو اس کائنات کو استعمال کرسکتی ہے۔ چار ہی قسم کی ہے۔

ذی شعور اور حساس مخلوق کی چار اقسام...... ایک حیوانات ہیں جن میں سینکڑوں انواع گھوڑا، گدھا، بیل، بکری، طوطا، مینا، شیر، بھیڑیا، سانپ، بچھو، چرند، پرند، درند وغیرہ ہیں۔ دوسرے جنات ہیں جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے مگر آثار سے سمجھ میں آتے ہیں۔ اور بلحاظ نسل مختلف قبائل اور خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ تیسرے ملائکہ ہیں جو نوری ہونے کے سبب لطیف اور نادیدہ ہیں۔ مگر اپنے آثار کے لحاظ سے مثل دیدہ ہیں اور نر و مادہ ہونے اور نسل کشی سے بری ہیں اور چوتھے بنی نوع انسان ہیں جو زمین کے ہر خطہ میں بسے ہوئے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں، یہی چار مخلوقات ہیں، جو اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے اندر احساس و شعور رکھتی ہیں اور اس کائناتی بلڈنگ کے باشندے اور جائز وارث ہونے کی مستحق ہیں، اس زمین آسمان میں ان کے حقوق ہیں اور وہ مالک کائنات کی طرف سے ان کے حق دار بنائے گئے ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ ان کے حقوق کو پامال کرے۔ یا انہیں منافع دنیا سے بے حق کردے۔ غذا، مکان، تن پوشی اور رہن سہن وغیرہ میں ان سب کے حقوق قائم ہیں۔ انہیں حق ہے کہ رہنے کے لئے مکان تلاش کریں۔ غذا کے لئے مناسب حال کھانا مہیا کریں۔ اندریں صورت جو بھی ان میں سے کسی کے جائز حق میں رخنہ انداز ہوگا، وہ بلاشبہ مجرم اور مستحق سزا ہوگا۔

ہر نوع کے مستقل حقوق اور اسلام میں ان کی حفاظت...... چناں چہ شریعت اسلام نے جس طرح انسانوں کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ اسی طرح حیوانات کے حقوق کی بھی پوری پوری حفاظت و رعایت فرمائی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک اونٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بلبلاتا ہوا حاضر ہوا۔ اس کی آنکھوں میں پانی بہہ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر سر رکھ دیا اور بلبلاتا رہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاؤ اس کے مالک کو، مالک حاضر کیا گیا، فرمایا یہ اونٹ تیری شکایت کر رہا ہے کہ تو اسکی طاقت سے زیادہ بوجھ اس پر لادتا ہے، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ شکایت بجا ہے واقعی میں اس جرم کا مرتکب ہوں اور میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہ کروں گا۔

دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی چند مثالیں......بعض صحابہ رضی اللہ عنہم چڑیا کے بچے پکڑ لائے اور وہ ان کے سروں پر منڈلاتی ہوئی پریشان حال اڑ رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بچے چھڑوا دیئے کہ کیوں ان کی آزادی سلب کرتے ہو اور کیوں ان کی ماں کو ستاتے ہو۔ کیڑے، مکوڑے، زمین میں سوارخ کر کے اپنے رہنے کا ٹھکانا کرتے ہیں تو احادیث میں ممانعت آئی ہے کہ کسی سوارخ کو تاک کر اس میں پیشاب مت کرو، اس میں جہاں تمہاری یہ مصلحت ہے کہ اس سوراخ سے کوئی کیڑا مکوڑا نکل کر تمہیں تکلیف نہ پہنچا دے۔ وہیں اس جانور کی بھی یہ مصلحت ہے کہ بے وجہ اس کے گھر کو خراب کر کے اسے بے گھر مت بناؤ، اور اس کے ٹھکانے کو گندہ مت کرو کہ اس کا تمہیں حق نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن مدینہ سے باہر تشریف لے گئے۔ ایک دیہاتی کے یہاں ایک ہرنی بندھی ہوئی دیکھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر چلائی کہ یا رسول اللہ! یہ دیہاتی مجھے پکڑ لایا ہے اور سامنے پہاڑی میں میرے بچے بھوکے تڑپ رہے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تھوڑی دیر کے لئے کھول دیجئے کہ میں انہیں دودھ پلا آؤں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو وعدہ خلافی تو نہ کرے گی! عرض کیا یا رسول اللہ! میں سچا وعدہ کرتی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھول دیا اور وعدہ کے مطابق دودھ پلا کر فوراً واپس آ گئی آپ نے اس کے گلے میں وہی رسی پھر ڈال دی۔ اور اسے بدستور باندھ دیا اور پھر اس دیہاتی کو واقعہ سنا کر سفارش فرمائی کہ اسے کھول کر آزاد کر دے۔ چنانچہ اس نے کھول دیا اور وہ اچھلتی کودتی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دعائیں دیتی ہوئی پہاڑ میں اپنے بچوں سے جا ملی۔

اس واقعہ سے واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے حقوق کی رعایت فرمائی جانور کی رعایت تو اس کو کھول دینے سے فرمائی، تاکہ ہرنی کی مامتا کی رعایت ہو اور بچوں کو بھوکا مرتے دیکھ کر اس کا دل نہ دکھے، بچوں کی رعایت ان کی جان بچا کر فرمائی کہ وہ ضائع نہ ہوں۔ انسانی حقوق کی رعایت یہ ہوئی کہ ہرنی کو اس کے واپس ہونے پر دوبارہ باندھ دیا تاکہ واضح ہو کہ انسان کو جنگل سے جانور پکڑ لانے اور اسے پالنے یا استعمال کرنے کا حق ہے۔ جس میں رخنہ نہیں ڈالا جا سکتا اور ساتھ اس میں وفائے عہد کی بھی تعلیم ہے کہ جب جانوروں تک وفائے عہد لازم ہے تو اس عقل مند انسان پر کیوں نہ ہوگا؟

حیوانات کے حقوق......فقہائے کرام لکھتے ہیں کہ شہر کے پالتو جانوروں اور کام کاج کے حیوانات کے لئے فناءِ مصر (شہر کے قرب و جوار) میں لازمی ہے کہ کچھ زمینیں خالی چھوڑی جائیں، جن میں کھیتی باڑی کچھ نہ ہو تا کہ جانور اس میں آزادی سے چریں اور گھاس اور پانی استعمال کر سکیں اور انہیں ان کا جائز حق ملتا رہے اور ان کی آزادی برقرار رہے۔

نیک طبیعت اور پاک نہاد انسانوں نے ہمیشہ ان جانوروں کے حقوق کی رعایت کی ہے۔ ہمارے دار العلوم دیوبند کے محدث حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب کھانا کھانے کے بعد روٹیوں کے چھوٹے ٹکڑے اور کنے تو

چھتوں پر ڈلوا دیتے تھے کہ یہ پرندوں کا حق ہے اور کھانے کے ذرات اور بھورے کو چیونٹیوں کے سوراخوں پر رکھوا دیتے تھے یہ ان نہتے اور ضعیف جانوروں کا حق ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جانور کا دل دکھانا، اور اسے ستانا ہرگز جائز نہیں۔ ایک نیک شخص محض اس لئے جہنم میں جھونک دیا گیا کہ اس نے بلی کو کوٹھڑی میں بند کر کے بھوکا پیاسا مار دیا تھا اور ایک فاحشہ عورت محض اس لئے جنت میں پہنچا دی گئی کہ اس نے ایک تڑپتے ہوئے پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچالی تھی۔ جیسا کہ احادیث میں اس کا تفصیل سے واقعہ آتا ہے۔

شریعت اسلام نے جانوروں کے ذبیحہ میں اس کی رعایت کا حکم دیا ہے کہ ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح مت کرو کہ اس کا دل دکھے اور وہ اپنے بنی نوع کے فرد کو ذبح ہوتے دیکھ کر دہشت سے خشک ہونے لگے، بہر حال حیوانات کے اس دنیا میں رہنے سہنے، کھانے پینے اور امن و آزادی کے حقوق ہیں، جن کی حفاظت کا حکم اور ان کے ضائع کرنے کی ممانعت ہے۔

ہاں کوئی جانور شرّی اور موذی ہو تو اسے بے شک بند کرنے یا مار دینے کے حقوق بھی دیئے گئے ہیں، سو یہ جانور ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، شریر انسان کیلئے بھی حدود و قصاص، حبس و جیل، قید و بند اور قتل و غارت وغیرہ رکھا گیا ہے۔ چناں چہ موذی جانور مثل سانپ اور بچھو کو حرم میں بھی پناہ نہیں دی گئی اور "قَتْلُ الْمُوْذِیْ قَبْلَ الْاِیْذَاءِ" کا معاملہ رکھا گیا ہے مگر اس سے حیوانات کے حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جنات کے حقوق...... اسی طرح جنات بھی اس جہان کے باشندے ہیں، جن کے حقوق ہیں، انہیں مکان غذا اور رہنے کا حق دیا گیا ہے جسے پامال کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ جس طرح وہ ویرانوں میں رہتے ہیں ویسے ہی انہیں حق دیا گیا کہ ہمارے گھروں میں بھی بود و باش اختیار کریں، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر گھر میں بھی جنات بسے ہوئے ہیں چوں کہ وہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور ہم اپنے کام میں، اس لئے ہمیں پتا نہیں چلتا کہ کوئی جن ہمارے گھر میں آباد ہے، البتہ جو بدطینت اور شری فسادی ہوتا ہے اور ہمیں ستاتا ہے تو ہم کہنے لگتے ہیں کہ فلاں گھر میں آسیب کا اثر ہے اور عاملوں کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ وہ عملیات سے اس جن کو بند کریں یا جلا ڈالیں۔ بہر حال جب جنات بدی پر آجائیں تو پھر ان کا مقابلہ، بلکہ مقاتلہ کی اجازت بھی دی گئی ہے۔

جنات میں مختلف صفات و مذاہب...... ورنہ جہاں تک نیک اور مومن جنات کا تعلق ہے تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ اپنے گھروں سے انہیں نکالنے کی فکر میں رہیں۔ بلکہ ان کی طاقت اور نیکی سے خود ہمیں بھی فائدہ پہنچے گا۔ رہی بدی اور ایذا رسانی، سو وہ انسان کی بھی گوارا نہیں کی گئی چہ جائیکہ جنات کی کی جاتی۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ جنات میں ہر قسم کے افراد ہیں، نیک بھی ہیں اور بد بھی ہیں۔ مسلم بھی ہیں غیر مسلم بھی، مشرک بھی ہیں یہودی و نصرانی بھی چناں چہ قرآن کریم نے اس طرف کھلا اشارہ فرمایا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جنات آسمان کے دروازوں

تک آجا سکتے تھے اور ملائکہ کی گفتگو سے وحی خداوندی کے کچھ الفاظ اچک لاتے تھے، جس میں اپنی طرف سے جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں کو سناتے اور پھر غیب دانی کے دعوے کر کے مخلوق کو اپنے دام میں پھانستے۔ حضور کی بعثت کے وقت ان کا آسمانوں کی طرف چڑھنا بند کر دیا گیا تو انہیں پریشانی ہوئی کہ یہ کیا نیا حادثہ پیش آیا ہے، جس نے ہم پر یہ بندش عائد کر دی اور یہ کون سی نئی بات ظہور میں آئی ہے، جس کی بدولت ہم پہ یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ چنانچہ کچھ جنات اس وجہ کی تلاش میں نکلے اور مشرق و مغرب میں گھومے۔ کسی نے مغرب کی راہ لی اور کسی نے مشرق کی، کسی نے شمال کو چھانا اور کسی نے جنوب کو ان میں سے ایک جماعت کا گزر مکہ میں ہوا تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھ رہے ہیں۔ اس کا طرز و انداز نرالا اور ہادیانہ دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ اس ہدایت کی زد ٹھیک ہمارے شر کے اوپر ہے۔ سمجھ گئے کہ بس یہی وہ بات ہے جس سے ہم پر اور ہمارے شری افعال پر یہ پابندی عائد کر دی گئی۔

انہوں نے جا کر اپنے بھائیوں کو اطلاع دی کہ: ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا o یَّهْدِیْۤ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ﴾ ①

''ہم نے تو عجیب قسم کا کلام پڑھا ہوا سنا ہے جو نیکی کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے، سو ہم تو اس پر ایمان لائے''۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان میں کافر بھی تھے جو بعد میں ایمان لائے تو ان میں کافر و مومن کی دونوں نوع نکلیں پھر آگے فرمایا: ﴿وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا﴾ ② ''اور ہم اب ہرگز شرک نہیں کریں گے نہ آئندہ کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں گے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان میں موحد و مشرک کی تقسیم بھی تھی کچھ مشرک تھے اور کچھ موحد، آگے فرمایا: ﴿وَاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا﴾ ③ ''اور یقیناً ہمارے پروردگار کی شان بہت بلند ہے، اس سے کہ اس کی کوئی بیوی اور بیٹا ہو''۔ معلوم ہوا کہ ان میں بعض عیسائی بھی تھے، جو عقیدہ زوجیت اور ابنیت کے قائل تھے، آگے فرمایا: ﴿وَاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا﴾ ④

''اور ہم میں سے بیوقوف اللہ تعالیٰ پر حد سے زیادہ جھوٹ اور افتراء باندھتے تھے''۔ معلوم ہوا کہ ان میں ملحد بھی تھے۔ جو اپنی سفاہت اور بدعقلی سے خدا پر جھوٹ باندھ کر غیر دین کو دین باور کراتے تھے، اور وحی الٰہی کے نام سے اپنے تخیلات فاسدہ پھیلانے کے عادی تھے، بہر حال اس سے واضح ہوا کہ جنات میں مختلف فرقے اور مختلف خیالات وعقائد کے افراد پائے جاتے ہیں۔ تاہم اس سے ان کے قدرتی حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بدکاروں کو سزا و سرزنش کی جائے جیسے انسان کو کی جاتی ہے، لیکن ان کے حقوق کو نہیں روکا جا سکتا۔

جنات کے ساتھ رشتہ زوجیت؟...... حتیٰ کہ ان سے زوجیت کا رشتہ بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فقہاء میں یہ بحث ہے کہ مسلم جن عورت سے شادی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ بعض فقہاء نے اس نکاح کو جائز کہا ہے بعض نے ناجائز، جس کی نظر اس پر ہے کہ نکاح جنس سے ہوتا ہے نہ کہ غیر جنس سے، وہ یہ نکاح جائز نہیں قرار دیتے، کیوں کہ

① پارہ: ۲۹، سورۃ الجن، الآیۃ: ۱، ۲۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ الجن، الآیۃ: ۲۔
③ پارہ: ۲۹، سورۃ الجن، الآیۃ: ۳۔ ④ پارہ: ۲۹، سورۃ الجن، الآیۃ: ۴۔

یہ نکاح ایسے ہی ہوگا، جیسے آدمی بکری یا گائے سے نکاح کرے تو جانور بوجہ غیر جنس ہونے کے محلِ نکاح ہی نہیں اس لئے نکاح نہ ہوگا، اور جن کی نظر اس پر ہے کہ جنات میں شعور ہے اور وہ شریعت کے مخاطب اور احکام کے مکلّف ہیں، نیز انسانی شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ نکاح جائز قرار دیتے ہیں۔ بہر حال جنات کے مختلف حقوق ہیں، کچھ مکان کے ہیں، کچھ غذا کے حقوق ہیں۔ کچھ پڑوسی ہونے کے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ رشتہ زوجیت کے بھی ہیں۔ ان کی رعایت لازمی ہے۔

جنات کو وعظ و تبلیغ...... حدیث شریف میں آتا ہے ① کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نصیبین کے جنات کا ایک وفد آیا اور اس نے عرض کیا! یا رسول اللہ! ہمارے بھائیوں کی ایک جماعت فلاں جگہ جمع ہوئی ہے، آپ تشریف لا کر انہیں وعظ و نصیحت فرمائیں اور ان سے متعلق مسائل بیان فرمائیں ان کے کچھ سوالات بھی ہیں، جن کا حل چاہتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اس پہاڑ کے دامن میں پہنچے، جس پر جنات کا یہ جلسہ جمع ہوا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دائرہ کھینچا اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس دائرہ سے باہر نہ نکلیں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ عجیب عجیب قماش کے لوگ اس دائرہ کے باہر سے گزر رہے ہیں، لیکن دائرے کے اندر نہیں آ سکتے۔ ان کی آوازیں بھی آتی تھیں، بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مجمع میں پہنچے اور وعظ فرمایا اور مسائل بتلائے، اسی میں فرمایا کہ کوئی انسان ہڈی سے استنجا نہ کرے اور وجہ یہ فرمائی کہ: "فَاِنَّهَا زَادُ اِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ" "کیوں کہ یہ تمہارے جنات بھائیوں کی خوراک ہے"۔ جس سے واضح ہوا کہ ان کی غذا کے حقوق کو تلف کرنا جائز نہیں پھر حدیث ہی میں ہے کہ جب آپ لوگ ہڈی سے گوشت کھا لیتے ہیں تو یہ ہڈیاں جنات کو "پُر گوشت" ہو کر ملتی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ پہلے انسان ہڈی سے استنجاء کرتے تھے، جس پر جنات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہڈی سے استنجاء کی ممانعت فرمائی، جس سے جنات کے غذائی حقوق کی حفاظت ثابت ہوئی اور یہ کہ ہمیں ان کے حقوق تلف کرنے کا کوئی حق نہیں، اسی طرح مکانات سے بے وجہ انہیں اجاڑنا جائز نہیں جب تک کہ وہ تکلیف پہنچانا شروع نہ کریں۔

حقوقِ ملائکہ...... یہی صورت ملائکہ کی ہے وہ بھی اس مکان کے باشندے ہیں، کچھ آسمانوں میں رہتے ہیں، کچھ زمین میں، اور ان کے بھی حقوق ہیں، حدیث میں آیا ہے کہ چار انگلی جگہ آسمانوں میں خالی نہیں جہاں ملائکہ نہ ہوں اور مشغولِ عبادت نہ ہوں، عالمِ بالا کے ملائکہ الگ ہیں اور عالمِ سفلی کے الگ اور جہاں وہ مقیم ہیں وہ ان کا مسکن ہے، وہاں سے انہیں تکلیف دے کر اٹھانا جائز نہیں، مثلاً ملائکہ کو نفرت ہے بدبو سے اور رغبت ہے خوشبو سے، اس لئے

---

① الصحيح للبخاری، كتاب المناقب، باب ذكر الجن، ج:۱۲ ص:۲۳۶، مسند احمد، حديث عبد الله بن مسعودؓ، ج:۱، ص:۴۵۸ رقم:۴۳۸۱.

ایسے مکانات جو ملائکہ کے اجتماع کے ہیں، انہیں بدبو سے آلودہ کرنا جائز نہیں، مساجد ملائکہ کے اجتماع کی جگہ ہے تو وہاں خوشبو کا مہکانا مطلوب ہے اور بدبو سے بچانا مطلوب ہے، مساجد میں بخور اور ہر خوشبویات کا جلانا شرعاً مطلوب ہے تا کہ ملائکہ کو راحت پہنچے اور پیاز کھا کر بلا منہ صاف کئے مسجد میں جانا مکروہ ہے تا کہ انہیں اذیت نہ ہو، حدیث میں ہے کہ مسجد میں بیٹھنے والوں کے لئے ملائکہ استغفار کرتے ہیں، جب تک ان کی ریاح خارج نہ ہو اور وضو نہ ٹوٹے ایسا ہوتے ہی استغفار بند ہو جاتا ہے کہ اس سے ملائکہ کو تکلیف پہنچتی ہے، اور وہ ایسے بندوں سے رخ پھیر لیتے ہیں، گویا ہم بدبو سے انہیں ان کے مکان سے اجاڑ دیتے ہیں، جس کا ہمیں حق نہیں۔

ملائکہ کی بدبو اور جھوٹ سے نفرت...... حدیث میں ہے کہ: جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منہ سے ایک خاص قسم کی بدبو پیدا ہوتی ہے، جس کی وجہ سے فرشتہ وہاں سے دور چلا جاتا ہے گویا جھوٹ کی گندگی پھیلا کر ان سے ان کا مکان چھین لیتے ہیں۔ تو آپ کو کیا حق ہے کہ جب وہ اپنی ڈیوٹی پر بھی ہوں اور اپنی مقررہ جگہ پر متمکن ہوں تو آپ ان کو بھگا دیں اور ان کی جگہ چھین لیں، البتہ جن ناپاک افراد کو پاک مکانوں میں آنے کا حق نہیں ہے، انہیں نکالا جائے تو بات انصاف کی ہوگی، جیسے حدیث میں ہے کہ جب اذان ہوتی ہے تو شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے تو اسے بھگا ہی دینا چاہئے، بہر حال اسی طرح ملائکہ کی غذا ذکر اللہ ہے، تو اس ذکر اللہ سے روکنے کی حرکت کرنا ان سے غذا چھین لینا ہے جیسے پہلے آ چکا ہے کہ گندگی پھیلانا یا غفلت کی باتیں کرنا جس سے انہیں تشویش اور اذیت ہو، بہر حال ملائکہ کے حقوق بھی جنات اور حیوانات کی طرح ہیں، جن کا تلف کرنا جائز نہیں۔

انسان کے حقوق...... چوتھی باشعور مخلوق انسان ہے تو اللہ نے اسے بھی زمین آسمان میں حقوق دیئے ہیں، کھانے کا حق، اوڑھنے کا حق، غذا کا حق، مکان کا حق، آزادی کا حق، اسے بھی حق تعالیٰ نے اس زمین پر آباد کیا ہے، پس زمین ان چاروں مخلوقات حیوان، جن، فرشتہ اور انسان کا مکان ہے، جس پر وہ آباد ہیں، ان چاروں مخلوقات سے حق تعالیٰ کا معاملہ الگ الگ ہے، حیوان سے جو معاملہ ہے الگ ہے، حیوان سے جو معاملہ ہے وہ جنات سے نہیں ہے جنات سے جو معاملہ ہے وہ ملائکہ سے نہیں، جن و ملک سے جو معاملہ ہے وہ انسان سے نہیں۔ مثلاً جانوروں سے معاملہ یہ ہے کہ انہیں قابل خطاب نہیں سمجھا گیا اور کوئی امر و نہی انہیں نہیں دیا۔ کوئی قانون ان کے لئے خطابی رنگ میں نہیں اتارا گیا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو کیوں کہ انہیں فہم خطاب کا مادہ ہی نہیں، نہ عقل ہے نہ فہم، اور ہے تو بہت ہی ادنیٰ جو مثل نہ ہونے کے ہے اور وہ بھی صرف اپنے مقاصد سمجھنے کے لیے ہے کہ وہ اپنی غذا رہنے کی جگہ اور دیگر ضروریات کو سمجھ سکیں اور مہیا کریں۔

حیوانات کی پیدائش سے متعلقہ مقاصد...... مگر وہ امورِ کلیہ اور اپنی تمام بنی نوع کے مفادِ کلی کو سمجھنے کیلئے کوئی اہلیت نہیں رکھتے، صرف اپنا شخصی محدود مفاد جانتے ہیں اور بس؟ سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر ان کو فہم و عقل مل جاتا تو کیا حرج تھا؟ جواب یہ ہے کہ جن مقاصد کے لئے جانوروں کو پیدا کیا گیا ہے۔ ان میں عقل و فہم کی ضرورت ہی نہیں بلکہ

عقل حارج ہوتی ہے اور وہ مقاصد کبھی پورے نہ ہوسکتے ان سے متعلقہ مقاصد یہ ہیں، جنہیں اس آیت میں جمع کر دیا گیا ہے، قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ٥ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ﴾ ① ''ہم نے چوپایوں کو پیدا کیا کہ ان میں تمہارے گرمی کا سامان ہے اور سردی دفع کرنے کی صورت مہیا ہے''۔

چناں چہ تم ان حیوانات کے اون سے گرم کپڑے ٹوپی اور کمبل وغیرہ بناتے ہو، ان کی کھالوں میں تمہارے لئے کئی قسم کے منافع ہیں، اوڑھنے کے بچھانے کے، زینت کے خیمے بنا کر رہتے سہتے اور ﴿مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ﴾ اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو، یعنی ان کے گوشت سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ﴾ ''اور تمہارے لئے ان جانوروں میں رونق و جمال کا سامان ہے کہ تم ان سے اپنے ٹھاٹھ باٹھ اور کروفر کی شانیں قائم کرتے ہو''۔ سرکاری، قومی اور گھریلو تقریبات میں ان کا جلوس نکالتے ہو۔ گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں اور خچروں پر بیش قیمت زین، قیمتی ہودے اور زرین جھولے کس کر اپنا جاہ و حشم دکھلاتے ہو جو ایک انتہائی زینت کا مظاہرہ ہے۔ ﴿وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ﴾ ② ''اور ان کے ذریعہ تم بوجھ لاد کر ایک شہر سے دوسرے شہر تک سامان منتقل کرتے ہو جس کو تم ان کے بغیر مشقت کثیر سے بھی مشکل ہی سے منتقل کر سکتے''۔

حیوانات کو عقل و فہم سے محروم رکھنے کی حکمت...... ان منافع اور حیوانات کے ان خلقی مقاصد پر غور کرو۔ تو ان کے لئے فہم و عقل کی ضرورت نہ تھی، بلکہ عقل ان میں حارج ہوتی کیوں کہ اگر ان میں عقل ہوتی تو جب انسان ان پر سوار ہوتا، زین رکھتا، یا بوجھ لادتا تو عقل مند جانور کہتا کہ ذرا ٹھہریئے پہلے یہ ثابت کیجئے کہ آپ کو مجھ پر سواری کرنے یا بوجھ لادنے کا حق ہے یا نہیں؟ اب آپ دلائل بیان کرتے وہ اپنی عقل کے مطابق آپ سے بحث کرتا، تو سواری اور بوجھ تو رہ جاتا بحث چھڑ جاتی، اور اگر کہیں بحث میں جانور غالب آ جاتا تو آپ کھڑے منہ تکتے رہ جاتے، بلکہ ممکن ہو جاتا کہ وہی آپ پر سواری کرتا، ظاہر ہے کہ یہ بڑی مشکل بات ہوتی، ہر حیوان سے کام لیتے وقت یہی مناظرہ بازی کا بازار گرم رہتا نہ بیل کھیت جوت سکتا، نہ گھوڑے سواری لے جا سکتے نہ حلال جانوروں کا گوشت کھایا جا سکتا، سارے کام تجارت وغیرہ کے معطل ہو جاتے اور انسان کو ان حیوانوں کے مناظروں سے کبھی بھی فرصت نہ ملتی اور یہ ساری خرابی حیوانوں کو عقل و فہم ملنے سے ہوئی پھر آپ کی تعلیم گاہوں میں بھی وہ علم حاصل کرنے جمع ہوتے اور ایک ہی کلاس میں گھوڑے، گدھے کتے سب جمع رہتے، بلکہ جنگلوں سے شیر، بھیڑیئے، ریچھ، گیدڑ بھی جمع ہوتے ،تو آپ کو علم حاصل کرنا وبال جان بن جاتا، غرض علمی اور عملی کارخانے سب کے سب درہم برہم ہو جاتے اس لئے شکر کیجئے کہ اللہ نے انہیں عقل و فہم نہیں دیا۔ جن سے آپ کے کام کاج چل رہے ہیں۔

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۵-۶۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۔

بے عقلی بھی نعمت ہے۔.....اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح عقل نعمت ہے، اسی طرح بے عقلی بھی نعمت ہے، حیوانات کی بے عقلی ہی سے انسان فائدہ اٹھارہا ہے، حتیٰ کہ جو انسان بے عقل اور بے وقوف ہیں وہ عقلمندوں کے محکوم ہیں۔ جس سے لیڈروں کی حکمرانی چل رہی ہے بے وقوف نہ ہوتے تو لیڈروں کو غذا نہ ملتی، اگر بے فہم نہ ہوتے تو لیڈری کی دکان نہ چل سکتی۔ پس کہیں عقل نعمت ہے تو کہیں بے عقلی نعمت ہے، اس لئے جانوروں میں مادہ عقل نہ ہونا ہی نعمت ہے جس سے ان سے مختلف قسم کے کام بلا بحث ومجادلہ نکال لئے جاتے ہیں۔ ورنہ اگر ان میں عقل ہوتی تو یہ تمام منافع جو انسان ان سے لیتا ہے، پامال ہو جاتے۔ حاصل یہ نکلا کہ جانوروں کی پیدائش سے جو مقاصد متعلق ہیں۔ ان میں عقل کی ضرورت نہ تھی اس لئے ان کو ان کے فرائض کی وجہ سے بے سمجھ رکھا گیا تا کہ وہ انسان کی اطاعت سے منہ نہ موڑیں اور جب عقل وفہم ان کو نہیں دیا گیا تو ان سے خطاب کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی کہ ان کے لئے کوئی شرعی قانون اتارا جاتا اور وہ مخاطب اور مکلف بنائے جاتے، پس ان کے لئے نہ امر ہے نہ نہی نہ شریعت آئی نہ کوئی تشریعی قانون صرف لاٹھی اور ڈنڈا ہے جس سے وہ کام پر لگے رہیں اور لگے رہتے ہیں، اور روز وشب مشغول ومنہمک ہیں۔

ملائکہ کو خطابِ خدا کی نوعیّت ...... ملائکہ کو خطاب تو کیا مگر خطاب تکلیفی نہیں کیا کہ فلاں کام کرو اور فلاں کام نہ کرو بلکہ خطاب تشریفی کیا جو اعزازی اور تکریمی ہے، جیسے بادشاہ کسی مقرب سے باتیں کرے تو اس سے اس کی عزت بڑھانی اور مرتبہ بلند کرنا مقصود ہوتا ہے نہ کہ پابند بنانا۔ پس ملائکہ سے اللہ تعالیٰ نے خطاب کیا، کلام بھی فرمایا گفتگو بھی کی مگر ان پر کوئی شریعت نہیں اتاری کیوں کہ احکام دو ہی قسم کے ہوتے ہیں یا کرنے کے یا بچنے کے کرنے کے کام خیر کے ہوتے ہیں، جن سے خیر کا حصول مقصود ہوتا ہے اور بچنے کے شر کے ہوتے ہیں، جس سے شر کا دفعیہ مقصود ہوتا ہے، جیسے بدکاری، دغا بازی، رشوت ستانی، زنا کاری، شراب خوری، چوری، سرزوری، بغاوت تمرد سرکشی وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ ملائکہ میں شر اور برائی کا مادہ ہی نہیں رکھا گیا، تو انہیں بچنے کا حکم دینے کی ضرورت ہی نہ تھی، وہ بدی نہیں کر سکتے تو ان میں بدی سے بچنے کا حکم دینا عاجز کو امر کرنا تھا، جو سراسر خلاف حکمت ہے اور حق تعالیٰ حکیم مطلق ہیں وہ خلاف حکمت بات سے بری اور منزہ ہیں، رہی خیر تو وہ ان کا طبعی تقاضا ہے جسے وہ بہ تقاضائے طبیعت کرنے پر مجبور ہیں اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں مصروف رہتے ہیں۔ عبادت بھی کرتے ہیں۔ سجدہ بھی کرتے ہیں اور اپنی طبع پاک ہی سے منشاء خداوندی کو پہچانتے ہیں۔ اس لئے ان کو شریعت کے ذریعے پہنچوانے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ انہیں امر خیر کرنے کے لئے کسی قانون سے تنبیہ کی جاتی۔ پس جیسے ہمارے حق میں کھانا پینا، سونا جاگنا وغیرہ طبعی بات ہے اسی طرح تمام امور خیر عبادت نیکی، پاکدامنی صفائے باطن وظاہر اور سلامتی ملائکہ کے حق میں طبعی بات ہے ایک شریعت آئے یا نہ آئے وہ اپنے تقاضائے طبع سے ہمیشہ نیکی کریں گے، اس لئے امور خیر

کیلئے بھی کسی شرعی تکلیف اور قانونی خطاب کی ضرورت نہ تھی، بہر حال ملائکہ کو نہ امر شرعی کی ضرورت نہ نہی شرعی کی اس لئے ان سے خطاب تکلیفی نہیں کیا گیا، ملائکہ کو خطاب کیا گیا، مگر تکلیفی خطاب نہیں کیا گیا۔

جنّات کو تکلیفی خطاب کیا گیا مگر مستقل نہیں...... رہے جنات تو ان کو خطاب بھی کیا گیا اور تکلیفی خطاب کیا گیا، مگر خطاب مستقل نہیں کیا گیا یعنی خود ان پر براہ راست کوئی شریعت نہیں اتاری گئی اور نہ براہ راست ان کی نوع کو کوئی شرعی تکلیف دی گئی، بلکہ انسان کے واسطے سے انہیں بھی شریعت کا مخاطب بنایا گیا اور دین میں انسانوں کے تابع رکھا گیا چناں چہ ان میں جو یہودی ہیں۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبع ہیں تورات خود ان کی نوع پر نہیں اتری، جو عیسائی ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبع ہیں، انجیل خود ان کی نوع پر نہیں اتری اور جو مسلمان ہیں وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع فرمان بنائے گئے ہیں، خود قرآن براہ راست ان پر نہیں اتارا گیا پس جو شریعت انسانوں کے لئے آئی ہے وہ ان کے لئے بھی آئی مگر بواسطہ انسان کے انہیں پابند شریعت بنایا گیا۔

جنّات میں نبوّت نہ رکھنے کی وجہ...... بالفاظ دیگر ان میں نبوت نہیں رکھی گئی وجہ یہ ہے کہ جیسے ملائکہ میں خیر کا غلبہ اور شر کالعدم ہے، جنّات میں شر کا غلبہ ہے اور خیر کالعدم ہے اور نبوت کے لئے غلبۂ خیر ہی نہیں خیر محض کی ضرورت تھی، ورنہ بشر کے ہوتے ہوئے بدفہمی یا بدعملی کی وجہ سے شرائع پر عمل اور ان کی تبلیغ دونوں غیر مامون ہوتیں اور صحیح دین مخاطبوں کو نہ پہنچ سکتا، اس لئے انہیں تابع انسان بنایا گیا تا کہ اس کی شریعت سے وہ علم اور عمل کی خطاؤں سے بچنا سیکھیں اس لئے جو انبیاء انسانوں میں مبعوث ہوئے ان ہی کی اطاعت ان پر لازم کی گئی۔ غرض اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو تو خطاب ہی نہیں کیا، ملائکہ کو خطاب کیا مگر غیر تکلیفی اور جنّات کو خطاب تکلیفی کیا مگر خطاب بالاستقلال نہیں فرمایا۔

انسان کو مستقلاً تشریعی خطاب کیا گیا...... اور انسانوں کو خطاب بھی کیا۔ تکلیف شرعی بھی دی اور مستقلاً خطاب فرمایا، یعنی اپنی وحی کے ذریعے خود ان سے کلام فرمایا، ان میں نبی اور رسول بنائے کبھی براہ راست خود خطاب فرمایا۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے طور پر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج میں اور کبھی بزبان ملکی خطاب فرمایا۔ پھر فرشتہ کبھی اپنی ملکیت پر رہتا اور انبیاء بشریّت سے ملکیّت کی طرف منتقل ہو کر فرشتہ سے ملتے اور کبھی فرشتہ اپنی صورت ملکی کو چھوڑ کر صورت انسانی میں آتا اور انبیاء بشری چولہ میں اسے دیکھتے۔ جس کو قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔ ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْمِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْيُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَايَشَآءُ﴾ ① پہلی صورت فرشتہ کے قلب پر وارد ہونے کی ہے، جس میں وہ اپنی اصلیت پر رہتا ہے، لیکن پیغمبر کو بشری اصلیت سے ملکیّت کی طرف منتقل ہونا پڑتا ہے، اس لیے یہ صورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نہایت بھاری اور شدید ہوتی تھی، دوسری صورت حق تعالیٰ کے براہ راست کلام فرمانے کی ہے جو پس پردہ رہ کر

① پارہ: ۲۵، سورة الشورىٰ، الآية: ۵۱.

ہوتی تھی، یعنی نگاہیں حق تعالیٰ کو نہیں دیکھتی تھیں صرف کان کلام حق سنتے تھے اور تیسری صورت فرشتہ کی انسانی صورت میں آ کر پیغام خداوندی سنانے کی ہے جس میں پیغمبر اپنی بشری اصلیت پر قائم رہتے تھے فرشتہ کو ملکی چولہ چھوڑ کر بشری چولہ میں آنا پڑتا تھا، یہ تینوں صورتیں وحی الٰہی کی تھیں۔

علم الٰہی کے لئے انسان کا انتخاب...... حاصل یہ ہے کہ وحی الٰہی اور نبوت وشریعت کی دولت کے لئے مخلوق میں بجز انسان کے اور کسی کا انتخاب عمل میں نہیں آیا اور ظاہر بات ہے کہ وحی علم کے اتارنے ہی کو کہتے ہیں، وحی کے ذریعہ علم ہی تو رسول کو دیا جاتا ہے، اس لئے دوسرے لفظوں میں علم الٰہی کی نعمت مستقلاً انسان ہی کو دی گئی ہے جس کو اس کی بنیادی خصوصیت اور امتیازی شان سمجھنا چاہئے کیوں کہ خصوصیت کے معنی یہی ہیں کہ اس کے سوا کسی دوسرے میں نہ پائی جائے اس لئے دوسرے لفظوں میں انسانیت کی خصوصیت علم وحی نکل آتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ اگر کسی چیز کی خصوصیت اس میں سے نکال دی جائے تو وہ چیز، وہ چیز باقی نہیں رہ سکتی۔

انسانیت کا جوہر علم وحی ہے...... اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر انسان کو علم وحی حاصل نہ ہو تو وہ انسان، انسان نہ رہے گا کہ انسانیت کی خصوصیات اس میں نہ آئی یا نہ رہی۔ گو اس کی صورت انسانوں جیسی ہو، سو ظاہر ہے کہ انسان نام انسانی صورت کا نہیں بلکہ انسانی جوہر کا ہے اور انسانیت کا جوہر یہ علم وحی ہے، اس لئے جو انسان علم وحی کا حامل نہیں وہ دلائل بالا کی رو سے انسان نہیں صرف صورت انسان ہے اور محض صورت کی جس میں حقیقت نہ ہو، کوئی قدر وقیمت نہیں، اگر ہم گھوڑے کا مجسمہ بالکل اصلی گھوڑے جیسا بنالیں کہ دیکھنے میں اصل ونقل میں ذرا بھر فرق معلوم نہ ہو تو کیا اسے گھوڑا کہیں گے؟

اور کیا وہ گھوڑے کی طرح سواری کا کام دے سکے گا؟ اور کیا اس کی قیمت بھی ہزار، پانچ سو روپیہ اٹھ جائے گی؟ کبھی نہیں۔ کیوں کہ وہ گھوڑا نہیں گھوڑے کی محض تصویر ہے، اسی طرح اگر انسان کا اصلی مجسمہ سامنے ہو مگر اس میں انسانی جوہر اور انسانی خصوصیت (علم) نہ ہو تو وہ صورت انسان ہے، انسان نہیں۔ اور قدر وقیمت انسان کی ہوتی ہے، صورت انسان کی نہیں۔ ورنہ عمدہ سے عمدہ انسانی صورتیں پلاسٹک کی بنی ہوئی چند پیسوں میں دستیاب ہوسکتی ہیں، چاہئے کہ انسانوں سے قطع نظر کر کے ان پلاسٹک کے انسانوں سے انسانوں کے کام لینے لگیں اور اصل انسان کے پیچھے نہ پڑیں، مگر ایسا نہیں ہوسکتا جس سے واضح ہوا کہ دنیا میں قدر وقیمت انسان کی ہے، تصویر انسان کی نہیں اور آدمی حقیقت آدمیت کو کہتے ہیں محض صورت آدمیت کو نہیں۔

گر بصورت آدمی انسان بدے ۔۔۔ احمد صلی اللہ علیہ وسلم وبوجہل ہم یکساں بدے

اینکہ می بینی خلاف آدم اند! ۔۔۔ نیستند آدم غلاف آدم اند!

از بروں چوں گور کافر پر حلل ۔۔۔ اندروں قہر خدائے عز وجل

علم مطلق انسان کی خصوصیت نہیں...... یہاں ایک نکتہ فراموش نہ کرنا چاہئے اور وہ یہ کہ انسان کی خصوصیت

مطلق علم نہیں۔ یعنی ہر قسم کے علم کو انسانی خصوصیت نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ مطلق علم یعنی علم کی کوئی نہ کوئی نوع تو قریب قریب ہر مخلوق کو حاصل ہے، حتی کہ جانور بھی علم سے خالی نہیں، اس لئے مطلق علم انسانی خصوصیت نہیں کہلائی جاسکتی اور نہ مطلق علم سے انسان کی فضیلت وشرافت اور مخلوقات میں افضلیت نمایاں ہوسکتی ہے جب تک کہ اسے کوئی ایسا علم حاصل نہ ہو جو اس کے سوا کسی اور کو حاصل نہ ہو۔ آج کی دنیا میں علم کی رائج شدہ جتنی بھی قسمیں ہیں، ان میں سے کوئی بھی انسان کی خصوصیت نہیں، جانوروں کو بھی ان سے حصہ ملا ہوا ہے۔ اس لئے بھی انسان اپنی افضلیت اور مخلوقات میں اپنی برتری ان غیر مخصوص علوم سے نہیں جتا سکتا۔

فن انجینئری انسان کے ساتھ مخصوص نہیں...... آج اگر انسان دعوی کرے کہ میں اس لئے افضل المخلوقات ہوں کہ میں انجینئری کا علم جانتا ہوں اور اعلیٰ سے اعلیٰ ڈیزائنوں کی کوٹھیاں اور بلڈنگیں تیار کرسکتا ہوں تو یہ دعوی قابل سماع نہ ہوگا کیوں کہ انجینئری کے علم سے جانور بھی خالی نہیں ہیں، وہ بھی دعوی کرسکیں گے کہ ہم بھی انجینئر ہیں اور اپنے مناسب حال راحت دہ مکانات بناتے ہیں۔

بیا (جو ایک چھوٹی سی چڑیا ہے) اپنے لئے عجیب وغریب قسم کا گھونسلا بناتی ہے، جس میں کئی کمرے ہوتے ہیں، ماں باپ کا الگ، اور بچوں کا الگ حتی کہ اس میں بچے جھولتے ہیں، گویا مختلف رومز ہوتے ہیں۔ یہ گھونسلا گھاس سے بنایا جاتا ہے اور تین چار تاروں سے، کیکر وغیرہ کے درخت میں لگا ہوا اور لٹکا ہوا ہوتا ہے اور مضبوط اتنا کہ آندھی آئے، طوفان آئے مگر اس مکان پر کوئی زد نہیں پڑتی، آپ کا مکان گر جائے گا، مگر اس کا گھونسلہ محفوظ رہے گا کیا یہ اعلیٰ ترین صنعت نہیں ہے اور یہ چڑیا کیوں یہ دعوی نہیں کرسکتی کہ میں بھی انجینئر ہوں؟ ضرور کرسکتی ہے، تو پھر انجینئری انسان کے حق میں مخصوص کہاں رہی جو اسکی افضلیت اس چڑیا پر ثابت ہو۔ شہد کی مکھی اپنا چھتہ بناتی ہے اس کے ہشت پہلو سوارخ اس قدر مساوی ہوتے ہیں کہ آپ پرکار سے بھی اتنے صحیح خانے نہیں بناسکتے پھر اس میں بچوں کے رہنے اور پلنے کے خانے الگ اور شہد کے الگ ہوتے ہیں جو نہ بارش سے خراب ہو، نہ طوفان میں اپنی جگہ سے ہلتا ہے، کیا یہ انجینئری اور کاریگری نہیں ہے؟ اگر ہے اور بلاشبہ ہے تو آپ کو کب یہ حق پہنچتا ہے کہ آپ انجینئری کا فن اپنی نوع کے ساتھ مخصوص بتلا کر اس مکھی پر اپنی افضلیت وبرتری ثابت کرسکیں؟ سانپ اپنی ''دبلمی'' مٹی سے بناتا ہے جو اوپر سے برجی دار گنبد کی مانند ہوتی ہے اور اس کے اندر نہایت صاف ستھری نالیاں پیچ در پیچ بنی ہوئی جن میں سانپ اور ان کے بچے رینگتے رہتے ہیں، کیا اسے انجینئری اور صنعت کاری نہیں کہیں گے؟ رہا یہ کہ آپ کہیں کہ صاحب ہم عمارتیں بڑی عالیشان بناتے ہیں، جن کی خوشنمائی اور نفاست ان گھونسلوں اور بھٹوں سے کہیں زیادہ اونچی اور اعلیٰ ہوتی ہے، اس لئے ہم اور یہ جانور انجینئری میں برابر کیسے ہوسکتے ہیں، تو جواب یہ ہے کہ مکان کا عمدہ ہونا مکین کی ضرورت اور راحت کے لحاظ سے ہوتا ہے جانور اپنی ضرورت کی رعایت کرتا ہے آپ اپنی ضروریات کی، جانور آپ کی کوٹھی کو للچائی ہوتی نظروں سے دیکھتا تو آپ اپنی برتری کا دعوی کرسکتے تھے،

لیکن جیسے آپ اس کے مکان سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں وہ آپ کے مکان سے نفرت اظہار کرتا ہے، اگر آپ سانپ یا بیایا شہد کی مکھی کو اپنی کوٹھی میں آباد کرنا چاہیں وہ کبھی بھی آمادہ نہ ہوں گے، بلکہ اپنا ہی مکان بنا کر رہیں گے، اس سے واضح ہے کہ مکان کی صنعت میں دونوں برابر ہیں، اور اپنے اپنے رنگ کے ماہر ہیں اس لئے انجینئری کے بارے میں آپ کو دعویٰ انفضلیت کا کوئی حق نہیں۔

انسان اور علمِ طب......اس طرح مثلاً علمِ طب ایک تجرباتی علم ہے، یہ علم جس طرح انسان کو حاصل ہے، اسی طرح حیوانوں میں بھی یہ علم اپنی بساط کی بقدر پایا جاتا ہے، آپ یہ دعویٰ کریں کہ صرف ہم طبیب ہیں اور ہمیں ہی اس علم کا شرف حاصل ہے لہٰذا ہم ہی اس فن کی رو سے اشرف المخلوقات ہیں، غلط ہے، جانور بھی دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم بھی علم طب میں مہارت رکھتے ہیں فرق اگر ہوگا تو صرف یہ کہ آپ پر زیادہ بیماریاں آتی ہیں، تو آپ دواؤں کی زیادہ اقسام جانتے اور استعمال کر سکتے ہیں، جانوروں کو بیماریاں کم لاحق ہوتی ہیں اس لئے وہ دوائیں بھی کم جانتے ہیں، لیکن اس کمی بیشی کے فرق سے علم طب صرف آپ کی خصوصیت قرار نہیں پا سکتا۔

مجھے ایک ہندو ریاست اندر گڑھ میں بار ہا جانے کا اتفاق ہوا، میرے بعض اعزہ وہاں اونچے عہدوں پر ممتاز تھے۔ اس ریاست میں بندروں کے مارنے کی ممانعت تھی، اس لئے بندروں کی تعداد ہزاروں کی حد تک تھی، بندروں کی جبلت میں شرارت اور چالاکی بلکہ ایذا رسانی داخل ہے، اس لئے وہ کافی نقصان کرتے تھے، کبھی برتن اٹھا کے بھاگ جاتے کبھی کپڑا اٹھا لے جاتے۔ اور صرف لے جانا ہی نہ تھا، بلکہ ایسا موذی جانور ہے کہ اسے لے جانا اور منڈیر پر بیٹھ کر اسے دکھا دکھا کر چیرنا پھاڑنا جس سے ایک تو کپڑا جانے کی تکلیف ہوتی۔ اسے ضائع ہوتا دیکھ کر اور بھی زیادہ دکھ ہوتا۔ اس لئے ہمیں ایک بار غصہ آیا اور ہم نے سوچا کہ کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہئے، جس سے سو پچاس بندر ایک دفعہ مر جائیں تو کچھ تو نجات مل جائے گی، اس لئے ہم نے دو روپیہ کا سنکھیا خریدا اور اسے آٹے میں ملایا اور روٹیاں پکوا کر چھت پر پھیلا دیں تاکہ وہ آتے جایں، روٹیاں کھاتے جائیں اور مرتے جائیں، اور ہم خوش ہوتے جائیں اس لئے ہم روٹیاں چھت پر ڈال کر خود ایک پناہ میں بیٹھ گئے اور دیکھتے رہے کہ ابھی بندر آ کر ان روٹیوں کو کھائیں گے، اور مریں گے اور ہمارے لئے خوشی کا سامان ہوگا۔

یعنی اگر انہوں نے ہمارے دس کپڑے پھاڑ دیئے ہیں تو دس بیس کو ہم بھی مرتا ہوا دیکھیں جس سے کچھ تو دل کو چین آئے۔ چنانچہ دو تین بندر آئے، مگر ان روٹیوں سے دور کھڑے ہو کر دیکھنے لگے کہ یہ کیا نیا حادثہ پیش آیا کہ روٹیاں بکھری ہوئی پڑی ہیں۔ یقیناً اس میں کچھ بات ہے، ورنہ روٹیاں یوں نہیں بکھیری جا سکتیں، اس لئے روٹی کو غور سے دیکھا اور پھر سونگھا اور سوچا یہ نیا حادثہ کیوں پیش آیا ہے۔ پہلے تو ہم ایک روٹی بھی چھت پر پڑی ہوتی نہیں پاتے تھے۔ اب یہ روٹیوں کا ڈھیر کیوں لگا ہوا ہے؟ اس میں ضرور کوئی راز ہے؟ بالآخر انہوں نے روٹی کو ہاتھ نہیں لگایا اور چلے گئے ہم سمجھے کہ تدبیر فیل ہوگئی لیکن بندروں کا یہ چالاک قافلہ جا کر پھر اپنے ساتھ اور بندروں کو لے آیا

اور چودہ پندرہ موٹے موٹے بندر ان کے ساتھ آئے اور وہ روٹیوں کے ارد گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ گول میز کانفرنس منعقد ہوئی اور مشورہ شروع ہوا کہ روٹیاں اس مقدار میں یہاں کیوں پڑی ہوئی ہیں۔ خدا جانے انہوں نے باہم کیا کیا اشارے کئے ایک آگے بڑھا اور اس نے روٹیوں کو سونگھا پھر دوسرا آگے بڑھا، اس نے ایک روٹی توڑی اس کے ٹکڑوں کو سونگھا اور روٹیاں چھوڑ کر سب بھاگ گئے اب ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ کچھ سمجھ گئے ہیں اور ہماری ساری تدبیر ناکام ہو گئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں تقریباً ساٹھ ستر بندروں کا ایک قافلہ آیا اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک ٹہنی تھی، جن میں ہرے ہرے پتے تھے۔ انہوں نے آکر پہلے روٹیوں کو توڑا، ان کے ٹکڑے کئے اور قریب قریب اتنے ہی ٹکڑے کئے جتنے یہ بندر تھے، تاکہ روٹیوں میں ہر ایک کو حصہ ملے، گویا پوری جماعت میں یہ اصول پیش نظر تھا کہ۔

نیم نانے گر خورد مرد خدا　　　　بذل درویشان کندں نیمے دگر

بندر بانٹ تو مشہور ہے۔ آخر کار انہوں نے وہ ٹکڑے باہم بانٹ لئے اور ہر ایک نے ایک ایک ٹکڑا کھا کر اوپر سے وہ پتے چبالئے جو ہر ایک اپنی ٹہنی کے ساتھ لایا تھا اور دندناتے ہوئے چلے گئے اور ہم دیکھتے رہے یعنی بے وقوف ہم رہے کہ دو روپیہ کا آٹا بھی گیا سنکھیے کے دام بھی بٹے کھاتے گئے، کپڑا تو پہلے ہی جا چکا تھا اور اوپر سے وقت بھی ضائع ہوا اور ہوشیار یہ بندر رہے کہ سب کچھ انہیں کا ہو کے رہا، اندازہ یہ ہوا کہ یہ پتے جو وہ ساتھ لائے تھے زہر کا تریاق تھے۔ جو ان بندروں کو معلوم تھا، اب بھی اگر آپ یہ دعویٰ کریں کہ طبیب صرف ہم ہی ہیں، جو جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں جانتے ہیں، تو یہ دعویٰ غلط ہوگا، کیوں کہ یہ بندر بھی دعویٰ کر سکتے ہیں۔ بلکہ پیش بندی کر کے بیماری کو پہلے ہی سے روک دیتے ہیں، تو فن طب میں ان کا دخل معلوم ہوا۔ پھر آپ کو خواہ مخواہ ہی دعویٰ ہے کہ صرف ہم ہی اطباء ہیں اور فن طب کی وجہ سے جانوروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ آپ اور بندر نفسِ فن میں برابر ہو گئے گو کچھ خصوصیات کا فرق بھی سہی۔

فنِ سیاست بھی حیوانات میں ہے...... پھر اگر آپ یہ کہیں کہ طب نہ سہی فن سیاست سہی، ہم سیاست جانتے ہیں اور اپنی ملّت کا نظم کر سکتے ہیں اور سیاسی نظام قائم کر کے قوم کی منظّم خدمت کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہم اس بارہ میں جانوروں پر فضیلت رکھتے ہیں تو میرے خیال میں یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فن سیاست بھی انسانی خاصہ نہیں۔ بلکہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے، شہد کی مکھی بھی ملت کی سیاسی اور انتظامی تنظیم کر سکتی ہے۔ شہد کی مکھیاں جب شہد کا چھتہ بناتی ہیں اور بے نظیر انداز سے اس میں ہشت پہلو سوارخ اور خانے بنا کر گویا اپنا یہ قلعہ تیار کر لیتی ہیں تو اس کے نظام کی تشکیل اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے تو وہ امیر منتخب کرتی ہیں، جس کا نام عربی زبان میں یعسوب ہوتا ہے، یہ امیر اس چھتہ پر ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے۔ ساری مکھیاں اس امیر کی اطاعت کرتی ہیں، اندرون قلعہ کی انتظامی تقسیم یہ ہوتی ہے کہ اس چھتہ کے ایک حصہ میں تو شہد بھرا جاتا ہے، ایک حصہ میں ان

کے بچے ان خانوں میں پلتے ہیں، ایک حصہ میں بڑی مکھیاں رہتی ہیں، اور امیر ان سب کی نگرانی کرتا ہے۔

حتی کہ اگر کسی مکھی سے قوم کے خلاف کوئی غداری ہو جائے تو وہ اس مکھی کی گردن قلم کر دیتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ چھتے کے نیچے ہر طرف کچھ مکھیاں سرکٹی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی پڑی رہتی ہے، کسی کا سر کٹا ہوا اور کسی کی کمر ٹوٹی ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی زہریلے پتہ پر بیٹھ کر اس کا زہریلا مادہ لیکر آئی ہو جس سے بنے ہوئے شہد میں سمیت کا سرایت کر جانا یقینی ہوتا ہے تو وہ یعسوب اسے فوراً محسوس کرتا ہے کہ زہریلا مادہ لے کر آئی ہے اور اس مکھی کی گردن توڑ کر اسے فوراً مار گراتا ہے کہ وہ اس چھتہ کے اندر گھسنے نہ پائے، تاکہ اس کے زہریلے مادہ سے قوم کے دوسرے افراد کی جانیں ضائع نہ ہوں۔ گویا وہ سمجھتا ہے کہ ایک جان کی لے کر اگر پوری قوم کو بچالیا جائے تو کوئی جرم نہیں۔ یعنی اس کی سیاست اسے یہ اصول سمجھاتی ہے کہ: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ ①

شہد کی مکھیوں میں قانونِ قصاص اور مکافاتِ جرم...... یعنی ایک کی موت سے اگر پوری قوم کی حیات بچ جائے تو اس کی موت میں کوئی مضائقہ نہیں، اس قتل نفس پر مکھیوں کی اطاعت کا یہ عالم ہے کہ نہ کوئی ایجی ٹیشن ہوتا ہے۔ نہ امیر کے خلاف مظاہرے ہوتے ہیں۔ چپ چاپ خوشدلی سے امیر کے اس فعل قتل پر گردن جھکادی جاتی ہے، اور کسی کو خلجان نہیں گزرتا کہ یہ کیوں ہوا۔ بلکہ تمام قوم سر اطاعت جھکا کر مان لیتی ہے تو اولوالامر کا انتخاب، پھر اس کے سامنے سمع و اطاعت، پھر قوم کی انتظامی تشکیل اور نظم کے تحت مکانات کی تقسیم، پھر بے راہی پر مجرم کا قتل، اگر سیاست نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

ضلع بجنور کے ایک قصبہ نجیب آباد میں شہد بکثرت ہوتا ہے اور وہاں شہد کی مکھیوں کو پالنے کا خاص انتظام ہوتا ہے، وہاں کا ہم نے ایک محاورہ سنا کہ فلاں نے اپنی بیٹی کو تین مکھیاں جہیز میں دیں، فلاں نے چار مکھیاں جہیز میں بیٹی کو دیں۔ ہمیں تعجب ہوا کہ جہیز میں پلنگ پٹیریاں، میز کرسی، زیور، کپڑا وغیرہ تو دنیا بھر میں دیا جاتا ہے، یہ مکھیاں جہیز میں دینے کے آخر کیا معنی ہیں۔

تحقیق سے معلوم ہوا کہ جب وہ لوگ شہد کی مکھیاں پالتے ہیں، اور کسی خاص جگہ شہد کا چھتہ لگوانا چاہتے ہیں تو اس امیر مکھی کو یعنی یعسوب کو پکڑ کر اس جگہ بٹھلا دیتے ہیں تو ساری مکھیاں وہیں جمع ہو جاتی ہیں اور وہیں چھتہ بناتی ہیں اور وہاں شہد تیار ہو جاتا ہے۔ اس گر کو سامنے رکھ کر وہاں کے شہد کے یہ کاروباری دو، چار امیر مکھیاں پکڑ کر ڈبیہ میں بند کر کے بیٹی کو جہیز میں دے دیتے ہیں، وہ لڑکیاں ترکیب جانتی ہیں، اور مناسب مقام پر ان مکھیوں کو بٹھلا دیتی ہیں، تو وہیں شہد کے چھتے لگ جاتے ہیں۔

اور کئی کئی دھڑی شہد ہو جاتا ہے، تو چار مکھیاں جہیز میں دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چار دھڑی شہد جہیز میں

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۷۹۔

دے دیا گیا۔ اس سے شہد کی مکھیوں کی اطاعت شعاری اور نظم پسندی معلوم ہوئی، جس کی نظیر انسان میں بھی نہیں، سو اس نظم پسندی اور تنظیم ملت کی اعلیٰ ترین سیاست کے ہوتے ہوئے آپ کو خواہ مخواہ ہی دعویٰ ہو گیا ہے کہ صرف انسان ہی سیاست دان ہیں، یہ مکھیاں بھی دعوی کر سکتی ہیں، کہ ہم بھی سیاست دان ہیں تو اگر آپ بھی کسی امیر کے تحت رہ کر تقسیم عمل کر لیں کہ کوئی غذا مہیا کرے کوئی تعلیم کا کام کرے، کوئی فوج میں بھرتی ہو کر ملک کی حفاظت کرے، تو کام بلاشبہ عمدہ ہے، ضروری بھی ہے، مگر محض انسان کی خصوصیت نہیں، مکھیاں بھی کر سکتی ہیں، اس لئے یہ تنظیم کوئی وجہ فضیلت نہیں کہ انسان اپنے کو حیوانات سے برتر سمجھے۔

بطخوں میں سیاست و تنظیم...... بطخوں میں بھی سیاست پائی جاتی ہے، جب بطخیں سوتی ہیں تو ان کا امیر ان کی نگہبانی اور پاسبانی کرتا ہے وہ ایک ٹانگ پر ساری رات جھیل میں کھڑا رہتا ہے، جب کوئی خطرہ پیش آتا ہے، تو وہ آواز لگاتا ہے اور ساری قوم کو خطرہ سے آگاہ کرتا ہے، ساری بطخیں بیدار ہو جاتی ہیں اور پر تول لیتی ہیں اور دوسری آواز میں اٹھ کر پرواز میں آجاتی ہیں، اور وہ بھی ایک قاعدے یعنی مثلث طریقے سے اڑتی ہیں۔ امیر آگے آگے اور بطخیں دو لائن میں پیچھے پیچھے اڑتی ہیں، جدھر امیر جاتا ہے، ادھر تمام بطخوں کا یہ قافلہ جاتا ہے، کسی کو امیر پر اعتراض نہیں ہوتا کہ وہ اس سمت میں کیوں جا رہا ہے پھر جہاں امیر بیٹھتا ہے وہیں عام بطخیں وہیں اتر پڑتی ہیں، یہ سیاست نہیں تو اور کیا ہے؟

اور اس سے بہتر سیاست اور تنظیم کیا ہو سکتی ہے؟ اپنی رعایا اور ماتحت قوم کو ہر خطرہ سے آگاہ کرنا اور بچانا خود بیدار رہنا ان کو چوکنا رکھنا کیا اعلیٰ ترین ترقی یافتہ سیاست نہیں؟

اس لئے سیاسی تدابیر اور جوڑ توڑ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں، اصول سیاست میں حیوانات بھی اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں، مکھیاں کہیں گی کہ ہم بھی سیاست دان ہیں، زیادہ سے زیادہ آپ کی سیاست شاخ در شاخ ہے تو اس کی وجہ سے یہ ہے کہ ملت میں جرائم زیادہ ہیں، اس لئے روک تھام کی تدابیر بھی زیادہ ہیں، مکھیوں اور بطخوں میں جرائم کی انواع آپ سے کم ہیں، تو تدابیر بھی کم ہیں۔ سو اس سے کچھ ان مکھیوں اور بطخوں کی افضلیت آپ پر ثابت ہوگی نہ کہ کمتری اور اصل سیاست میں برابری ثابت ہوگی تو یہ دعویٰ بھی آپ کا غلط ہے کہ ہم چوں کہ فنِ سیاست سے واقف ہیں، اس لئے افضل الحیوانات ہیں۔

مکڑی کی صنعت کاری...... اگر آپ کہیں کہ ہم کپڑا بننے کا فن جانتے ہیں۔ لہٰذا ہم سب جانداروں میں افضل ہیں تو مکڑی آکر کہے گی کہ یہ کام تو میں بھی جانتی ہوں، دیکھئے مکڑی سفید رنگ کا خیمہ تنتی ہے، جس کی طنابیں چاروں طرف کھنچی رہتی ہیں، وہ اتنا صاف باریک اور ملائم ہوتا ہے کہ مانچسٹر کی ململ بھی اتنی صارف اور باریک نہیں ہوتی اور اتنا مضبوط جس کو آندھی اور ہوا کے سخت جھونکے اور بڑی سے بڑی بارش بھی نہیں ہلا سکتی اس کی طنابیں اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں سرکتیں، آپ تو سوت سے کپڑا بنتے ہیں، وہ خدا جانے کس مادہ سے اپنا گھر بناتی ہے، آپ کا کپڑا

پھٹ جائے گا، مگر اس کا بنا ہوا خیمہ، یہ کپڑا اور خیمہ نہیں پھٹے گا۔ آپ کا بنایا ہوا کپڑا میلا ہو جائیگا۔ جسے آپ پانی سے دھوئیں گے۔ صابن سے صاف کریں گے مگر مکڑی کے اس خیمہ کے کپڑے کو صاف کرنے اور دھونے کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ کہیں گے کہ ہم اپنی غذا کے لئے پرندے پھانسنے کے لئے جال بناتے ہیں، مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال بنتے ہیں۔ تو ہماری تدبیر کو کون پہنچ سکتا ہے کہ ہم غیر نوع کو قابو میں لانے کیلئے سوت کے تاگوں سے کام لیتے ہیں تو بھی مکڑی آگے بڑھ کر کہے گی کہ میں اس سے بہتر جال بن سکتی ہوں، وہ جالا تانتی ہے تو اس میں مکھیاں پھنس جاتی ہیں، ہزار بھنبھناتی ہیں چلاتی ہیں، مگر اس جال سے نہیں نکل سکتیں تو کیا یہ غیر نوع کا قابو میں لانا نہیں۔ اور اتنا باریک تار بناتی ہے کہ آپ کا سوت اتنا باریک نہیں ہوتا۔ غرض آپ فنونِ طبعیہ میں سے کون سے فن کو اپنی خصوصیت کہہ سکیں گے، ضروریاتِ زندگی کا کوئی فن ایسا نہیں جو حیوانات میں نہ ہو۔ ہم جس قدر بھی ضروریاتِ زندگی سے متعلق علم رکھتے ہیں، حیوانات بھی اپنی ضروریاتِ زندگی سے متعلق سمجھ بوجھ اور صنعت کاری کا علم رکھتے ہیں۔

ضروریاتِ زندگی کا ہر فن حیوانات میں موجود ہے..... حتی کہ اگر آپ سائنس کی مدد سے سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر سکتے ہیں۔ تو ایک کوا اور کرگس بھی اپنی اندرونی سائنس کی قوت سے اپنے پروں سے اتنی ہی بلندی پر پرواز کرتا ہے۔ آپ پیتل تانبے اور دیگر معدنیات کے بنائے ہوئے مصنوعی پروں یعنی ہوائی جہازوں کے ذریعے اڑتے ہیں اور چیل کوے وغیرہ پرندے اپنے بنے بنائے پروں اور خلقی طاقت سے اڑتے ہیں، آپ ان مصنوعی پروں میں معدنیات کے محتاج ہیں اور ہوائی جہاز بنانے میں خون پسینہ ایک کرتے ہیں، تب کہیں اڑتے ہیں، اور یہ پرندے خود ہوائی جہاز ہیں۔ غرض آپ اگر اڑ گئے تو پرندے بھی اڑتے ہیں۔ یعنی پرواز کا جو فعل آپ نے کیا وہی پرندوں نے بھی کیا آپ نے کپڑا بن کر تن پوشی کی اور بدن کو کپڑے سے چھپایا تو ہر چرند پرند بھی اپنی کھال اپنے پروں سے اپنے تن بدن کو چھپاتا ہے۔ آپ کا لباس مصنوعی ہے اس کا قدرتی ہے، آپ رہنے کے لئے مکان بناتے ہیں۔ جانور بھی اپنا بھٹ اور گھونسلا بناتے ہیں۔ آپ اپنا رزق تلاش کرنے جنگل میں جاتے ہیں، وہ بھی اپنی غذا تلاش کرنے کھیتوں اور جنگلوں میں گھومتے ہیں، اور شام کو پیٹ بھر کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ آپ پلاؤ زردہ کھاتے ہیں وہ گھاس دانہ کھاتے ہیں آپ گوشت پکا کر کھاتے ہیں۔ وہ اس مصیبت سے بری ہیں، کچا ہی کھا لیتے ہیں، آپ اگر ان کے گھاس دانہ سے نفرت کرتے ہیں تو وہ آپ کے زردہ پلاؤ سے نفرت کرتے ہیں۔

غرض کوئی طبعی فن ایسا نہیں۔ جس میں وہ آپ کی ہمسری کا دعوی نہ کر سکیں۔ آپ سیاست کے مدعی ہوں گے تو شہد کی مکھی اور بطخ سامنے آ کر اس دعوائے خصوصیت کو باطل کر دے گی آپ کپڑا بننے اور جال بنانے کا فن کا دعوی کریں گے تو مکڑی سامنے آ کر بولے گی کہ یہ کام میں بھی کر سکتی ہوں، آپ فنِ طب کی مہارت کا دعوی کریں گے تو بندر اچھل کر کہے گا کہ جڑی بوٹی کی خاصیتیں کچھ میں بھی جانتا ہوں۔ اور میں زہر کا تریاق جانتا ہوں۔ آپ فنِ پرواز کے مدعی ہوں تو پرندے سامنے آ کر کہیں گے ہم اس فن میں تم سے زیادہ ماہر ہیں۔ آپ انجینئری اور فنِ خانہ

سازی کے مدعی ہوں گے تو ہر چرند پرند اور درند آپ کے مقابلہ میں آ کر کہے گا کہ یہ کام ہم سب جانتے ہیں۔ رہنے سہنے، لباس پہننے، علاج کرنے، مکان بنانے اور تنظیم وسیاست وصنعت کاری کرنے میں شریک ہیں۔

تو ان فنون کی وجہ سے تو انسان ان جانوروں سے افضل نہیں ہوسکتا۔ افضلیت کسی خصوصیت کی بنا پر ہوتی ہے۔ جو اس میں ہو، اور اوروں میں نہ ہو۔ تو حقیقت یہ ہے کہ وہ علم جو صرف انسانوں میں ہے اور اس کے سوا اور کسی میں نہیں۔ وہ علم شرائع اور علم احکامِ خداوندی ہے، جس سے اللہ کی معرفت ہوتی ہے اور انسان اس علم کے ذریعے سعادت کے درجات طے کرتا ہے اور نیابت خداوندی کا مستحق ٹھہرتا ہے یہ علم کسی بھی غیر انسان میں نہیں پایا جاتا۔ نہ ملائکہ میں یہ علم موجود ہے نہ جنات اس علم سے آراستہ ہیں۔ نہ حیوانات واقف ہیں تو جمادات ونباتات کیا واقف ہوتے؟

یہ علم خصوصیت ہے انسان کی۔ علم شرائع صرف اس کی قسمت میں ہے جس نے اسے سب مخلوقات پر فوقیت وفضیلت دی، جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ علم بغیر پیغمبری کے نہیں آسکتا۔ کیوں کہ یہ علم اللہ کی مرضیات ونامرضیات کے جاننے کا علم ہے اور کسی کی مرضی بلا اس کے بتلائے ہرگز معلوم نہیں ہوسکتی۔ اور اللہ ہر کس وناکس کو اپنے اندر کی بات نہیں بتلاتا سو اس کے لئے اس نے نوع انسانی کو مخصوص فرمایا اور اس میں بھی برگزیدہ تر طبقہ انبیاء علیہم السلام کا تھا تو اس نے انہیں اپنی مرضیات ونامرضیات سے آگاہ کیا اور بتلایا کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوتا ہوں۔ اسے کرو اور فلاں چیز سے ناخوش ہوتا ہوں اسے نہ کرو یعنی امر ونہی بتلایا پس امر ونہی کے قانون کو شریعت کہتے ہیں۔ اس شریعت کے علم کے لئے نبوت رکھی اور یہ نبوت نوع بشری ہی کے ساتھ مخصوص رکھی اور نبوت کے علوم صرف انسان کو دیئے۔

انسانیت کا مدار ہی علوم الٰہیہ ہیں..... یعنی چار ذی شعور مخلوق، ملائکہ، جنات، حیوانات انسان۔ میں سے علم صرف انسان کو بخشا باقی تین اقسام ملائکہ، جنات اور حیوانات کو یہ علم نصیب نہ ہوا یا کسی قدر ہو تو انسان کے طفیل اور اس کے واسطہ سے ہوا، سو اس میں اصل انسان ہی رہا۔ جس میں کوئی مخلوق اس کی ہمسری تو بجائے خود ہے شرکت کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتی۔ اس سے واضح ہوا کہ علوم طبعیہ، علوم وھمیہ، علوم خیالیہ، علوم عقلیہ وغیرہ انسان کی خصوصیات نہیں یہ اور انواع کو بھی میسر ہیں، کیوں کہ یہ تمام علوم اپنے اندرونی قویٰ سے ابھرتے ہیں اور وہ قویٰ جانداروں میں کم وبیش سب میں رکھے گئے ہیں، عقل ہو یا خیال، وہم ہو یا طبعیت ہر ایک کی چیز ہے اس لئے ان کے ذریعہ جو تصور بھی جاندار کو بندھے گا، اس سے خود اس کے نفس کی مرضی اور نامرضی اور خواہش وطلب کھلے گی۔

خدا کی مرضی نامرضی اور خدا کے مطلوبہ کاموں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ کیوں کہ خدا کی پسند ناپسند اس کے اندر سے آئے ہوئے علم سے سمجھ آسکتی ہے، اور وہی وحی کا علم ہے جو نبوت ورسالت کے ذریعے آتا ہے اور یہ صرف انسان کو دیا گیا ہے۔ اس سے نمایاں ہوگیا کہ انسان کی خصوصیت علوم طبیعہ، علوم وہمیہ، علوم خیالیہ، علوم شیطانیہ نہیں بلکہ علوم الٰہی ہیں، علوم نبوت اور علوم رسالت ہیں جو انسان کے سوا کسی کو میسر نہیں، اس لئے انسان اگر ساری مخلوقات پر برتری اور افضلیت کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ تو وہ علوم شرعیہ کے ذریعے کرسکتا ہے۔ نہ کہ علوم طبیعہ وعقلیہ،

وہمیہ کے ذریعہ کہ یہ علوم انسان کے سوا اوروں کو بھی میسر ہیں۔

دوسرے لفظوں میں نہ صرف یہی کہ اس علم سے انسان کی برتری اور فضیلت ہی ثابت ہوتی ہے، بلکہ اس کی انسانیت کا مدار بھی اس علم پر ہے، کیوں کہ جب یہ علم ہی انسان کی خصوصیات ٹھہرا کہ یہ علم نہ ہو تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ انسان اس وقت تک انسان نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ وہ اس علم سے بہرہ ور نہ ہو کیوں کہ جس چیز کی خصوصیت ختم ہو جائے۔ جس سے وہ چیز وہ چیز تھی تو پھر وہ شی وہ شی نہیں رہتی۔ اگر آپ میں خصوصات باقی نہ رہے تو آپ آپ نہ رہے، اگر خصوصیت انسان انسان میں ہو تو انسان انسان کہلائے گا ورنہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں وہ مکان بنانے، کھانے پینے علاج معالجہ کرنے میں انسان کے برابر ہیں۔

پس جب انسان کی خصوصیت یہ علم الٰہی ہے، جس سے وہ مرضیاتِ الٰہی سمجھ لیتا ہے تو یہ علم الٰہی جب انسان میں ہوگا تو اس کا نام انسان ہوگا، ورنہ ایک کھاتا پیتا حیوان رہ جائے گا، کیوں کہ کھانے پینے پہننے کو کتنا ہی خوش نما بنائے اور علمی رنگ میں نمایاں کرے تب بھی رہے گا جانور ہی، کیوں کہ جانور بھی یہ علوم اپنے اندر رکھتے ہیں جیسا کہ واضح کیا جا چکا ہے، بہرحال یہ بات صاف ہوگئی کہ نہ کھانا انسانیت ہے نہ سیاست و تنظیم اگر کوئی ماہر فن پچاس منزل کی بلڈنگ بھی بنائے تب بھی وہ اس کی وجہ سے حیوانیت سے نہیں نکل سکتا کہ یہ کام یعنی مکان سازی اس کی خصوصیت نہیں۔ حیوانیت کی خصوصیت ہے اور اگر مکان سازی پارچہ بافی نظم کاری میں عقل کو بھی لگا دیا جس سے یہ اشیاء مزین ہوگئیں تو گو بظاہر تو وہ جانوروں سے ممتاز اور افضل ہوگیا۔ مگر حقیقت میں ان سے اور زیادہ گھٹ گیا کیوں کہ عقل جیسے پاک جوہر کو اس نے اپنی طبعیت کا خادم اور غلام بنا دیا اور سب جانتے ہیں کہ طبیعت بے شعور ہوتی ہے، اور عقل سر چشمہ شعور ہے۔ تو ایک بے شعور کا حاکم بنا کر گویا جاہل کو بادشاہ اور عالم کو غلام کر دیا یہ کہاں کی عقل ہے۔ بلکہ بدعقلی ہے، جانور اس بے ہودگی سے بری ہیں اس لئے ایسا کر کے انسان اونچا تو کیا ہوتا جانوروں سے کہیں زیادہ نیچا اور کم رتبہ ہوگیا کہ جانور طبع حیوانی کو استعمال کرتے ہوئے عقل کو اس کا غلام نہیں بناتے، اب خواہ ان میں عقل بالکل نہ ہو یا ہو تو نہ ہونے کے برابر ہو۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح رہے گی کہ انہوں نے طبعیت جیسے جاہل اور بے شعور حاکم کو اس کی جاہلانہ کارروائیوں کا عالم و فاضل نہیں بنایا اور یہ انسان طبعی حرکات کرتا ہے اور عقل سے انہیں مزین بنا کر حیوانی حرکات کو انسانی بلکہ ملکی حرکات ثابت کرنا چاہتا ہے، تو جانور سے زیادہ احمق ثابت ہوا۔

طبعی تقاضوں کی مخالفت کمال ہے...... نیز یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ طبعی تقاضوں کو پورا کر لینا کوئی کمال کی بات نہیں۔ بلکہ طبعی تقاضوں کے خلاف کرنا کمال ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں، کیوں کہ میں کھانا کھایا کرتا ہوں تو لوگ کہیں گے کہ احمق یہ کون سی کمال کی بات ہے، جانور بھی کھانا کھاتے ہیں، یہ تو طبعی تقاضا ہے اس میں نہ محنت ہے نہ مشقت اور نہ ہی اس سے انسان کی کوئی جوانمردی اور جفاکشی ظاہر ہوتی ہے ورنہ سارے جانور بھی فضلاء اور باکمال ہوں گے یا اگر کوئی کہے گا کہ میں بڑا فاضل آدمی ہوں کیوں کہ میں رات کو پڑ کر سوتا ہوں تو بھی

کہا جائے گا کہ یہ تو ایک غیر اختیاری اور طبعی فعل ہے جانور بھی کر لیتے ہیں تو اس میں کمال کی بات کیا ہوئی؟

کمال نام ہے خلاف طبع کرنے کا کہ اس میں انسان کی محنت جفاکشی اور تحمل وصبر کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی کو سنایا جائے کہ وہ مہینوں کھانا نہیں کھاتا تو لوگ اسے باکمال سمجھ کر اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں کہ واقعی خلاف طبع پر قابو پالینا کمال ہے نہ کہ طبع کا غلام بن کر طبعی تقاضوں کو پورا کر لینا کمال ہے۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔

حجۃ الاسلام سیدنا الامام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا بصیرت افروز واقعہ...... ابھی جس بزرگ کا نام نامی آپ کے سامنے لیا گیا تھا یعنی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، جن کا علم وفضل اور کمال ظاہری وباطنی معروف ہے، ان کا زمانہ اور پنڈت جی دیانند سرسوتی کا زمانہ ایک ہے۔ پنڈت دیانند ہندوؤں کے فرقہ آریہ سماج کے بانی ہیں۔ انہوں نے قصبہ رڑکی میں اسلام پر اعتراضات کئے، علماء نے دندان شکن جوابات دیئے اور کہا کہ اگر جرأت ہے تو میدان میں آ کر بحث کرو، اس نے کہا کہ تم لوگ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں تو صرف ''مولبی کاسم'' سے بحث کروں گا۔ چنانچہ رڑکی کے علماء نے حضرت کو خط لکھا۔ کہ ایسا واقعہ درپیش ہے آپ تشریف لاویں باوجودیکہ حضرت مولانا قاسم بیمار تھے۔ مگر مذہب اسلامی کی حفاظت و اشاعت کی خاطر اپنے چند شاگردوں کے ساتھ رڑکی تشریف لے گئے۔

جن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب محدث دارالعلوم دیوبند، مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہی۔ مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری اور دیوبند کے مشہور ادیب منشی نہال احمد وغیرہ حضرت کے خدام خاص شریک سفر تھے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ دیوبند میں کل ڈیڑھ ذہین ہیں، پورے ذہین حکیم مشتاق احمد صاحب اور آدھے ذہین منشی نہال احمد ہیں ان میں سے جب کوئی میرے وعظ میں بیٹھ جائے تو مضامین کی آمد شروع ہو جاتی ہے کہ سمجھنے والے موجود ہیں۔

حضرت نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ رڑکی پہنچے۔ تو انہوں نے منشی نہال احمد کو پنڈت دیانند کے پاس بھیجا کہ تا کہ وہ پنڈت جی سے مباحثہ کی شرائط طے کریں، جب منشی صاحب پنڈت جی کی قیام گاہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ پنڈت جی کھانے کی میز پر بیٹھ چکے ہیں، کھانے سے فارغ ہو کر بات چیت کریں گے۔ اتنے میں پنڈت جی کے لئے ایک بڑی لمبی چوڑی (پیتل کی سینی) میں کھانا آیا۔ جس میں تقریبا چار پانچ سیر پوریاں، دو ڈھائی سیر حلوا اور اسی مقدار میں ترکاری تھی گویا دو تین دھڑی کا ملبہ سینی میں دیکھا گیا جو پنڈت جی کے لیے لایا گیا تھا۔ کچھ منٹ بعد وہ پرات صاف ہو کر باہر آئی جس میں ایک حبہ بھی باقی نہ تھا، منشی صاحب سمجھے کہ پنڈت جی کے ساتھ کھانے میں اور لوگ بھی شریک ہوں گے کیوں کہ ایک آدمی بھلا اتنا کہاں کھا سکتا ہے، منشی صاحب کمرہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ اکیلے پنڈت جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے خیال کیا کہ شاید لوگ کسی دوسرے دروازے سے نکل گئے ہوں گے، مگر دیکھا کہ کمرہ میں کوئی دروازہ ہی نہیں۔ پھر انہوں نے خادم سے پوچھا بھی کہ اس کھانے میں کیا

اور بھی پنڈت جی کا شریک تھا؟ اس نے کہا کہ نہیں صرف پنڈت جی ہی نے کھانا کھایا ہے۔ منشی صاحب حیران رہ گئے کہ یا اللہ ایک آدمی اور اتنا کھانا، بہر حال پنڈت جی سے مباحثہ کے متعلق گفتگو ہوئی اور منشی صاحب نے واپس آ کر حضرت سے ساری گفتگو نقل کر دی، اس سلسلہ میں سنانا یہ ہے کہ منشی جی حضرت کے پاس سے الگ ہو کر جب اپنے ہم جولیوں میں بیٹھے تو منشی صاحب نے کہا کہ بھائی مجھے ایک بات کی بڑی فکر ہوگی، وہ یہ کہ اگر مسائل میں پنڈت جی سے مناظرہ ہوا تو یقین ہے، ہمارے حضرت جیت جائیں گے، کیوں کہ بحمد اللہ حق پر ہیں۔

لیکن یہ فکر ہے کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ کیوں کہ پنڈت جی تو پندرہ سیر کھا کے بھی دم نہیں لیں گے، اور ہمارے حضرت آدھی چپاتی ہی کھا کر بیٹھے رہیں گے، تو یہ بات کیونکر بنے گی۔ بات ہنسی کی تھی۔ تمام احباب سن کر ہنس پڑے اور بات ختم ہوگئی۔ لیکن شدہ شدہ یہ بات حضرت تک پہنچ گئی تو منشی جی کو بلایا اور کہا کہ آپ نے کیا کہا تھا۔

منشی جی گھبرائے فرمایا کہ: میں بات سن چکا ہوں مگر پھر بھی تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ مجھے اس کا جواب دینا ہے، منشی جی نے ڈرتے ڈرتے اپنا مقولہ دہرایا۔ فرمایا کہ: اس کے دو جواب ہیں، اول الزامی جواب ہے اور وہ یہ کہ کیا ساری باتوں کے مناظرہ کے لئے میں ہی رہ گیا ہوں۔ آخر تم لوگ کس لئے ساتھ آئے ہو۔ کھانے میں بحث ہوئی تو تم مناظرہ کر لینا، دوسرا جواب تحقیقی ہے اور وہ یہ کہ (حضرت نے ذرا چیں بہ چیں ہو کر فرمایا) تم اتنے دن صحبت میں رہے، تمہارے ذہن میں یہ سوال کیونکر پیدا ہوا کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ مناظرہ علم میں ہوتا ہے یا جہالت میں؟ کھانا بھیمیت کی علامت ہے اور بھیمیت جہالت کا شعبہ ہے تو کیا تم مجھے بھیمیت اور جہالت میں مناظرہ کرانے کے لیے یہاں لائے ہو؟ اگر بھیمیّت میں مناظرہ ہوا تو ہم بہائم مقابلہ کے لئے پیش کر دیں گے، ہم پنڈت جی کے مقابلہ میں بھینسے کو پیش کریں گے، اونٹ کو پیش کریں گے، اور بات بڑھی تو ہاتھی کو پیش کریں گے، کہ کھاؤ کتنا کھاتے ہو؟

پھر فرمایا کہ: مناظرہ علم کا شعبہ ہے نہ کہ کھانا، تو تمہارے ذہن میں یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ کیوں کہ مناظرہ علم کے دائرہ کی چیز ہے اس کا مناظرہ ہوا تو انسان پیش کیا جائے گا، جو ذی علم ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو ہم کہیں گے کہ کھانا کھانے کے بعد ہمیں بھی اور پنڈت جی کو بھی ایک مقفل کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے اور چھ مہینہ کے بعد کھولا جائے اور جو تر و تازہ نکلے سمجھئے کہ وہ حق پر ہوگا۔

اھل اللہ کا ذریعۂ حیات ...... اس سلسلہ میں میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے وفات سے چند ماہ پیشتر فرمایا کہ اب مجھے بقاء حیات کے لئے بحمد اللہ کھانے پینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اتباع سنت کے لئے کھاتا پیتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ذکر اللہ رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ تو وہی ذریعہ حیات بن جاتا ہے، جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کی شان ہے کہ وہ اظہار عبدیت اور امت کے لئے نمونہ عمل

چھوڑنے کے لئے کھاتے پیتے ہیں اور وہ بھی انتہائی قلیل مقدار میں، اور وہ بھی بے حد سادہ کھانا، جیسے جو وغیرہ اور وہ بھی بے شمار فاقوں کے ساتھ، اس سے واضح ہوا کہ طبعی تقاضوں کی مخالفت اور ان کے ترک کا نام کمال ہے، جو جوانمردی ہے۔ طبعی تقاضے پورا کر لینے کا نام کمال نہیں۔ یہ کمال ہے تو ہر جانور میں ہے۔

ایسے ہی فنون طبعیہ میں بڑھ جانے اور ترقی کر جانے کا نام علم اور کمال علم نہیں ہے یہ طبعی علوم بقدر بساط حیوانات میں بھی ہیں۔ علمی کمال یہ ہے کہ اللہ سے باتیں کر کے علم حاصل کیا جائے جو طبیعت کے تقاضوں سے بالاتر ہے اور وہ علم وحی ہے، جو صرف پیغمبروں کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتا ہے، نہ کہ نفس میں خیالات پکا کر انہیں خوبصورت طریقوں سے نمایاں کر دینے سے ملتا ہے وہ صورت علم کہلائے گا حقیقی علم نہیں اور جب یہ علم الٰہی ہی انسانی خصوصیت ہے، تو انسان کے معنی ہی علم الٰہی کے حامل ہونے کے نکلے، اس لئے انسان نام جیسے کپڑے پہننے، گھر بنا کر رہنے اور کھانا کھانے کا نام نہیں۔ ایسے ہی دو کان، دو آنکھ ایک ناک اور مخصوص صورت زیبا کے نہیں بلکہ سیرت زیبا کے ہیں، جو علم لدنی اور علم الٰہی سے بنتی ہے۔ انسان وہ ہے جس سے علم وحکمت کا چشمہ پھوٹے یا اس چشمہ سے سیراب ہو، یا اس کا حامی ہو اس لئے حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا: ''اَلدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ مَلْعُوْنٌ مَافِيْهَا اِلَّا عَالِمٌ اَوْمُتَعَلِّمٌ'' ① ''دنیا ملعون جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی ملعون سوائے عالم کے یا متعلم کے یا ان کے حامی اور دلدادہ کے'' اور وہ علم جو عالم یا متعلم سیکھتا سکھاتا ہو کتاب وسنت کا علم ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ ''اِنَّمَا الْعِلْمُ اٰيَةٌ مُحْكَمَةٌ اَوْسُنَّةٌ قَائِمَةٌ اَوْفَرِيْضَةٌ عَادِلَةٌ'' ② لاشبہ علم یا محکم آیت (قرآن) ہے یا سنت قائمہ ہے یا فریضہ عادلہ جو کتاب وسنت کے مشابہ ہو یعنی قیاس مجتہد یہ علم صرف انبیاء سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ عقل وطبع یا وہم وخیال سے۔

علم نبوی محنت اور مجاہدات سے ہی حاصل ہوتا ہے..... مگر یہ علم آتا ہے محنت اور خلاف طبع مجاہدے اور ریاضت کرنے سے کیوں کہ یہ علم علوم طبعیہ وعقلیہ کی طرح طبعی نہیں اس لئے سب علوم سے افضل ہے کیوں کہ امور طبعیہ کا انسان سے سرزد ہونا عجیب نہیں۔ عجیب یہ ہے کہ اس میں ایک چیز نہ ہو اور وہ آ جائے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سوال فرمایا۔

بتاؤ کہ ایمان عجیب کن لوگوں کا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ملائکہ کا ایمان۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ملائکہ کو کیا ہوا جو وہ ایمان نہ لائیں۔ ہر وقت وہ تجلیات ربانی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جنت، دوزخ ان کے سامنے ہے، وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو اور کون لائے گا؟ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ انبیاء کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: انبیاء ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟ رات دن تو ان پر

① روایت حسن ہے۔ السنن للترمذی، کتاب الزهد، باب ماجاء فی هوان الدنيا على الله عزوجل، ج:۴، ص: ۵۶۱ رقم ۲۳۲۲.

② السنن للترمذی، کتاب الزهد، باب ماجاء فی هوان الدنيا على الله عزوجل، باب منه ج:۸ ص: ۳۰۲.

ملائکہ اترتے ہیں، اللہ کی وحی ان پر آتی ہے، جلال و جمال خداوندی ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، معجزات ان کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟

تو پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! پھر سب سے زیادہ عجیب ایمان ہمارا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں کیا ہوا جو تم ایمان نہ لاؤ۔ پیغمبر تمہارے سامنے ہے معجزات تم بچشم خود دیکھتے ہو۔ وحی تمہاری آنکھوں کے سامنے اترتی ہے۔ تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون لائے گا؟ تو پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ: ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ'' خدا تعالیٰ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ عجیب ایمان کن لوگوں کا ہے؟ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان عجیب ان لوگوں کا ہے جو تمہارے بعد آئیں گے۔ نہ پیغمبر ان کے سامنے ہوں گے نہ معجزات ان کے مشاہدہ میں آئیں گے اور اوپر سے شکوک وشبہات ڈالنے والے ہزاروں ہو ں گے مگر پھر بھی وہ ایمان لائیں گے اور اس پر جمیں گے تو ان کا ایمان عجیب ہوگا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو چیز موانع کی کثرت اور رکاوٹوں کے ہجوم میں حاصل کی جاتی ہے وہی زیادہ عجیب ہوتی ہے ورنہ اگر کسی چیز کے معدات اور مویدات بکثرت ہوں اور اس کی طرف جھکانے والے اسباب بہت ہوں، رکاوٹ بالکل نہ ہو تو اس کا حاصل کر لیا جانا زیادہ عجیب نہیں ہوتا، اس بنا پر کہا گیا ہے کہ ملائکہ اگر عبادت میں مصروف ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں، کیوں کہ تجلیات الٰہیہ تو ہمہ وقت سامنے ہیں اور رکاوٹیں بالکل نہیں۔ نہ ان کے پیچھے کھانے پینے کا جھگڑا، نہ بیوی بچوں کا دھندا، نہ شہوت وغضب کا قصہ تو عبادت ان کے حق میں امر طبعی ہے، اور طبیعت کے تقاضوں کا پورا کر لینا کوئی حیرت ناک بات نہیں، بلکہ اس سے رک جانا حیرت ناک اور عجیب ہے۔

پس جیسے انسان کے حق میں کھانا پینا سونا جاگنا عجیب نہیں کیوں کہ طبعیت کا تقاضا ہے ایسے ہی عبادت کرنا فرشتوں کے حق میں طبعی بات ہے جس کو بجالانا عجیب نہیں۔ عبادت اگر عجیب ہے تو انسان کے حق میں ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی ساری نفسانی خواہشات اور طبعی تقاضوں کو پامال کر کے اور بالفاظ دیگر اپنے نفس کو قتل کر کے رکوع وسجود میں لگتا ہے۔

انسان کی عبادت فرشتوں کی عبادت سے بدرجہا افضل ہے...... انسان کا ایک سجدہ فرشتوں کی ہزاروں برس کی عبادت سے عجیب بلکہ افضل ہے کیوں کہ وہ نفس کشی پر مبنی ہے نہ کہ نفس کے تقاضوں پر وہ صبح کے وقت گرم لحاف میں سے اٹھ کر اور خواہشات نفس کے خلاف سردی میں پانی سے وضو کر کے اور اوپر سے اپنا گھر چھوڑ کر خدا کے گھر کی طرف دوڑتا ہے اور سجدوں میں لگتا ہے۔ نفس اسے نیند کے لئے آمادہ کرتا ہے کہ یہ نرم نرم بستر سے نہ اٹھے۔ ہاتھ پیر کو وضو کے پانی سے ٹھنڈا نہ کرے۔ سرد ہواؤں میں سکڑتا ہوا مسجد کی طرف نہ جائے۔

مگر وہ ان ساری طبعی خواہشات پر لات مار کر محض اپنے مالک کی رضا کے لئے جاتا ہے اور مسجد میں پہنچ کر خداوند کریم کے حکم کی تعمیل دل وجان سے کرتا ہے تو یہ مخالفت نفس ملائکہ میں کہاں؟ اور یہ نفس کشی اور جہاد نفس ملائکہ کو کہاں میسر؟ کہ وہاں نہ نفس امارہ ہے نہ ہوائے نفس ہے کہ اس کا مقابلہ کیا جائے اور جہاد کر کے نفس کو پچھاڑا

جائے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ملائکہ کی توہین کر رہا ہوں۔ العیاذ باللہ۔ وہ اللہ کے مقدس بندے ہیں۔

﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار بندے ہیں، جن سے کبھی بھی گناہ و معصیت کا صدور ممکن نہیں ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ ① ان کی توہین کفر ہے اور ان پر ایمان لانا واجب ہے۔ یہ صرف بیان حال ہے کہ ان کی عبادت بلا مزاحمت نفس ہے۔

انسان کی عبادت پوری مزاحمت نفس ہے...... اور انسان کی عبادت پوری مزاحمتِ نفس سے ہے۔ مقصد یہ ہے کہ طبیعت کے تقاضوں کو پورا کرنا کمال نہیں بلکہ خلاف طبیعت کرنا کمال ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کی طبیعت اس کی متحمل نہیں کہ اس میں علم آئے بلکہ جہالت اس کی طبیعت کا تقاضا ہے، اس کی جبلت میں جہل ہے علم نہیں۔ کوئی انسان ماں کے پیٹ سے ہنر لے کر نہیں آتا۔ محنت و ریاضت سے ہنر پیدا کرتا ہے طبیعت کو مار کر علم حاصل کرتا ہے جو عجیب بھی ہے۔ اور کمال بھی ہے۔ کمال اس لئے ہے کہ مجاہدے سے اسے حاصل کیا جس سے اس کے اندرونی قویٰ کی قوت اور کارگزاری نمایاں ہوتی ہے اور عجیب اس لئے ہے کہ وہ انسان جو ایک گندے قطرہ سے بنایا گیا ہے۔ اور جماد لَا يَعْقِل مادہ (نطفہ) سے تیار ہوا۔ نہ نور سے بنا نہ نار سے۔ بلکہ پامال خاک سے جس میں شعور کا نشان نہیں اور پھر ایسا باشعور نکلا کہ دنیا بھر پر فوقیت لے گیا۔ نوری ملائکہ پر فائق ہوا اور ناری جنات پر غالب آ گیا محض علم کے کمال سے۔

انسان اور ملائکہ کے علم کا فرق!...... تو علم کا ان گندے مادوں اور کثیف جسموں میں اتار لینا کمال نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور اس عجیب وغریب کمال سے اگر وہ ساری کائنات سے بازی لے جائے تو اس تامل کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ پس ملائکہ میں اگر علم آتا ہے تو یہ ان کا طبعی تقاضا ہے اور ان کا علم ان کے اندرون سے ہے اور اندرون میں رہتا ہے۔ اس لئے پھیل نہیں سکتا جتنا ہے اتنا ہی رہے گا، لیکن انسان مجاہدہ سے علم حاصل کرتا ہے اور جو چیز اس کے اندر نہیں ہے۔ وہ باہر سے لاتا ہے اور اسے علم حاصل کرنے کیلئے مشقت و مجاہدہ کے ساتھ کتنے ہی راستے تحصیل علم کے لئے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اور کتنی ہی منزلوں سے گزر کر وہ علم کے مختلف درجات و مراتب اور علمی مقامات تک پہنچتا ہے، اس لئے اس کا علم پھیلتا ہوا ہوتا ہے، اس میں تدبر و تفکر شامل ہوتا ہے۔ جس سے من بھر علم دس من ہو کر نمایاں ہوتا ہے۔ پس ملائکہ کا علم عطائی قسم کا علم ہے، جس میں پھیلاؤ نہیں، اور انسان کا علم تدبر و تفقہ لئے ہوئے ہوتا ہے، جس میں پھیلاؤ ہوتا ہے، یعنی فرشتے کو اگر چار مسئلے معلوم ہیں وہ چار کے چار ہی ہیں اور انسان کو چار مسئلے معلوم ہو جائیں تو وہ تدبر و اجتہاد کے ذریعے ان چار میں دس بیس مسائل اور علوم پیدا کر لیتا ہے اور نئے نئے علوم نکال لیتا ہے۔ اس لئے ملائکہ نے بمقابلہ آدم صفائی سے خود اقرار کر لیا تھا۔

انسانی علم کی فضیلت...... ﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ اور انسان کے استنباط کو اور اجتہاد کو اس کے خدا نے سراہا کہ: ﴿وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۚ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ

① پارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، الآیۃ: ۶۔

وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ﴾ ① پس علمی لائن میں انسان کی برتری ملائکہ پر ایک تو کمیت علم کے لحاظ سے ہے کہ اسے تمام اسماء کی تعلیم ملی۔ جو ملائکہ کو نہیں ملی اور دوسرے کیفیت علم کے لحاظ سے ہے کہ ملائکہ اپنی معلومات میں تفقہ واجتہاد سے کوئی اضافہ نہیں کر سکتے اور انسان کرتا ہے، پس اللہ نے انسان کو سب سے زیادہ علم بھی دیا اور اس میں زیادتِ علم کی صلاحیتیں بھی رکھ دیں۔

استنباط وارتقائے علم صرف انسانی علوم کا خاصہ ہے ...... پس علم اور ارتقائے علم درحقیقت انسان ہی کی خصوصیت ثابت ہوتی ہے، جو دوسری مخلوقات میں نہیں اور ظاہر ہے کہ جامع علم شاہیت کی شان ہے کیوں کہ بادشاہ کا کام مزدوری کرنا نہیں۔ بلکہ اپنی مملکت کا علم رکھنا ہے تا کہ احکام دے سکے۔ اس لئے جب انسان کو سب سے زیادہ علم دیا گیا تو قدرتی طور پر نیابت وخلافت خداوندی بھی اسی کا کام ہوسکتا تھا جو اسے مل گیا۔ اور اس کائنات کا سارا انتظام اس کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ نائب الٰہی بن کر اس کی کائنات پر حکم چلائے، کائنات سے کام لے۔ اور اس میں حسب منشاء تصرفات کرے۔ اس لئے وہ حیوانات سے الگ کام لیتا ہے۔ جمادات سے الگ بیگار لیتا ہے، زمین سے آسمان تک اس کے تصرفات چلتے ہیں۔ وہ اس مادی کائنات کے مادوں میں علم کی طاقت سے جوڑ توڑ کر نئی نئی ایجادات کرتا ہے اور اس طرح اپنے علم کی وسعت کا ثبوت دیتا رہتا ہے، سب سے پہلے علم یہ ہے کہ شی کا نام معلوم ہو کیوں کہ علم میں سے نئی نئی باتیں نکالنا اور پھر عمل وصنعت میں نئی نئی اختراعات کرنا نہ فرشتوں سے بن پڑا نہ جن وحیوان سے۔

استعدادِ علم کی ترقی ...... بلکہ صرف انسان سے۔ تو حق تعالیٰ کی ازلی عنایت اس پر متوجہ ہوئی اور اسی کو اس نے اپنی توجہ وعنایت سے تدریجی طور پر علم سکھلایا۔ چنانچہ علم کا بالکل ابتدائی مرتبہ شی کا نام معلوم ہونا ہے۔ اگر نام ہی معلوم نہ ہو تو اسکی طرف توجہ ہی محال ہے اس لئے کہ مجہول مطلق کی طرف توجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ پس حق تعالیٰ نے اپنے سب سے پہلے شاگرد حضرت آدم علیہ السلام کو اشیاء کے نام سکھلائے۔ جو علم کی ابتدائی منزل ہے۔

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا﴾

شی کا نام معلوم ہو جانے پر طبعًا آدمی کا جی چاہتا ہے کہ میں اس کو دیکھ بھی لوں۔ جس کا نام سنتا آ رہا ہوں تو پھر حق تعالیٰ نے وہ ناموں والی کائنات پہچانوائی کہ وہ معلوم الاسماء اشیاء فلاں فلاں ہیں۔ تو زمین وآسمان اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے انہیں پیش کیا۔ پس ان کے خواص وآثار بتلائے۔ پھر ان کے نتائج وغایات پر مطلع فرمایا۔ پھر ان سے کام لینا سکھلایا اور پھر ان سے نفع حاصل کرنے کے طریقے سکھلائے۔ غرض درجہ بدرجہ عالم بشریت علمی ترقی کرتا رہا اور انبیاء علیہم السلام یکے بعد دیگرے معلم بن کر آتے رہے۔ اور علم کے مراتب کی درجہ بدرجہ تعلیم دیتے رہے۔

تکمیل علم وخلافت ...... یہاں تک کہ جب انسانی استعداد جامع علم کی متحمل ہوگئی اور قرنہا قرن گزرنے اور علمی

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۸۳.

مشق کرنے کے بعد وہ ہمہ گیر علم کے لئے مستعد ہوگئی تو آخری معلم حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بنا کر بھیجا۔ جنہوں نے حقائق الٰہیہ کی تعلیم دی اور علم کو کامل کرتے ہوئے اس کے ہر ہر حکم کی علت اور لِم پر مطلع فرمایا۔ جس سے انسان نے حقیقت علم کا سراغ پایا اور وہ قرآن حکیم کے جامع علم سے روشن ضمیر بنا۔

پس وہ خلافت جو حضرت آدم علیہ السلام کے دور میں اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں وہ اپنے انتہائی مقام پر پہنچ گئی، کیوں کہ اس کا مبنیٰ علم تھا، علم ابتداء میں علم الاسماء کے ابتدائی دور میں تھا، تو اس پر مبنی شدہ خلافت بھی ابتدائی ادوار میں رہی اور وہی علم جب ترقی کر کے حد کمال پر پہنچ گیا کہ اس کے بعد کسی نبی ہی کے آنے کی گنجائش نہ رہی۔

جو کوئی نیا علم اور نئی شریعت لے کر آئے تو خلافت بھی حد کمال پر پہنچ گئی۔ چنانچہ خلافت ظاہری تو حقائق کائنات کی تسخیر ہے، جس کے ذریعے عناصر اربعہ کے عجائبات نمایاں ہوں۔ اور خلافت باطنی حقائق الٰہیہ کی تحصیل ہے۔ جس کے ذریعہ روحانیات کے عجائبات نمایاں ہوں۔ سو ظاہر ہے کہ دور محمدی میں یہ دونوں ہی خلافتیں حد کمال کو پہنچ گئیں۔ ایک سے ایک محیر العقول مادی ایجادات انتہا کو پہنچ رہی ہیں۔ جو عقل و نفس کے کمال کی دلیل ہے۔ اور ایک سے ایک حیرت ناک علمی و روحانی اجتہادات انتہا کو پہنچے جو تفقہ نفس کے کمال کی دلیل ہے۔ غرض تعقل اور تفقہ یا عقل نفسانی اور فقہ روحانی دونوں حد کمال کو پہنچ گئے۔ کیوں کہ علم جامع دنیا کے سامنے آ گیا۔ اس لئے خلافت صوری واسمی بھی مکمل ہوگئی اور خلافت حقیقی و معنوی بھی تکمیل کو پہنچ گئی۔

اختصاصِ خلافت...... لیکن صورت بلا حقیقت ناپائیدار اور بے معنی ہے۔ اس لئے مادی خلافت بغیر روحانی خلافت کے بے معنی اور جسم بلا روح کی مانند ہے۔ جس کے لئے نہ بقا ہے۔ نہ پائیداری اس لئے اصل خلافت وہی علمی خلافت کہی جائے گی جس سے انسان کا کامل امتیاز ساری کائنات پر نمایاں ہوگا۔ تاہم یہ دونوں خلافتیں انسان ہی کو دی گئیں، نہ ملائکہ کو ملیں نہ جنات و حیوانات کو کیوں کہ علم کا یہ مقام اور کسی کو نہیں ملا۔ ہاں یہ علم انسان ہی میں کیوں ترقی کر سکتا تھا اور کیوں وہ بہائم یا جنات یا ملائکہ میں ترقی پذیر نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ بھی دونوں قسموں کی خلافتوں کے مستحق ہو جاتے۔

مادی ترقی عناصر کے تصادم و ٹکراؤ کا نتیجہ ہے...... سو اس کی بناء یہ ہے کہ علم کی ترقی ہو یا صنعت و عمل کی۔ بغیر تصادم اور ٹکراؤ کے نہیں ہوتی۔ بلکہ ترقی نام ہی ٹکراؤ اور تصادم کا ہے کہ اس کے بغیر علم اور قدرت کے مخفی راز آشکارا نہ ہو سکتے کیوں کہ یہ ایک فطری اصول ہے کہ بسیط مادہ میں ترقی نہیں ہوتی۔ جب تک کہ اسے اس کی ضد سے ترکیب دے کر ٹکرایا نہ جائے۔ مثلاً محض آگ میں کوئی ترقی نہیں۔ جس طرح ہزاروں سال پہلے وہ جلتی اور بھڑکتی تھی، اسی انداز میں آج بھی جلتی اور بھڑکتی ہے۔ یہ نہیں کہ ہزار دس ہزار برس کے بعد اس کی لپٹ اور رنگ نے ترقی کر کے کوئی نئی صورت یا جدت پیدا کر لی ہو۔

اس کے کسی انداز میں نہ اضافہ ہے نہ ترقی۔ اس طرح محض پانی میں کوئی ترقی نہیں۔ سمندر کئی ہزار سال پہلے جس طرح ٹھاٹھیں مار کر اچھل کود کرتا تھا۔ اسی طرح آج بھی کر رہا ہے۔ نہ اس کے تموج نے کوئی جدت پیدا کی نہ جزر و مد نے وہی تموج آج بھی ہے، جو دس ہزار سال پہلے تھا۔ نیز سمندر بھی وہیں کا وہیں ہے جہاں پہلے تھا۔ اب بھی ہے جو پہلے تھا۔ کوئی رخ تبدیل نہیں۔ نہ اس کا رخ بدلا، نہ دھارا بدلا اسی طرح ہوا جیسے پہلے چل رہی تھی۔ اب بھی اسی انداز سے چل رہی ہے۔ زمین جیسے پہلے ایک تودۂ خاک تھی۔ اب بھی ہے، نہ اس میں کوئی جدت ہے نہ ندرت نہ ترقی ہے۔ نہ ارتقاء، لیکن اگر ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے ٹکرا دو، تو ترقی وہیں شروع ہو جائے گی۔ مثلاً پانی کو ایک برتن میں بھر کر اور بیچ میں ایک پردہ دے کر دوسری طرف آگ دھکا دیں کہ آگ پانی پر، حملہ آور ہو۔ اور پانی آگ پر وہ اسے ٹھنڈا کر دینا چاہے اور یہ اسے گرما دینا چاہے۔ تو ان دونوں کے ٹکراؤ سے ایک تیسری چیز پیدا ہو جائے گی۔ جسے بھاپ یا اسٹیم کہتے ہیں اور اس سے ملیں اور مشینیں چلنے لگیں گی۔ اور تمدنی ترقی شروع ہو جائے گی اگر آگ کو پانی سے ٹکر نہ دی جاتی تو محض آگ یا محض پانی سے کوئی انجن یا مشین نہ چل سکتی۔ تو یہ تمدنی ترقی دو عنصروں کے تصادم اور ٹکراؤ کا نتیجہ ہے، جو تنہا ایک عنصر سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح اگر ہوا کو آگ سے ٹکرا دیا جائے اور فضا میں مثلاً آفتاب کی گرمی سے برسنے والی آگ ہوا کے جھونکوں سے متصادم ہوتی ہے تو شہاب ثاقب اور گرجنے والے رعد و برق پیدا ہوتے ہیں جن سے جو کے عجائبات نمایاں ہوتے ہیں۔

اور ساکن فضاء میں نئے نئے حوادث رونما ہوتے ہیں جو محض آگ یا محض ہوا سے نمایاں نہیں ہو سکتے اسی طرح اگر مثلاً مٹی اور پانی کو ملا دیا جائے کہ مٹی تو پانی کے سیلان اور رقت کو ختم کر دینا چاہتی ہے اور پانی مٹی کے جماؤ اور انجماد کو مٹا دینا چاہتا ہے تو ان دونوں کی ٹکر سے گارا پیدا ہو جائے گا۔ اور اس سے اینٹیں بننے لگیں گی جن سے مکانات کی تعمیر ممکن ہوگی پھر اس گارے سے برتن بننے لگیں گے، جن سے تمدن کی ترقی ہوگی اور نئے نئے ڈیزائن کے ظروف و مکان اور سامان تیار ہو جائیں گے۔ اگر تنہا مٹی اور پانی اپنی اپنی جگہ پڑے رہیں تو یہ ترقی کبھی بھی رونما نہ ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ ترقی نام تصادم کا ہے، تصادم نہ ہو تو ترقی بھی نہ ہو ان اکوان کو چھوڑ کر اعیان میں لو، تو دو پہلوان مثلاً فن کشتی و سپہ گری کے ماہر ہوں۔

لیکن کبھی بھی زور آزمائی نہ کریں اور کبھی بھی باہم کشتی نہ لڑیں تو ان کے فن اور داؤ پیچ میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر ان دونوں پہلوانوں کو باہم ٹکرا دیا جائے اور وہ کشتی لڑ پڑیں۔ تو ہر ایک کوشش کرے گا کہ دوسرے کے داؤ کی کاٹ کرے تاکہ مغلوب نہ ہو، تو ہر وقت نئے سے نیا داؤ اپنے فنی قواعد کے تحت ایجاد کرے گا اور اس طرح فن کے مخفی گوشے کھل کر فن ترقی کرے گا۔ اور دنیا کے سامنے نئے نئے داؤ پیچ کھلتے رہیں گے۔

علم و جہل، و باطل کے تصادم کی حکمت ......اسی طرح ایک عالم کتنا ہی بڑا علم رکھتا ہو۔ اس کے علم میں خود بخود کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر اس عالم سے کسی جاہل کو لڑا دو جو اس پر اعتراضات اور سوالات کی بوچھاڑ کر دے تو

اس کے علم میں سے نئے نئے گوشے جوابوں کی بدولت پیدا ہو جائیں گے جن سے اس کے علم میں زیادتی ہوگی جو بغیر اس علم و جہل کی ٹکر کے کبھی نہ پیدا ہوتی۔ اسلام حق ہے اس کا علم اور قانون سچا ہے لیکن اگر اس کے مقابلہ پر کفر نہ ہو اور وہ اس سے ٹکر نہ لیتا ہو تو اسلام کی قوتوں کے مخفی گوشے اور اس کے حقائق کے سربستہ راز جو اس میں پنہاں ہیں کبھی نہیں کھل سکتے۔ اور نہ ہی اس کی قوت نمایاں ہو سکتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اسلام کے مقابلہ پر کفر، اخلاص کے مقابلہ پر نفاق، سچ کے مقابلہ پر جھوٹ، علم کے مقابلہ پر جہل، دیانت کے مقابلہ خیانت، ملائکہ کے مقابلہ پر شیاطین، انبیاء کے مقابلہ پر دجال رکھ دیئے کہ یہ اضداد ان اصول سے ٹکراتی رہیں اور اس طرح ان کی پاکیزہ قوتیں اس ٹکراؤ سے نمایاں ہو کر ان کی صداقت کھولتی رہیں۔

قوموں کے باہمی تقابل میں درسِ عبرت...... اس طرح وہ قومیں کتنی ہی جاہ و جبروت کی حامل ہوں۔ لیکن اگر ایک کی دوسری قوم سے ٹکر نہ ہو تو ان کے مخفی جوہر جو مقابلہ ہی کے وقت کھل سکتے ہیں، کبھی نہ کھلیں۔ اس لئے جب دو قومیں لڑتی ہیں تو غالب و مغلوب کے ملنے سے ہمیشہ نئے نئے نظریات اور نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں تاکہ دنیا کی وہ ترقیات جو عقل انسانی اور علمِ روحانی سے وابستہ ہیں اپنے اپنے وقت پر ان تصادموں سے نمایاں ہوں۔ اور ہر قوم کے دماغی اور قلبی جوہر کھل کر اگلی نسلوں کے لئے مزید ترقیات کا درسِ عبرت بنیں۔ ورنہ ہر قوم ماء راکد (ٹھہرے ہوئے پانی) کی طرح سڑ کر اپنے جوہروں کو کھودے اور اقوام میں اس بے فکری سے سستی، کاہلی اور تن آسانی پیدا ہو جائے اور عالم میں فساد پیدا ہو جائے۔ اس لئے عوام کو ٹکرا کر ایک دوسرے کے لئے تازیانہ عبرت بنا دیا جاتا ہے تاکہ بے فکری سے اپنے خلقی جوہروں کو ضائع نہ کرنے پائیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے اقوام کے تصادم کو خدا کے فضل و کرم سے تعبیر کیا ہے کہ اس کے بغیر نہ کائنات کے سربستہ راز ہی واشگاف ہو سکتے ہیں، نہ اقوام میں بیداری اور مستعدی پیدا ہو سکتی ہے، جو قدرت نے اس میں ودیعت رکھی تھی۔ فرمایا: ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ ①

ٹھیک اسی طرح سمجھیں کہ انسان کے سوا کائنات کی تین باشعور مخلوقات ایک ایک جوہر کی حامل ہیں۔ حیوانات میں صرف بہیمیّت ہے، جنات میں صرف شیطنت ہے اور ملائکہ میں صرف ربانیت ہے۔ اسی لئے ان میں سے کسی میں بھی ترقی نہیں کوئی محض آگ کی مانند ہے جیسے جنّات۔ کوئی محض ہوا کی مانند ہے جیسے ملائکہ کوئی محض مٹی یا پانی کی مانند ہے جیسے بہائم۔ سو نہ جنات میں کوئی ارتقائی شان ہے۔ کسی جن نے آج تک نہ کوئی ایجاد کی جس سے دنیا میں سجاوٹ پیدا ہو جاتی نہ کسی فرشتہ نے آج تک کوئی اجتہاد کیا کہ نیا منہاج اور نئی شریعت پیدا ہو جاتی نہ کسی بہیمیّت نے آج تک کوئی نیا راستہ ڈالا جس سے دنیا کو کوئی رہنمائی ملتی۔

جنّات و شیاطین جس طرح ہزاروں برس پہلے حیلہ و فریب اور فساد انگیزی کرتے تھے۔ اسی نوعیّت کا آج بھی

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۱.

کرتے ہیں۔ بہائم کھانا، پینا، چرنا اور نسل بڑھانا جیسا پہلے کرتے تھے وہی آج بھی کرتے ہیں۔ نہ بیل کے گھاس کھانے کا اور نہ نر و مادہ کے ملنے کا کوئی جدید طریقہ نکلا، نہ فرشتہ کی نیکی کرنے کا کوئی نیا راستہ نکلا۔ نہ شیاطین کے مکر و زور میں کوئی جدّت پیدا ہوئی۔ بلکہ ہزار ہا ہزار برس پہلے ان انواع کے جو طبعی افعال تھے وہی کے وہی آج بھی ہیں۔ ان میں کوئی ترقی نہیں کیوں کہ یہ سب نوعیں اپنے اندر ایک ہی مادہ رکھتی ہیں اور ان کے اندرون میں تصادم کی کوئی صورت نہیں جو ترقی کی بنیاد تھی۔

تقابل صفات سے ترقی...... بخلاف انسان کے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ ساری قوتیں جمع فرمادیں اس میں ملکیت بھی ہے۔ بہیمیت بھی ہے اور شیطنیت بھی ہے تو لازمی تھا کہ یہ متضاد قوتیں باہم ٹکرائیں اور اس ٹکراؤ سے نئے نئے افعال کا ظہور ہو جو اکہری قوتوں سے نہیں ہوسکتا تھا مثلاً بہیمیت کا کام کھانا، پینا اور نسل بڑھانا تھا لیکن جب اس کے ساتھ ملکیت ٹکرا جاتی ہے تو تیسری قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کو عفت کہا جاتا ہے اور اس سے جائز و ناجائز کی سینکڑوں صورتیں پیدا ہوتی ہیں کہ فلاں کھانا جائز، فلاں حرام، فلاں نسل کشی حلال اور فلاں حرام فلاں چیز پینی جائز اور فلاں ناجائز غرض تدیّن کے ہزاروں گوشے عفت و پاک دامنی کی بدولت کھلتے ہیں جس سے دین و دیانت ترقی کرتے ہیں۔

اور عفت درحقیقت بہیمیّت اور ملکیّت کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ جیسے آگ پانی کے ٹکراؤ کا نتیجہ بھاپ تھا۔ جس سے تمدن ترقی کرتا تھا۔ اسی طرح شیطنیت کا کام دھوکہ، فریب، دغابازی اور مکاری ہے اس کے ساتھ اگر ملکیّت کی عقل لڑادو تو تدبیر و تدبّر پیدا ہوگا، جس سے مکر وفریب کی بجائے عقل خیز تدابیر کا ظہور ہوگا اور مخفی تدبیروں کا حسن نمایاں ہوگا اور حملہ آوری اور بچاؤ کے نئے نئے نظریات سامنے آئیں گے، درندوں میں قوت غضبیہ ہے جس کا ثمرہ تخریب اور چیر پھاڑ ہے۔

کمال کا ظہور اور مادی و روحانی ترقی...... لیکن اگر اس کے ساتھ ملائکہ کی متانت و بردباری کو ٹکرا دیا جائے تو اس سے شجاعت پیدا ہوتی ہے۔ جس میں عقل و ہوش کے ساتھ جوش دکھایا جاتا ہے اور بہادری کے ساتھ دانائی کا استعمال ہوتا ہے۔ بہر حال شہوت، غضب اور مکر وفریب کے ساتھ اگر قوت عقلیہ کو لڑایا جائے تو اس سے پاکیزہ اخلاق پیدا ہوتے ہیں، اور علمی و اخلاقی اور دینی ترقیات کے دروازے کھل جاتے ہیں جو صرف انسان ہی سے ممکن ہیں۔ جن و ملک اور حیوان سے ممکن نہیں، کیوں کہ متضاد قوتوں کا مجموعہ انسان ہی ہے۔ اس لئے ترقی کی راہیں بھی انسان پر کھل سکتی ہیں۔ نہ کہ ان تین مخلوقات پر اس لئے اگر ایجادات سے دنیا کو سجایا تو انسان نے سجایا۔ ریل، تار، فون، بجلی اسٹیم، جہاز، کشتی سواری، مکان، ظروف، تجارت، حرفت، حکومت، انسان کے سوا کسی نے کر کے نہیں دکھلائی اور ادھر اجتہادت اور نقل و روایت کی استنادات دین، شریعت، مذہب، مشرب، ذوق وجدان حدس، تجربہ، علم، معرفت، قرب، طاعت، بصیرت بھی انسان کے سوا کسی نے حتیٰ کہ کسی پاکباز فرشتہ نے بھی کر کے نہیں

دکھلائی، یعنی انسان اس ترقی اوران متضاد مادوں کے ٹکراؤ سے پیدا شدہ ارتقاء کی بدولت فرشتوں سے کہیں زیادہ اونچا پہنچا اور جبرئیل کی رسائی سے بھی آگے تک اس کی رسائی ہوئی جہاں ملائکہ بھی پرنہیں مار سکتے، یہ اس کی قوت عقلیہ کے قوت شہوانیہ، قوت غضبیہ، قوت سبعیہ سے ٹکراؤ اور عقل کے غلبہ کا نتیجہ ہے۔

قوائے شرّ کا عقل پر غالب ہونے کا نتیجہ...... ہاں اگر اس ٹکراؤ میں عقل مغلوب ہو جائے اور قوتیں بمقابلہ عقل کے غالب آجائیں یعنی عقل ان مادوں کی خادم بن جائے اوران کے تقاضوں کو اپنی تدبیر سے پورا کرنے کی نوکر بن جائے تو پھر یہ بہائم سے چار ہاتھ آگے کا بھیمہ اور شیاطین سے درجوں اوپر کا شیطان بن جاتا ہے جس سے بھائم اور شیاطین بھی پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ اگر اس کی عقل بھیمیّت کا آلہ کار بن جائے تو بھائم کو وہ عیاشی اور بدکاری نہیں سوجھ سکتی جو اسے سوجھے گی۔

یہ زنا اور سیاہ کاری کی ایسی نئی نئی شکلیں ایجاد کرلے گا جو بہائم کے باپ کو بھی نہیں سوجھ سکتیں۔ اس کے ہاں عیاشی کے اڈے بن جائیں گے۔ زنا کے چکلے تیار ہو جائیں گے۔ فحاشی ایک فن اور ایک ہنر بن جائے گی اور حیوانات کے خواب میں بھی وہ حیوانیتیں نہ آئیں گی جو اس کا فحاش دماغ اور عیاش دل اختراع کرے گا اور اگر اپنی عقل کو مکروفریب کی قوتوں کا غلام بنادیا تو پھر اسے وہ حیلے اور جعلسازیاں سوجھیں گی کہ شیطان کو صدیوں غور کرکے بھی نصیب نہ ہوں گی۔ غرض ان خلقی قوتوں کے ٹکراؤ میں اگر عقل غالب رہی تو یہ احسن تقویم کا ثبوت پیش کرے گا اور اگر عقل پر شہوت وغضب اور درندگی غالب آگئی تو پھر انسان اسفل سافلین میں کھڑا نظر آئے گا۔

لیکن غور کرو تو یہ عقل ان قوتوں پر علم کے ہتھیاروں سے غالب آسکتی ہے، بلاعلم کے عقل طبعی ہے، جو بلاشبہ ان ہی طبعی قوتوں کا ساتھ دے گی اور انہیں اپنا کام کرنے کے نئے نئے راستے بتلائے گی لیکن عارف عقل جسے علم نے چمکا دیا ہو۔ ان قوتوں کو اپنی راہ پر چلائے گی، اور پھر ہر شعبہ زندگی میں انسانی کمالات کا ظہور ہوگا۔ اس لئے انسان کی فضیلت ان تینوں باشعور مخلوقات پر عقل محض سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ علم سے ثابت ہوتی ہے اور علم بھی وہ جو طبعی بھی نہ ہو اور کورا عقلی بھی نہ ہو بلکہ ربانی علم ہو جو بذریعہ وحی کے ذات حق کی طرف آتا ہے اور دلوں کو روشن کرتا ہے۔ عقلوں کو جلا دیتا ہے۔ ذہنوں کو رسا کرتا ہے۔ دماغوں کو صیقل کرتا ہے اور بالفاظ دیگر آدمی کو آدمی بناتا ہے ورنہ

آدمی کو بھی میسّر نہیں انسان ہونا

اس لئے ہمارا فطری اور عقلی فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اس شرعی اور الٰہی علم کو حاصل کریں جس سے ہماری روشنی وابستہ ہے۔

شریعت کی حکمرانی...... اور ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں اسی علم سے ہدایت حاصل کریں یعنی خلوت اور جلوت، انفراد اور اجتماع، دوستی اور دشمنی حکومت اور غلامی، خوشی اور غمی، راحت اور مصیبت، موت و حیات ہر مرحلہ پر اسی علم سے جس کا دوسرا نام شریعت ہے، رہنمائی حاصل کریں۔ اور اپنی عقل کو اس کے خادم کی

حیثیت سے ساتھ رکھیں۔ یہی قوتیں جو جہالت میں کام کرتی تھیں۔ اب علم میں کام کریں گی۔ وہی بھیمیت جو جہالت کے ساتھ عیاشی، فحاشی، بدکاری اور بے ایمانی پر لاتی تھی اب شریعت کے تابع ہو کر عفت وعصمت، پاکی، پاک دامنی اور نیکوکاری پر لے آئے گی، وہی قوت شیطنیت جو بحالت جہل مکاری، ڈپلومیسی، عیاری اور شرارتوں کی طرف لاتی تھی۔ اب تابع فرمان الٰہی ہو کر تدبیر و دانائی، دانش وبینش اور عاقبت شناسی کی طرف لے آئے گی۔ اور بالفاظ دیگر جبلتِ نفسانی سے نکال کر فطرت روحانی کی طرف نکال لائے گی۔ اس لئے خلاصہ یہ ہوا کہ طبیعت پر تو حکومت عقل کی قائم کردی جائے اور عقل پر حکمرانی شریعت اور علم الٰہی کی کردی جائے۔

اسلام کے دینِ فطرت ہونے کا معنی...... تو انسان مزکی مصفا اور مجلی ہو جائے گا ورنہ ایک بہیمہ یا ایک شیطان یا ایک درندہ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ شریعت انسان کے کسی خلقی مادہ کو ضائع کرنے یا پامال کرنے کے لئے نہیں آئی۔ بلکہ ٹھکانے لگانے کے لئے آئی ہے۔ تاکہ ہر قوت کو اس کا صحیح مصرف بتلا کر اس میں استعمال کرائے۔ یہی معنی ہیں اسلام کے دین فطرت ہونے کے، کہ اس نے ہر قوت کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ شہوت ہو یا غضب۔ سبعیت ہو یا شیطنیت کسی کو بھی بے کار نہیں ہونے دیا بلکہ ایک خاص پروگرام پر چلا دیا ہے، نیکی تو بجائے خود ہے، اس نے تو کسی بدی کو بھی علی الاطلاق نہیں مٹایا۔ بلکہ اپنے اشاروں پر چلایا ہے، مثلاً جھوٹ گناہ کبیرہ ہے۔ انسان کی جبلت میں جوش کے وقت مبالغہ آمیزی اور خلاف واقعہ کلام کر جانا داخل ہے، شریعت نے اسے کلیۃً نہیں مٹایا۔ بلکہ فرمایا کہ اگر دو لڑتے ہوئے بھائیوں میں جھوٹ بول کر بھی صلح کرادو تو نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ اس پر اجر بھی ملے گا۔ اور ایسا اجر جو نماز، روزہ پر ملتا ہے۔ دو بھائی باہم لڑ رہے تھے۔ آپ نے ایک بھائی کے پاس جا کر کہہ دیا کہ میاں تم کس کا مقابلہ کر رہے ہو وہ تو تمہاری جدائی سے بے حد غمگین اور سوگوار ہے اور رات تو وہ آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور روتا تھا کہ ہائے میرا بھائی مجھ سے جدا ہو گیا۔ ادھر دوسرے بھائی کے پاس گئے اور اس سے بھی ایسی ہی باتیں کہیں، جس سے دونوں کے دل نرم ہو گئے اور مصالحت کو آمادہ ہو گئے۔ اور صبح کو دونوں نے معانقہ کر کے باہم صلح صفائی کرلی۔

شریعت نے جبلّی وطبعی قویٰ شر کو خیر کے طرف موڑا...... تو اس جھوٹ پر ثواب اس سچ کی نسبت یقیناً ملے گا جس سے فتنہ کا بیج بو دیا گیا اور دو ملے ہوئے بھائیوں کو لڑا دیا ہو۔ اس سے واضح ہے کہ جھوٹ جیسی چیز کو بھی شریعت نے مٹایا نہیں بلکہ محفوظ رکھ کر اپنے اشاروں پر چلایا ہے گویا معصیت بھی عبادت بن جاتی ہے۔ اگر شریعت کے اشاروں سے ہو اور اگر حق کو شریعت کے خلاف استعمال کیا جائے تو وہ معصیت بن جاتا ہے۔ غیبت سچ بولنے کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی کے عیب واقعی کو اس کے پس پشت بیان کرنے کا نام غیبت ہے۔ شریعت نے اس سچ کی ممانعت فرمائی ہے اور اسے حرام رکھا۔ حالانکہ غیبت سچی بات کو کہتے ہیں اور جھوٹ ہو تو وہ افتراء ہوگا غیبت نہ ہوگی تو یہ سچ بولنا حرام ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:۔ ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ﴾

یعنی غیبت کرنا ایسا گندہ فعل ہے جیسے اپنے بھائی کے مردار گوشت کو نوچ نوچ کر کھانا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ سچ عبادت ہے اور نہ جھوٹ معصیت بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے اور نہ ماننا معصیت ہے۔ یہی نماز تین اوقات میں حرام ہے۔ سورج طلوع ہوتے وقت۔ غروب ہوتے وقت اور استواء یعنی سر پر ہوتے وقت ان اوقات میں اگر نماز پڑھے گا تو گناہ گار ہوگا، معلوم ہوا کہ نہ نماز پڑھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا عبادت ہے۔ کہنا ماننا عبادت ہے۔

عبادت کی حقیقت تسلیم و رضا ہے...... ماہ رمضان میں روزہ فرض ہے اگر بلا عذر ترک کیا جائے تو گناہ اور سزا دونوں سر پڑتے ہیں۔ لیکن یہی روزہ عید کے دن حرام ہے اگر روزہ رکھ لے گا تو گناہ گار ہو جائے گا، جس سے واضح ہے کہ نہ روزہ رکھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا عبادت ہے، کہنا ماننا عبادت ہے کہ جب ہم کہیں، روزہ رکھو جب ترک کرائیں ترک کر دو، اپنی تجویز کو دخل مت دیں کہ یہی اطاعت درحقیقت عبادت ہے یہ نماز روزہ عبادت کی صورتیں اور مثالیں ہیں۔ حقیقتِ عبادت اطاعت اور تسلیم و رضا ہے۔

خودکشی حرام اور بہت بڑا جرم اور گناہ ہے مگر جہاد میں اپنے کو قتل کے لئے پیش کر دینا اور سر کو ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہی سب سے بڑی عبادت ہے، اس سے واضح ہے کہ نہ جان دینا عبادت ہے۔ نہ جان بچانا عبادت ہے۔ کہنا ماننا اور بروقت تعمیل حکم کرنا عبادت ہے۔ یہی قتل نفس اپنی نفس کے لئے کیا جائے تو معصیت ہے کہ خلاف اطاعت ہے اور یہی قتل نفس اگر حفاظت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر کیا جائے تو شہادت اور دین وعبادت ہے کیوں کہ یہ نفس اور بدن آپ کی ملکیت نہیں بلکہ سرکاری مشین ہے، اس کو آپ اپنی مرضی سے ضائع نہیں کر سکتے ہاں مالک کے حکم پر رکھ بھی سکتے ہیں اور کھو بھی سکتے ہیں، وہ رکھوائیں تو اس کا رکھنا اور بچانا عبادت ہے وہ خود ہی اسے تلف کرائیں تو تلف کر دینا ہی عبادت ہے۔ لوٹ مار اور غارت گری نہ معصیت ہے، نہ اس سے بچنا عبادت ہے کہنا ماننا عبادت ہے، اگر کہے کے مطابق لوٹ ماری بھی ہو تو عبادت اور کہے کے خلاف امن وامان دینا بھی معصیت ہے، زمین پر اکڑ کر سینہ تان کر اور مونڈھے ہلا کر چلنا کبر نفس ہے۔ جس کو قرآن نے حرام فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ: ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ﴾ "خدا کی زمین پر تکبر کی چال مت چلو۔ کیوں کہ تم اکڑ کر اور ابھر ابھر کر زمین کو چیر نہیں دو گے۔ اور اونچے ہو کر طول میں آسمان تک نہیں پہنچ جاؤ گے"۔

پھر کیوں یہ اینٹھ کر چلنے کی مصیبت بھر رہے ہو جس سے صاف واضح ہے کہ اینٹھ مروڑ کے ساتھ چلنا معصیت اور جرم ہے، لیکن حج کے موقع پر جس طواف کے بعد سعی صفا ومروہ ہو اس میں ابتدا کے چار پھیروں میں اکڑ کر اور مونڈھے ہلا ہلا کر چلنا واجب اور جزو عبادت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ اکڑ کر چلنا معصیت ہے، نہ جھک کر چلنا عبادت ہے۔ بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے، پس اصل چیز اطاعت حق نکلی، اگر اطاعت کے خلاف ہے تو نماز روزہ بھی معصیت بن جاتے ہیں، اور اگر کہے کے مطابق ہے تو جھوٹ، لوٹ مار، تکبر کی چال اور غارت گری بھی عبادت بن جاتی ہے۔ بس اس طرح تمام خلقی قوتوں کو شریعت کے موافق استعمال کیا جائے تو وہ سب اطاعت بنتی چلی جائیں

گی، اور خلاف حکم استعمال کیا جائے تو معصیت ہوتی چلی جائیں گی۔ اس سے عبادت کی دو نوعیں نکلتی ہیں ایک افعالِ خیر جن کا کیا جانا ضروری ہے، اور ایک افعالِ اثم جن سے بچنا ضروری ہے۔

بر و تقویٰ...... پہلی نوع کو شریعت کی اصطلاح میں بر کہتے ہیں جیسے فرمایا: ﴿ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ﴾ ①

اور دوسری نوع کو تقویٰ کہتے ہیں، جس کے ذریعہ گناہ سے بچا جاتا ہے۔ عبادت کی ان دو نوعوں کو پیش نظر رکھ کر غور کرو تو انسان ملائکہ سے علم ہی میں نہیں بڑھا ہوا ہے بلکہ عبادت میں بھی فائق ہے، کیوں کہ تقویٰ کی عبادت ملائکہ میں ہے ہی نہیں۔ کیونکہ تقویٰ کہتے ہیں شر سے بچنے کو اور بچنا اس چیز سے ہوتا ہے جس کا کرنا ممکن ہو۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ میں شرّ کا مادہ ہی نہیں۔ وہ شر کے افعال کر ہی نہیں سکتے، تو ان سے بچنے کے لئے کہا بھی نہیں جاسکتا ہے اور انسان شر کر بھی سکتا ہے اور اس سے بچ بھی سکتا ہے۔ اس لیے شر سے اسے ہی روکا بھی جاسکتا ہے اور اس کا رکنا عبادت بھی قرار پاسکتا ہے کہ اور وہ ارادۂ رکتا ہے، فرشتہ میں نہ شرّ کا مادہ ہے نہ اس کے شرّ سے بالا رادہ رکنے کا سوال ہی پیدا ہوسکتا ہے، اس لئے تقویٰ کی نوع کی عبادت ہی فرشتہ کے لئے نہیں۔ یہ صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے تو انسان اس نوع عبادت میں ملائکہ سے بڑھ گیا اب جو عبادتیں کرنے کی ہیں۔ ان میں معاشرت، معاملات اور خانگی زندگی کی عبادت بھی فرشتوں کے لئے نہیں کیوں کہ ان میں نسل کا قصہ ہی نہیں کہ ان کے عزیز و اقارب پیدا ہوں اور معاملات لین دین، آشتی و صلح اور صلہ رحمی وغیرہ کی نوبت آئے اس لیے بر کا دو تہائی حصہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص نکلا، اب رہے اعتقادات، سو یہ عبادت بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے، کیوں کہ اعتقاد کی اصل ایمان ہے اور ایمان کے معنیٰ ایمان بالغیب کے ہیں۔

فرشتہ کے حق میں کوئی چیز غیب ہی نہیں کہ اسے ایمان کا مکلف قرار دیا جائے اور ایمان لانے کی دعوت دی جائے۔ اس لئے اعتقادات کا حصہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص رہا۔ اب اگر رہ جاتا ہے تو دیانات کا رہ جاتا ہے۔ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، وغیرہ سو مال کی ضرورت معاشرت کے لئے ہے۔ فرشتوں میں معاشرت ہی نہیں۔ کہ نسل نہیں اس لئے مال کے لین دین کا بھی سوال نہیں ہوسکتا تو یہ عبادت بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص رہی رہا روزہ کے معنی اپنے ارادہ و نیت سے کھانا پینا اور لذت نساء کو ترک کرنا ہے، فرشتہ کے لئے نہ بیوی ہے نہ کھانا پینا تو وہاں اس عبادت کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اس لئے لے دے کر نماز رہ جاتی ہے تو میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ فرشتہ کی طبعی بات ہے اور طبعی تقاضوں سے کسی کام کا کرنا عجیب نہیں۔ انسان کا ایک سجدہ جو خلاف طبع کو برداشت کرکے ہوتا ہے۔ فرشتہ کی ہزار سالہ عبادت سے زیادہ وزنی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دیانات و عبادات میں بھی انسان ہی فرشتہ سے افضل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان میں یہ بھیمیت اور شیطنیت والی قوتیں ہیں جن کی بدولت تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ فرشتہ

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۷۷.

میں یہ دونوں قوتیں نہیں۔اس لئے وہ دوتہائی دین سے الگ تھلگ ہے۔اب انسان میں قوت عقلی ہے۔جو فرشتہ میں بھی ہے مگر اس عقل کے کتنے ہی مصرف جس سے عقلی قوت کی تفصیلات کھلتی ہیں۔صرف انسان میں ہیں ملائکہ میں نہیں۔اس لئے وہ اطاعت وعبادت میں بھی وہ انواع پیش نہیں کرسکتا جو انسان پیش کرسکتا ہے،غرض عبادت کے سینکڑوں دروازے ہیں جو فرشتوں پر بند ہیں اور انسان پر کھلے ہوئے ہیں۔اسلام کے معنی زندگی کے تمام شعبوں کو قانون خداوندی کے ماتحت گزارنا ہے،سو جو جامع زندگی انسان کو ملی ہے وہ کسی کو بھی نہیں ملی۔اس لئے اسلام اور تسلیم ورضا بھی اس کی جامع اور حاوی ہوسکتی ہے۔جو کسی دوسری نوع کے لئے ممکن نہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حکم ہوا۔﴿ اِذْقَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ﴾ " اے ابراہیم مسلم بن جاؤ" تو یہ مطلب نہ تھا کہ معاذ اللہ کفر سے اسلام میں داخل ہو جاؤ بلکہ یہ تھا کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردو اور گردن جھکا دو تو عرض کیا۔

﴿اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ①

میں مسلم بن گیا۔تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: اعلان کردو کہ میری زندگی اور موت۔میری نماز اور عبادت سب اللہ ہی کے لئے ہیں۔رضائے نفس کے لئے نہیں۔مجھے اسی کا حکم کیا گیا ہے اور میں اوّل مسلمین میں سے ہوں"۔

پس اسی تفویض وتسلیم کو اسلام کہتے ہیں کہ رضائے حق کے لئے جئے اور رضائے حق ہی کے لئے مرے اسی کی خوشنودی کے لئے صلح کرے،اسی کے لئے لڑے،اسی کے لئے محبت کرے،اسی کیلئے عداوت باندھے،اسی کے لئے دے اور اسی کے لئے ہاتھ روکے۔جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:"مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ" "جو اللہ ہی کے لئے محبت کرے،اسی کے لئے عداوت کرے،اسی کے لئے دے اور اسی کے لیے ہاتھ روک لے تو اس نے ایمان کامل کرلیا"۔

اور ظاہر ہے کہ یہ افعال فرشتہ کرہی نہیں سکتا کہ اس میں شہوت ہے نہ شیطنیت ہے نہ غفلت ہے نہ نخوت۔اس لئے جو اطاعت انسان کرسکتا ہے وہ فرشتہ کرہی نہیں سکتا کہ اس میں وہ مادے ہی نہیں۔جن کی روک تھام سے عبادت کی بے شمار شکلیں بنتی ہیں۔اس لئے فرشتہ کو ان علوم کی ضرورت بھی نہ تھی جو انسان کو تھی۔اس لئے کہ جتنی مادی رکاوٹیں انسان کے پیچھے ہیں۔اتنے ہی دفاع ومدافعت کے طریقوں کا علم اس کے لئے ضروری تھا۔

بنیادِ خلافت......اس سے واضح ہوا کہ انسان کا علم بھی فرشتوں کی نسبت کامل اور جامع ہے اور اسکی عبادت بھی ان کی نسبت کامل اور جامع ہے اور بوجہ مدافعت جتنی عبادت انسان کی مضبوط ہے فرشتہ کی نہیں ہوسکتی۔اور ظاہر ہے کہ جب علم بھی اس کا کامل۔تو ساری کائنات میں سے صرف یہ انسان ہی مستحق تھا کہ نائب خداوندی بنے، کیوں کہ کمالات خداوندی لامحدود ہونے کے باوجود دو ہی نوعوں میں اصلاً منحصر ہیں،کمالات علم اور کمالات عمل اور انہی دو میں انسان ساری مخلوقات حتیٰ کے فرشتوں سے بھی بڑھ کر نکلا تو خدا کا نائب بھی ان کمالات میں وہی ہوسکتا

① پارہ:۸.سورۃ الانعام،الآیۃ:۱۶۲.

تھا اور عمل چوں کہ علم کے تابع ہے اس لئے اصل بنیادِ خلافت علم ہی ٹھہر جاتی ہے۔ جو انسان ہی میں حدِ کمال تک پہنچا ہوا ہے، اس لئے اسی کو خلیفہ الٰہی بنایا گیا۔

خلافتِ انسانی کے بارے میں ملائکہ کا سوال ...... اسی لئے جب فرشتوں نے عرض کیا کہ اگر زمین میں خلیفہ بنانا ہے تو ہمیں کیوں نہ خلیفہ بنا دیا جائے کہ ہم سے زیادہ آپ کی تقدیس و تسبیح کرنے والا کون ہے؟ تو حق تعالیٰ نے اولاً حاکمانہ جواب دیا کہ اس معاملہ کو ہم جانتے ہیں۔ تم نہیں جانتے۔ جس سے ملائکہ خاموش ہو گئے اور پھر حکیمانہ جواب دیا کہ۔ آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دے کر ملائکہ کو چیلنج کیا کہ ذرا تم اشیاء کائنات کے نام تو بتا دو، وہ نہ بتا سکے تو حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا: تم بتاؤ۔ انہوں نے فر فر گنوا دیئے، تو بتا دیا گیا کہ علم کا ابتدائی مرتبہ علم اسماء ہے جب اسی میں تم انسان سے بازی نہ لے جا سکے تو اسماء کے بعد صفات اشیاء پھر خواص اشیاء پھر حقائق اشیاء وغیرہ کے علوم ہیں تم ان سے کب بازی لے جا سکو گے اس لئے مستحق خلافت انسان ہی ہے۔

بارہ گاہِ الٰہی سے قولی و عملی جواب ...... رہا عملی میدان تو اس میں ملائکہ نے نوعِ انسان کی مذمت کی تھی کہ وہ سفاک ہوگا۔ مفسد ہوگا تو قدم قدم پر حق تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے اعمال اول تو ملائکہ ہی سے لکھواتے ہیں تا کہ قیامت تک ان کے اس شبہ کا جواب عملی ہوتا رہے اور وہ انسان کی نیکی پر گواہ بنتے رہیں اور ساتھ ہی حدیث میں آیا ہے کہ جب کہیں مجلس خیر و وعظ نصیحت وغیرہ منعقد ہوتی ہے تو ہزاروں فرشتے اس مجلس پر نازل ہوتے ہیں جو اسی لئے پیدا کیے گئے ہیں جیسا کہ یہ مجلس ہے جس میں آج ہم اور آپ جمع ہو کر ذکرِ حق سن رہے ہیں۔ اس میں بلاشبہ کروڑوں فرشتے تشریف فرما ہیں۔ جب یہ مجلس خیر ختم ہوگی۔ تو وہ فرشتے آسمانوں میں چڑھتے ہیں اور انہیں حق تعالیٰ سے قرب ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں تم کہاں گئے تھے۔ عرض کرتے ہیں آپ کے بندوں کی مجلس میں فرماتے ہیں تم نے میرے بندوں کو کس حال میں دیکھا؟ عرض کرتے ہیں کہ آپ کی یاد میں، مصروف تھے، آپ کی جنت کے طالب تھے اور جہنم سے خائف تھے۔ فرماتے ہیں کہ کیا انہوں نے جنت، دوزخ کو دیکھا ہے؟ عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں انبیاء سے سن کر ایمان لائے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر جنت و نار کو دیکھ پائیں تو کیا کریں؟ عرض کرتے ہیں کہ اگر دیکھ پائیں تو سوائے جنت مانگنے اور دوزخ سے پناہ مانگنے کے انہیں کوئی کام ہی نہ ہوتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم گواہ ہو جاؤ کہ میں نے ان سب کو بخش دیا۔ جو اس مجلس میں حاضر تھے۔ یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ جنت بخشنا تھا تو ان اربوں کھربوں فرشتوں کے نازل فرمانے اور انہیں آسمان پر چڑھا کر ان سے پوچھنے اور انہیں گواہ بنا کر مغفرت کرنے کی کیا ضرورت تھی، اس کے بغیر بھی مغفرت فرما سکتے تھے؟ پھر یہ کہ ایسی مجلسیں دنیا میں نہ معلوم کتنی ہو رہی ہوں گی جیسی مجلس یہاں ہو رہی ہے اور ہر جگہ ملائکہ کا ان مجلسوں پر اترنا اور چڑھنا اور پھر گواہ بننا آخر کیا ضروری تھا؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یہ ملائکہ کو عملی جواب دینے کے لئے ہے کہ جس کے بارے میں تم کہتے تھے کہ: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ تم نے دیکھا کہ وہ کس درجہ عمل صالح اور بر و تقویٰ میں لگا ہوا ہے اور کس درجہ

صالح بن کر دین کو پھیلانے اور اس پر خود جمے رہنے کی سعی بھی کر رہا ہے۔

انسانی اعمال پر فرشتوں کی گواہی کی حکمت...... کیا یہ فساد ہے؟ کیا یہ سفک دماء ہے؟ پس ایک طرف تو علم کے میدان میں انسان کو فرشتوں سے فائق ثابت کرایا اور ایک طرف عبادت واطاعت میں اسے فرشتوں سے اونچا ثابت فرمایا اور خود فرشتوں ہی کو اس کی نیکی پر گواہ بنایا، تا کہ اس کی سفا کی اور افساد کا تخیل ان کے ذہن سے نکل جائے اور وہ بصدق دل اس کی خلافت کے معترف ہو جائیں، چناں چہ ہر غیر معمولی عمل وعبادت کے مواقع پر ملائکہ کو اسی طرح گواہ بنایا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب حاجی احرام باندھ کر حج وزیارت کرتے ہیں، طواف وسعی میں دوڑتے ہیں۔ منٰی وعرفات میں ٹھہرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ کو خطاب فرماتے ہیں کہ یہ لوگ آخر گھر بار چھوڑ کر، بیوی بچوں سے منہ موڑ کر سر سے کفن باندھ کر اپنی لذت وآرام کو مٹا کر یہاں کیوں آئے ہیں؟ یہ سب میری خوشنودی ورضا کے لئے آئے ہیں اور پروانوں کی طرح نثار ہو رہے ہیں۔ اے ملائکہ! تم گواہ رہو میں نے ان کو بخش دیا۔ حقیقت میں یہ فرشتوں کو وہی عملی جواب ہے کہ وہ انسان جس کے متعلق تم نے ﴿ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا﴾ کہا تھا۔ دیکھو کیسا اطاعت وعبادت اور ترک لذات میں اپنے رب کی خاطر مصروف ہے۔

① حدیث شریف میں آتا ہے کہ دن کے اعمال لکھنے والے ملائکہ الگ ہیں اور رات کے الگ۔ دن والے فرشتے عصر کی نماز کے وقت اوپر چڑھتے ہیں اور اعمال نامے رات والے ملائکہ کے حوالے کر دیتے ہیں اور رات والے فرشتے صبح کی نماز کے وقت دن والوں کو چارج دے کر اوپر چڑھتے ہیں غرض دونوں وقتوں کے ملائکہ کا عروج ونزول کا وقت فجر اور عصر کی نمازوں کے وقت کیا گیا۔ ان کے چڑھنے پر حق تعالیٰ جب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے بندوں کو تم نے کس حال میں چھوڑا تو جواب میں عرض کرتے ہیں کہ: ”تَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ وَاَتَيْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ“ ”جب ہم نے انہیں چھوڑا جب بھی نماز میں مصروف تھے۔ اور جب ہم نے جا کر دیکھا جب بھی نماز ہی میں مشغول تھے۔ سو یہ وہی عملی جواب ہے کہ جن کے بارہ میں تم مفسد اور سفاک ہونے کے مدعی تھے، دیکھو وہ رات دن کیسے مصروف عبادت ہیں۔ یہ معاملہ روزانہ صبح اور شام ہوتا رہتا ہے۔ گویا صبح وشام ملائکہ کو عملی جواب دے کر انسان کی برتری ان پر جتائی جاتی ہے، تا کہ روزانہ ان کو عملی جواب ملتا رہے اور وہ انسان کی فضیلت اور اس کی خلافت کے معترف ہوتے رہیں۔

احوال وکیفیات میں انسان کا تفوق...... پھر نہ صرف علم وعمل ہی انسان کا فرشتوں سے بالا وبرتر ہے بلکہ احوال وکیفیات بھی دیکھی جائیں۔ جو قرب الٰہی سے اسے حاصل ہوتی ہیں۔ سو وہ ان احوال میں بھی ملائکہ سے بالا وبرتر ہے، آخر جو احوال وکیفیات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ پر طاری ہوتی ہیں وہ فرشتوں پر نہیں آسکتیں۔ کیوں کہ نہ ملائکہ علم وعمل کے ان میدانوں سے گزرتے ہیں۔ جس سے انسان گزرتا ہے۔ نہ ان پر وہ کیفیات عشق ومحبت

① الصحيح للبخاري، كتاب مواقيت الصلوٰة، باب فضل صلاة العصر، ج: ٢، ص: ٣٩٠.

طاری ہوتی ہیں۔ جو انسان پر ہوتی ہیں اور جب علم، عمل، حال سب ہی میں انسان ملائکہ سے فائق ہے تو انسان ہی کا حق تھا کہ اسے نیابت کی نعمت سے نوازا جائے۔ اور خلیفہ خداوندی بنایا جائے کہ بناء خلافت یہی دو چیزیں تھیں، علم خداوندی اور اخلاقِ خداوندی وہ دونوں جب اس میں علی وجہ الاتم ثابت ہوتے ہیں۔ تو خلافت بھی علی وجہ الاتم اس میں آسکتی تھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تکمیلِ خلافت دنیا میں نہیں ہوتی بلکہ آخرت میں ہوگی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ بنائے خلافت جب کہ علمِ کامل اور عمل کامل ہے تو یہ علم وعمل جب تک کہ اسی انداز کا نہ ہوگا۔ جس انداز کا خود حق تعالیٰ کا ہے اس وقت تک اس انسان کی علمی وعملی خلافت کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

تکمیل خلافت آخرت میں ہوگی......اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے علم اور عمل وصناعی کی شان یہ ہے کہ وہ اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا علم بھی اسباب سے بے نیاز ہے، یہ نہیں کہ حق تعالیٰ نے کوئی کتاب پڑھ کر یہ علم حاصل کرلیا۔ (معاذ اللہ)

بلکہ علم کا سرچشمہ خود اس کی ذات ہے۔ یعنی علم خود اس کی ذات بابرکات سے ابھرتا ہے، ایسے ہی اس کی صناعی بھی وسائل وآلات کی محتاج نہیں بلکہ جب کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتے ہیں تو فرما دیتے ہیں کُـــــنْ (ہوجا) تو وہ ہوجاتی ہے، اس لئے وہ پل بھر میں جہان بنا دیتے ہیں اور ان کے ارادہ ہی سے وہ چیز خود بخود معرضِ وجود میں آجاتی ہے۔ ﴿إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ﴾ ①

اس صورتحال کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کیفیت اس میں جنت میں داخل ہوکر پیدا ہوگی۔ چناں چہ علم تو یہ ہوگا کہ تمام صنعتیں اس کی قوت متخیلہ کی تابع ہوجائیں گی۔ کسب ومحنت اور اختیار اسباب کی ضرورت نہ ہوگی۔ جس جس چیز کی خواہش ہوگی۔ ارادہ کرتے ہی وہ چیز سامنے آجائے گی۔ اسی کو یوں قرآن میں فرمایا گیا: ﴿إِذَا السَّمَآءُ انفَطَرَتْ ۝ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انتَثَرَتْ﴾ ②

یعنی ماضی ومستقبل سب کچھ انسان پر روشن ہوکر اس کے علم میں آجائے گا اگلے پچھلے تمام کئے ہوئے اعمال اس کے سامنے آجائیں گے اور یہ علوم اسے خود بخود حاصل ہوں گے، نہ کوئی استاد ہوگا۔ نہ کتاب بلکہ نفس انسان خود مدرک بن جائے گا اور ہر عمل کی یہ کیفیت ہوگی کہ تمام صنعتیں اس کی قوت متخیلہ کی تابع ہوجائیں گی۔ کسب ومحنت اور اختیار اسباب کی ضرورت نہ ہوگی جتنی جس چیز کی خواہش ہوگی۔ ارادہ کرتے ہی وہ چیز سامنے آجائے گی اسی کو قرآن میں فرمایا گیا: ﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِىٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ﴾ ③

گویا کن فیکون کی طاقت پیدا ہوجائے گی کہ جو چاہا وہی ہوگیا۔ نہ اسباب کی ضرورت نہ وسائل کی اور جب علم انسانی اسباب سے مستغنی ہوجائیگا۔ اور عمل کسب وریاضت سے مستغنی ہوکر محض قوت ارادہ کے تابع ہوجائیگا۔

① پارہ: ۲۳، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۸۲۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ الانفطار، الآیۃ: ۱، ۲۔

③ پارہ: ۲۴، سورۃ حٰم سجدۃ، الآیۃ: ۳۱۔

بالفاظ دیگر حق تعالیٰ کے علم وصنعت کے مشابہ ہو جائے گا تو اس وقت انسان کی علمی وعملی خلافت مکمل ہوگی کہ وہ جس کا نائب ہے، وہ علم وعمل میں نائب ہے۔ اور اس کے علم وعمل سے مشابہ اس کا علم وعمل ہو جائے گا۔ اور جب کہ بنائے خلافت بھی علم وعمل تھا۔ جو علم وعمل خداوندی کے مشابہ بن گیا تو خلافت بھی صحیح معنی میں اس وقت مستحکم اور مضبوط ہوگی، مگر جنت میں یہ استحکام خلافت جب ہی ہوگا جب دنیا میں علم وعمل کے اسباب و وسائل اختیار کر کے اسے جزو نفس بنانے کی انسان نے سعی کی ہوگی۔ ورنہ یہاں کی محرومی سے وہاں بھی محرومی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ کامل بن جانے کے بعد حق تعالیٰ ان بندوں کو انہیں القاب وخطابات سے یاد فرمائیں گے جو القاب وخطابات خود ان کے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں کو نشاط میں لانے کے لئے ان کے نام خطوط بھیجیں گے۔ فرشتے خط رسانی کا کام کریں گے۔ ان خطوط کے لفافوں پر یہ پتہ لکھا ہوگا۔ ''مِنَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ اِلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ''

عزیز رحیم کی طرف سے یہ خط عزیز رحیم کو پہنچے یعنی القاب بھی وہی دے دیں گے۔ جو خود ان کے سرکاری خطابات ہیں۔ پس اس عالم میں انسان صورۃً خلیفہ خداوندی ہے۔ اور محض خلافت کے راستہ پر ہے، آخرت میں پہنچ کر حقیقی معنی میں خلیفۂ خداوندی بن جائے گا مگر یہ منزل جب ہی آئے گی جب اس کا راستہ دنیا میں اختیار کر لیا جائے گا اگر یہاں نیابت کی یہ ظاہری صورت اختیار نہ کی جائے جو اطاعت وعبادت سے بنتی ہے۔ تو وہاں تکمیل کس چیز کی ہوگی۔ اور کیسے ہو جائے گی؟ بہر حال یہ واضح ہو گیا کہ جنات، ملائکہ اور حیوانات میں سے اس خلافت کے عہدہ کے لئے کسی کا انتخاب عمل میں نہ آیا۔ آیا تو صرف انسان کا آیا۔

قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زدند

سو ان میں سے حیوانات تو قابل خطاب ہی نہ تھے۔ اس لئے قابل ذکر بھی نہ تھے۔ قابل ذکر ملائکہ۔ جنات اور انسان ہی تھے۔ سو ان ہی کا اللہ نے اس آیت میں جو میں نے ابتداء میں تلاوت کی تھی ذکر فرما کر ہر ایک کی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ملائکہ کا ذکر فرما کر ان کی علمی کم مائیگی پر روشنی ڈالی گئی کہ وہ علم کے میدان مقابلہ میں انسان سے ہار گئے۔ شیطان کا ذکر فرما کر جو جنات میں سے ہے اس کے فہم وعمل کی کوتاہی پر روشنی ڈالی کہ وہ امر خداوندی کے معارضہ پر اتر آیا اور سرکشی پر آمادہ ہو گیا جو اس کی بدفہمی اور بدنیتی تھی۔ پس نہ کم علم خلیفہ الٰہی بن سکتا تھا نہ بدفہم اور بدنیت، انسان نے علم کا ثبوت دیا کہ جنت کی سکونت کا حکم دیا گیا تو وہاں جا داخل ہوا اور علم اسماء سے اس کا علم ترقی کر گیا۔ جس سے زندگی اس کی جامع ہوئی اور ان ناموں کے ذریعہ اس نے تمام اشیاءِ زندگی پر قابو پالیا اور کائنات اس کے لئے مسخر ہوگئی۔ ملائکہ اس کی خدمت پر لگا دیئے گئے اور شیطان کو مردود بنا کر اس کے مقابلہ پر چھوڑ دیا گیا کہ چوکنا رہے اور اس کا مقابلہ کر کے اپنی مخفی علمی اور عملی قوتوں کا ثبوت دے، اور اسی طرح اس کی خلافت روز افزوں چمکتی رہے۔ یہ علم انبیاء کو دیا اور انبیاء نے یہ علم جو مبنائے خلافت ہے بنی نوع انسان کو سکھایا پس انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کے تو شاگرد ہیں اور کائنات کے استاد اور مربی ہیں حق تعالیٰ نے ان پاکباز

استادوں کا گروہ کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد میں بھیجا۔ اور دنیا کو حکم دیا کہ ان سے علم سیکھے اور ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرے۔ پس یوں سمجھو کہ یہ پوری دنیا ایک مدرسہ ہے جس کا فرش زمین ہے چھت آسمان ہے۔ اس میں ستاروں سے چاندنا کیا۔ انسان وجنات اس مدرسہ کے طلبہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام استاذ ہیں اور ملائکہ خدام مدرسہ نگران اور منتظم ہیں، طلبہ کے لئے وظیفہ کی ضرورت تھی تو اس زمین کو دسترخوان بنا دیا تاکہ طلبہ وظیفہ پاسکیں اور ان کی ضروریات پوری ہوں اور وہ ہمہ تن علم کی تکمیل میں لگ کر استحقاق خلافت کو مکمل کریں اور اس طرح انسان کی فوقیت باقی تینوں ذی شعور انواع پر واضح ہوگئی جس کی بنا علم ہے۔

خلافت نبوت...... یہ علمی اور عملی خلافت قیامت تک باقی رہے گی۔ انبیاء علیہم السلام اوّلین خلفاء ربانی ہیں۔ ان کے بعد ان کے وارث خلیفہ ہوتے ہیں جو علمائے ربانی ہیں اور ان کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ حدیث شریف میں ہے "یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ یَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِیْفَ الْغَالِیْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِیْنَ وَتَاْوِیْلَ الْجَاهِلِیْنَ" پھر ہر صدی پر مجدّد دین کا وعدہ دیا گیا ہے جو علماء راسخین فی العلم ہوں گے یہ حضرات علماء اس علم الٰہی سے غلو کنندوں کی تحریفوں، باطل پسندوں کی دروغ بافیوں اور جاہلوں کی رکیک تاویلوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور جو شکوک وشبہات اہل باطل اور اہل زیغ اس میں ڈالیں گے۔ یہ اہل علم دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرتے رہیں گے۔ پس یہ امت لاوارث امت نہیں کہ جس کا جی چاہے اس کے دین وعلم کا حلیہ بگاڑ دے۔

اور کسی بھی مفسد وعیار کی دین میں پیش نہ چلے گی۔ حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا: "کَیْفَ تَهْلِکُ اُمَّةٌ اَنَا اَوَّلُهَا وَالْمَهْدِیُّ وَسَطُهَا وَالْمَسِیْحُ (ابْنُ مَرْیَمَ) اٰخِرُهَا" آپ نے ارشاد فرمایا: ل "اَتَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ"

وراثت نبوت...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: لَاتَزَالُ طَآئِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَایَضُرُّهُمْ مَّنْ خَاذَلَهُمْ وَلَامَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُاللّٰهِ

پس جس امت میں اتنی انواع کے اخلاف رشید کے وعدے دیئے گئے ہوں۔ وہ امت لاوارث امت نہیں ہوسکتی۔ اس کی پشت پناہی اللہ ورسول کی طرف سے برابر جاری رہے گی، جیسا کہ رہتی آرہی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَثَلُ اُمَّتِیْ کَمَثَلِ الْمَطَرِ لَایُدْرٰی اَوَّلُهَا خَیْرٌ اَمْ اٰخِرُهَا؟" ①

پس انبیاء علیہم السلام کا ترکہ اس وارث امت کو ملتا رہے گا جب تک اپنا روحانی نسب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جوڑے رکھے گی اور وہ ترکہ بھی علم ہے کیوں کہ انبیاء روٹی اور کرسی وراثت میں نہیں چھوڑتے بلکہ علم ومعرفت چھوڑتے ہیں۔ اسی علم ومعرفت سے آدمی آدمی بنتا ہے اور انسانیت اسی علم پر موقوف ہے اگر دنیا میں انبیاء علیہم السلام تشریف نہ لائے تو انسان ڈھوروں، ڈنگروں کا ایک گلہ ہوتا جو بقول ملائکہ سفا کی اور مفسدہ پردازی کے سوا دوسرا کام نہ جانتا۔

---

① المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمه علی، ج: ۹ ص: ۲۵۹ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواه الطبرانی وفيه عيسى بن ميمون وهو متروک دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱۰ ص: ۶۸.

انسانی ترقی ...... پس مادی تعلیم اور سائنس وغیرہ عمدہ عمدہ سامان تو پیدا کرسکتی ہے۔ مگر عمدہ انسان پیدا نہیں کرسکتی، عمدہ انسان صرف انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیم ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ سائنس سے باہر تو چاندنا ہوتا ہے مگر اندر اندھیرا ہوتا ہے نہ تقوائے ظاہر ہوتا ہے، نہ تقوائے باطن۔ ظاہراً مادیات کی ترقی ہو رہی ہے مگر اندر کے جوہر تباہ ہو رہے ہیں۔ انسان نے نئی نئی ایجادات میں اپنی تمام طاقتوں کو گم کردیا اور اس کی محتاجگی بڑھ گئی اگر وہ اڑنا چاہے تو لوہے لکڑی پیتل کا محتاج ہے اگر بعید مسافت پر خبر دینا چاہے تو لاسلکی اور وائرلیس کا محتاج۔ اگر کسی دور دراز مقام پر پہنچنا چاہے تو ریل موٹر کا محتاج خود اپنے نفس کی اندرونی طاقتوں سے یہ کام نہیں کرسکتا بلکہ ان آلات و وسائل کا دست نگر ہے۔ مرد وہ تھے جنہوں نے اپنے اندر وہ طاقت پیدا کی کہ ہزارہا میل کی مسافت پر بلا لاسلکی کے آوازیں پہنچائیں۔ جیسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے بیت اللہ کے بن جانے کے بعد حج کرنے کی ہدایت کی آواز لگائی تو وہ سارے عالم میں گونجی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ساریہ رضی اللہ عنہ کو آواز دی تو وہ ڈھائی سو میل پر بلا ریڈیو کے پہنچی۔ انہوں نے بلند پرواز دکھلائی وہ کسی ہوائی جہاز کے محتاج نہ ہوئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام چوتھے آسمان پر پہنچے۔ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ساتوں آسمانوں سے گزر کر مستویٰ تک پہنچے۔ مگر محض اپنی اندرونی روحانی قوتوں سے، نہ کہ مادی وسائل سے اس لئے اپنے اندر جوہر پیدا کرو، لوہے، پیتل کے محتاج بن کر مت رہ جاؤ۔ اسباب کے بندے نہ بنو۔ مُسَبِّبُ الْاَسْبَابِ کے بندے بنو۔ آج کی یہ ترقی انتہائی محتاجگی کی ترقی ہے۔ حالانکہ انسانی ترقی استغناء کی ترقی ہے۔ لوہے، پیتل اور دیگر معدنیات کا غلام بن جانا ترقی نہیں۔ بلکہ ان چیزوں کو اپنی غلامی پر مجبور کردینا ترقی ہے۔ آج کا انسان صرف اس جگہ باکمال ہے جہاں مشینیں ہوں، بجلی ہو۔ پاور ہاؤس ہو، پٹرول ہو، جہاں یہ چیزیں نہ ہوں وہ عاجز، بے بس اور بے کس ہے۔ انسان کامل وہ ہے کہ اگر زمین پر ہو تو بھی باکمال ہو اور اگر زمین کے اندر ہو تو بھی باکمال۔

نورِ قلب ...... شیخ شہاب الدین سہروردی نے ایک حکایت بیان کی ہے جس کو مولانا رومی نے نقل فرمایا ہے کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ رومیوں نے کہا کہ ہم اچھے صناع اور کاریگر ہیں۔ چینیوں نے کہا ہم ہیں۔ بادشاہ کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا۔ بادشاہ نے کہا۔ تم اپنی صناعی دکھلاؤ۔ اس وقت دونوں صناعیوں کا موازنہ کر کے فیصلہ کیا جائے گا اور اس کی صورت یہ کی گئی کہ بادشاہ نے ایک مکان بنوایا اور اس کے درمیان پردہ کی ایک دیوار کھڑی کردی۔ چینیوں سے کہا نصف مکان میں تم اپنی کاریگری دکھلاؤ اور رومیوں سے کہا کہ دوسرے نصف میں تم اپنی اپنی صناعی کا نمونہ پیش کرو۔ چینیوں نے تو دیواروں پر پلاسٹر کر کے قسم قسم کے بیل بوٹے اور پھول پتے رنگ برنگ کے بنائے اور اپنے حصہ کے کمرہ کو مختلف نقش و نگار اور رنگارنگ بیل بوٹوں سے گل و گلزار بنا دیا۔ ادھر رومیوں نے دیواروں پر پلاسٹر کر کے ایک بھی پھول پتہ نہیں بنایا اور نہ ہی کوئی ایک بھی رنگ لگایا بلکہ دیوار کے

پلاسترکوصیقل کرنا شروع کر دیا اور اتنا شفاف اور چمک دار کر دیا کہ اس میں آئینہ کی طرح صورت نظر آنے لگی۔ جب دونوں نے اپنی اپنی کاریگری اور صناعی ختم کر لی تو بادشاہ کو اطلاع دی۔ بادشاہ آئے اور حکم کیا کہ درمیان سے دیوار نکال دی جائے جونہی دیوار بیچ میں سے ہٹی، چینیوں کی وہ تمام نقاشی اور گلکاری رومیوں کی دیوار میں نظر آنے لگی اور وہ تمام بیل بوٹے رومیوں کی دیوار میں منعکس ہوگئے۔ جسے رومیوں نے صیقل کر کے آئینہ بنا دیا تھا بادشاہ سخت حیران ہوا کہ کس کے حق میں فیصلہ دے کیوں کہ ایک ہی قسم کے نقش ونگار دونوں طرف نظر آ رہے تھے۔ آخر کار اس نے رومیوں کے حق میں فیصلہ دیا کہ ان کی صناعی اعلیٰ ہے کیوں کہ انہوں نے اپنی صناعی بھی دکھلائی اور ساتھ چینیوں کی کاریگری بھی چھین لی۔

مولانا روم نے اس قصہ کو نقل کر کے آخر میں بطور نصیحت کے فرمایا کہ اے عزیز! تو اپنے دل میں رومیوں کی صناعی جاری کر، یعنی اپنے قلب کو ریاضت ومجاہدہ سے مانجھ کر اتنا صاف کر لے کہ تجھے گھر بیٹھے ہی دنیا کے سارے نقش ونگار اپنے دل میں نظر آ نے لگیں۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر وسرو دچمن درآ — توز غنچہ کم نہ دمیدۂ دردل کشابہ چمن در آ

یعنی تو اپنے دل کی کھڑکیوں کو کھول دے کہ اس میں سے ہر قسم کا مادی میل کچیل نکال پھینک اور اسے علمِ الٰہی کی روشنی سے منور کر دے تو تجھے دنیا اور آخرت کے حقائق ومعارف گھر بیٹھے ہی نظر آنے لگیں گے۔

بینی اندر خود علوم انبیاء — بے کتاب وبے معید اوستا

ایسے قلب صافی پر بے استاد وکتاب، براہ راست علومِ خداوندی کا فیضان ہوتا ہے اور وہ روشن سے روشن تر ہو جاتا ہے۔

برکتِ عمل ......مگر یہ شان مادی علوم کی نہیں۔ صرف روحانی اور شرعی علوم کی ہے جب کہ ان پر عمل کیا جائے حدیث میں ہے۔ عمل کی برکت سے حق تعالیٰ قلب میں وہ علوم ڈالتا ہے جو پہلے سے اس میں نہ تھے اس لئے انسان اگر انسانیت چاہتا ہے تو اولاً عالم بنے، پھر عامل بنے تب آخر کار علمِ لدنّی کا وارث بنتا ہے۔ پس ابتدائی علم، علمِ دراست ہے اور انتہائی علم، علمِ وراثت ہے، یہ کتابوں کے درس ومطالعہ کا علم، علمِ دراست ہے۔ "مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" ①

انسانیت کی فیکٹریاں ......اور اس کی عملی مشق سے پیدا شدہ بصیرت وگہرائی علم وراثت ہے مگر علم وراثت نصیب ہوتا ہے علم دراست ہی سے۔ پس یہ مدارس علم دراست سکھاتے ہیں۔ اور علم وراثت کا راستہ صاف کرتے ہیں۔ اگر یہ مدارس دینیہ نہ ہوں تو نہ علم دراست ملے نہ علم وراثت۔ پس یہ مدارس اس لئے قائم کئے جا رہے ہیں کہ جو علوم ہمیں انبیاء سے وراثت میں ملے ہیں ان کو انسانوں تک پہنچا کر انسانوں کو انسان بنایا جائے۔ اس لئے یہ

① الحديث اخرجه ابونعيم في حلية وضعفه، الجزء العاشر، احمد بن ابي الحواري ج: ۳ ص: ۲۵۰.

مدارس گویا سچے انسانوں کو ڈھالنے کی فیکٹریاں ہیں۔

پس سائنس کی فیکٹریاں اور مشینریاں سامان ڈھالتی ہیں اور یہ مدارس کی فیکٹریاں انسان ڈھالتی ہیں۔ جس کے ظاہر و باطن علوم انبیاء سے روشن ہوں۔ مادی علوم محض ظاہر کی ٹیپ ٹاپ اور نمائش سکھاتے ہیں اور یہ حقیقی علوم (علوم شرعیہ) باطن کی آراستگی سکھاتے ہیں مادی علم صورت کا جمال بخشتا ہے اور روحانی علم سیرت کا جمال عطا کرتا ہے۔

صورت اور سیرت میں فرق ...... اور محض صورت کا جمال ایک عارضی حسن و جمال ہے جو جاتا آتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک دن مٹ جائے گا اسے دو دن بخار ہی آ کر مٹا دیتا ہے۔ یہ تمام رعنائی اور زیبائی ختم ہو جاتی ہے اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو بڑھاپے سے یہ ظاہری جمال کے سارے نقش و نگار زائل ہو جاتے ہیں اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت تو کہیں گئی ہی نہیں وہ تو ساری صورتیں اور خوبصورتیاں مٹا کر رہتی ہے البتہ سیرت پر اس کا بس نہیں چلتا۔ سیرت دنیا میں جیسی بھی بنالی جائے۔ اسے موت نہیں مٹا سکتی وہ قبر میں حشر میں اور اس کے بعد برابر قائم رہتی ہے۔ حدیث میں شریف میں فرمایا گیا ہے:

"تُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ وَتَمُوْتُوْنَ كَمَا تَحْيَوْنَ" حشر تمہارا اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئی ہے اور موت اس حالت میں آئے گی جس پر زندگی گزاری ہے۔ آج کل نوجوان صورت بنانے سنوارنے میں مصروف ہیں۔ حالانکہ اس چیز کے بنانے سے کیا فائدہ جو بنی ہے بگڑنے کے لئے۔

میرا ایک دفعہ حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب کے ہاں لدھیانہ جانا ہوا، ان کی مسجد میں ایک کتبہ آویزاں دیکھا جس کے الفاظ یہ تھے کہ: "مرد وہ ہے جسے دیکھ کر رعب طاری ہو۔ مرد وہ نہیں ہے جسے دیکھ کر شہوت ابھرے"۔

یعنی محض صورت آرائی شہوت رانی ہے۔ اور سیرت آرائی مردانگی ہے۔ پس آپ صورت کو کہاں تک بنائیں گے جو صورت بگڑنے کے لئے ہی بنی ہے اس کو کہاں تک بنائیں گے، سنواریں گے، بنانا اس چیز کا ضروری ہے جو بن کر بگڑتی نہ ہو اور وہ سیرت اور اخلاق فاضلہ اور علوم و کمالات ہیں۔

معیارِ کمال و قبول سیرت ہے نہ صورت ...... دنیا میں صورت فتنہ کا ذریعہ بنتی ہے اور سیرت عز و جاہ کا، حضرت یوسف علیہ السلام کنعان کے کنوئیں میں ڈالے گئے، مصر کے بازار میں کھوٹے داموں بیچے گئے۔ زلیخا کے غلام بنے۔ پھر جیل خانہ میں قید ہوئے۔ یہ سارے فتنے حسنِ صورت نے پیدا کئے لیکن جب مصر کی سلطنت ملنے کا وقت آیا تو وہاں سیرت نے کام کیا۔ چناں چہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کی حکومت کا مطالبہ کرتے وقت یہ نہیں کہا تھا کہ: اِجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَسِيْنٌ جَمِيْلٌ بلکہ: ﴿ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴾ کہا تھا یعنی علمی اور عملی سیرت پیش کی تھی جس سے حکومت ملی۔ صورت پیش نہیں کی تھی جس سے غلامی اور جیل کی قید و بند ملی تھی۔ پس حسنِ صورت فتنہ پیدا کرتا ہے اور حسنِ سیرت عز و جاہ اور کمال پیدا کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اسی سیرت کے سنوارنے کے لئے اس دنیا میں تشریف لائے ہیں، صورتوں کی آرائش کرانے کے لئے نہیں۔

"اِنَّ اللّٰهَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ"① اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا اس کی نظر تمہارے دلوں اور اعمال پر ہے۔ وہاں یہ معیار نہیں کہ جو دولت مند اور خوبصورت ہو اسے قبول فرمالے اور جو غریب ومفلس ہو اسے رد کردے۔ یہی معیار حضرات انبیاء علیہم السلام کے ہاں بھی ہے کہ وہ آدمی کا رد وقبول حسنِ صورت سے نہیں بلکہ حسن سیرت سے کرتے ہیں۔ دنیا والوں کے یہاں رد وقبول کا معیار حسن صورت اور دولت ہے۔

حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ صورت کے سیاہ تھے۔ غلام حبشی تھے۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو هُوَ سَیِّدُنَا وَمَوْلَانَا فرماتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی گردنیں بلال کے آگے جھک جاتیں، حسنِ صورت کی وجہ سے نہیں کہ وہ تھا ہی نہیں۔ بلکہ حسنِ سیرت کی وجہ سے کہ وہ بحدِ کمال ان میں موجود تھا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: مَارَاَیْتُ اَفْضَلَ مِنْ عَطَاءِ ابْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ حالانکہ وہ صورت کے کالے تھے وہ صورت کی تعریف نہیں تھی۔ سیرت کی تھی جس نے کالوں کو گوروں کے اوپر حاکم بنایا اور سیرت دو ہی چیزوں سے بنتی ہے قوتِ علم اور قوتِ اخلاق (یعنی قوتِ عمل) ان ہی دونوں قوتوں سے آدمی باقی مخلوق پر فائق ہوتا ہے اور اسے خلافت ملتی ہے۔ قربِ حق نصیب ہوتا ہے اور صورت دو چیزوں سے بنتی ہے، دولت سے اور جہالت سے۔

مدارس دینیہ سیرت سنوارنے کے لئے ہیں...... پس یہ مدارس دینیہ انسانیت کے ان ہی دو جوہروں کے پیدا کرنے کے لئے کھڑے کئے گئے ہیں اگر یہ مدارس نہ ہوں تو انسانیت دنیا سے ختم ہو جائے کالج اور یونیورسٹیوں میں لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں مگر وہاں انسانیت نہیں سکھائی جاتی۔ صرف صورت انسانی بنائی جاتی ہے۔

زہد وقناعت...... لیکن ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں، میں جن کا نام مدرسہ اور خانقاہ ہے۔ حقیقت انسانیت دکھلائی جاتی ہے اور زہد وقناعت انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم پر چلنے، حتیٰ کہ فقر وفاقہ تک سے بھی انسانیت حاصل کر لینی سکھلائی جاتی ہے۔ زہد وقناعت اسی علم کی بدولت قائم ہے۔ یہ علماء سو، پچاس روپیہ کی تنخواہ پر بخوشی گزارہ کر لیتے ہیں۔ ورنہ آج کل سو روپیہ کیا وقعت رکھتے ہیں۔ یہ اسی سیرت کی خوبی کا کمال ہے۔ کہ یہ لوگ اس تھوڑے پر راضی اور مطمئن ہیں۔ حضرت مولانا تھانوی اس شعر کو بار بار پڑھتے اور لذت لے لے کر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

مایچ نداریم غم ہیچ نداریم دستار نداریم غم پیچ نداریم

اور کبھی فرماتے ؎

لُنگکے زیر و لُنگکے بالا نے غم دزد و نے غم کالا

اور کبھی فرماتے ؎

کس نیاید بہ خانہ درویش کہ خراج زمین و باغ بدہ

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ واحتقارہ، ج: ۴، ص: ۱۹۸۶، رقم: ۲۵۶۴.

کل تک ہم زہد وقناعت کی فضیلت محض شرعی تعلیم پیش کر کے بتلاتے تھے لیکن آج زمانہ نے اس کی خوبیوں کا خود دنیا والوں کا مشاہدہ کرا دیا ہے۔ ہزاروں من غلے والے غیر مطمئن ہیں۔ لاکھوں کروڑوں روپیہ والے پریشان حال اور نالاں ہیں انہیں ہر وقت مارشل لاء کے قوانین نے ڈرا رکھا ہے لیکن جن کے پاس غلہ ہی نہیں یا بقدر ضرورت ہے وہ مطمئن ہیں پس دنیا کی کثرت اور سرمایہ داری کی افراط حسن نہیں۔ ایمان اور تقویٰ حسن ہے۔

بقدر ضرورت یسارے بُود کند کار ار مردِ کارے بُود

ورنہ دنیا کی کثرت کا تو یہ حال ہے کہ جب آتی ہے جب بھی مصیبت لے کر آتی ہے۔ اور جب جاتی ہے، جب بھی مصیبت چھوڑ کر جاتی ہے۔

اِذَا اَدْبَرَتْ کَانَتْ عَلَی الْمَرْءِ حَسْرَۃً وَاِنْ اَقْبَلَتْ کَانَتْ کَثِیْرًا ھُمُوْمُھَا

”جب دنیا جاتی ہے تو حسرت چھوڑ جاتی ہے اور جب آتی ہے تو ہزاروں غم ساتھ لاتی ہے“۔

بہر حال اس کے بٹورنے کی مساعی کی جگہ اگر آپ اپنی سیرت کو بنانے کی فکر کریں تو دنیا ہاتھ سے نہ جائے گی اور آخرت بھی درست ہو جائے گی، اور یہ ان ہی مدارس کے ذریعہ ممکن ہے۔ ان مدارس کی اگر آپ نے امداد کی تو آپ نے ان مدارس پر کوئی احسان نہیں کیا۔ کیوں کہ یہ چندہ حقیقت میں آپ نے قرضہ دیا ہے جو آپ کو مع سود کے واپس ملے گا۔ دنیا میں تو قرضہ دے کر نفع لینا سود ہے جو حرام ہے مگر وہاں آخرت میں سود جائز ہے، جو ملے گا اور ایک کے بدلے سات سو تک اور اس بھی زائد ملے گا پس آپ نے اگر ان مدارس کو چندہ دے دیا تو گویا آپ نے خدائی بینکوں میں رقم جمع کر دی۔ اگر آپ کے چندہ سے یہ مدارس قائم رہے اور ان کے ذریعہ آدمی آدمی بنتے رہے تو آپ ہی کی قوم بنے گی۔

احسانِ عظیم...... یہ مدارس صرف علم نہیں سکھلاتے، بلکہ ملک میں امن وامان کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ ان مدارس کی بدولت اگر متدیّن، خداترس آدمی پیدا ہوں گے تو نہ ڈکیتی ہوگی۔ نہ چوری نہ زنا کاری ہوگی۔ نہ شراب نوشی۔ تو امن کے ساتھ گورنمنٹ کے کروڑوں روپیہ کی بچت ہوگی اور پولیس اور فوج کی غیر معمولی بھرتی کی حاجت نہ رہے گی۔ ہر شخص اپنے حق میں خود پولیس مین بن جائے گا۔ پس یہ مدارس امن وامان چاہتے ہیں اور صحیح معنوں میں ملک کی خدمت کر رہے ہیں، اور پورے ملک کے یہ محسن ہیں۔ ان مدارس کی تقویّت وبقاء میں آپ کی تقویّت وبقاء ہے۔ اس لئے میں نے یہ آیتیں بیان کی ہیں۔

خاتمہ...... کہ انسان کو علم ہی کی وجہ سے افضلیّت اور نیابت ملی اور کائنات کی ساری ذی شعور مخلوقات پر بازی لے گیا۔ اس لئے اس افضلیّت کو اپنے حق میں باقی کر لیجئے اور جو منصب حق تعالیٰ نے بلا قیمت عطا فرما دیا ہے۔ اس کے تحفظ کی سعی کیجئے۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ علم بھی حاصل کریں اور عمل سے بھی آراستہ ہوں۔ (آمین)

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. اَللّٰهُمَّ اَعِذْنَا مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ اَللّٰهُمَّ اَعِذْنَا مِنَ الْفَوَاحِشِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ اٰمِيْن! محمد طیب غفرلہ

مدیر دارالعلوم، دیوبند انڈیا وارد حال اکوڑہ خٹک

۲۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء

مقصد نعمت ومصیبت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا إِلَیْہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

﴿وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ، وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَo الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ oاُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ.﴾① صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ.

دارالامتحان...... بزرگان محترم! یہ دنیا جس سے ہم اور آپ گزر رہے ہیں یہ پوری کی پوری امتحان گاہ ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے ہماری جانچ اور آزمائش کے لئے ہمیں بھیجا ہے۔ یہاں کی آزمائش کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ حق تعالیٰ کو علم نہیں تھا کہ یہ کیسے ہیں۔ اچھے ہیں یا برے ہیں؟ قوی ہیں یا ضعیف ہیں؟ ان کو سب معلوم ہے۔ ان کا علم ازلی اور ابدی ہے۔ جانچ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے دل میں اللہ نے جو جوہر پیدا کئے ہیں، ان کو کھول دے اور نمایاں کردے یعنی ہر چیز کی خاصیت کو ظاہر ہونے کا موقع دے۔ اگر ایک شخص قوی القلب ہے تو اس کو مصائب میں ڈالتے ہیں تاکہ اس کی قوتِ قلب واضح ہوجائے اور اگر ضعیف القلب ہے تو اس کا ضعف واضح ہوجائے تو حق تعالیٰ کے آزمانے کا مطلب استعلام (یعنی علم حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ پہلے سے علم نہیں تھا۔) نہیں ہے۔ بلکہ جوان کا علم جس کے متعلق ہے، اسکو نمایاں کرنا چاہتے ہیں تاکہ پوری دنیا میں واضح ہوجائے کہ فلاں چیز میں یہ اثرات تھے اور فلاں میں یہ خاصیتیں تھیں۔ اس لئے دنیا میں جو بھی آیا ہے وہ درحقیقت جانچ کے لئے آیا ہے۔ کہ جو بھی جوہر اس میں رکھے گئے ہیں ان کو کھولا جائے۔

مقصد امتحان...... اور جانچ کے لئے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے دو سلسلے قائم کئے ہیں، ایک سلسلہ نعمتوں کا اور ایک سلسلہ مصیبتوں کا۔ دونوں سے مقصد انسان کی جانچ اور آزمائش ہے۔ نعمتیں دے کر اس لئے آزماتے ہیں کہ

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۵، ۱۵۷.

آیا نعمتوں میں گھر کر یہ آدمی نعمت دینے والے کو بھی یاد رکھتا ہے یا نعمتوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ اگر ایک انسان اپنی نعمتوں میں، اپنی عیش میں الجھ کر رہ جائے۔ اور اسے یہ یاد نہ رہے کہ یہ نعمت کس نے دی تھی تو کہا جائے گا کہ اس بندے کے قلب میں کفرانِ نعمت کا جذبہ چھپا ہوا تھا۔ وہ کھول دیا گیا اور ظاہر ہو گیا۔ کل کو اگر اس کے لئے کوئی جزا تجویز کی جائے گی تو اس کو یہ کہنے کا موقع نہیں ہوگا کہ مجھے پہلے جانچ تو لیا ہوتا۔ آزمائش کا موقع تو دیا ہوتا۔ بلکہ خود اس پر نمایاں ہو جائے گا کہ اس جانچ میں پڑ کر میں نے اپنے بارے میں کیا ثبوت دیا۔ اس طرح سے نعمت دنیا میں خود ایک مستقل آزمائش کی چیز ہے۔ خواہ وہ دولت ہو، خواہ وہ عزت ہو۔

امتحان بطریقِ نعمت...... اس سب کا مقصد اپنا امتحانِ پیش کرنا ہے کہ تمہارا فرض کس درجہ پر ہے، تم منعم کو دیکھتے ہو یا نعمت کو دیکھتے ہو؟ نعمت دینے والے پر نظر ہے یا خود نعمت پر نظر ہے۔ اگر دینے والے پر نظر ہے تو بے اختیار انسان کی زبان سے شکر نکلے گا اور کہے گا۔ اے نعمتوں کے دینے والے تیرا فضل ہے کہ تو نے مجھے دیا، نہ میں اس کا مستحق تھا، نہ میں اس کا اہل تھا، یہ محض تیرا فضل اور انعام ہے، تو بندے نے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی نعمت دی گئی تھی۔ اس نے نعمت کا حق ادا کر دیا۔ تو نعمت کا حق فقط یہ نہیں ہے کہ آدمی نعمت کو استعمال کرے۔ بلکہ نعمت کے استعمال کے ساتھ ساتھ نعمت دینے والے کی طرف توجہ اس کی دین اور اس کے انعام کا شکر ادا کرنا یہ بھی اس کا حق ہے۔ گویا نعمت دیئے جانے کے بعد دو طرح سے آدمی آزمایا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اس نعمت کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرے۔ دوسرے یہ کہ اس نعمت پر نعمت دینے والے کا شکر ادا کرے، نگاہ اس کی طرف رہے۔ کیوں کہ جس کو دینا آتا ہے اس کو چھیننا بھی آتا ہے۔ جو دے سکتا وہ واپس بھی لے سکتا ہے۔ غرض جانچتے ہیں کہ اگر دینے والے پر نگاہ ہے اور شکر کرو گے تو دینے والے کے خزانے لامحدود ہیں وہ نعمتوں کو بہاتا رہے گا۔ اگر کفرانِ نعمت اختیار کیا معلوم ہوا کہ نعمت کی قدر کرنی نہ آئی۔ وہ اپنی نعمت کو واپس لے لے گا۔ تو واضح ہو گیا کہ نعمتوں کا دینا درحقیقت آزمائش اور جانچ کے لئے ہے اور جوہروں کے کھول دینے کے لئے ہے۔

امتحان بطریقِ مصیبت...... اسی طرح سے کبھی کبھی مصیبتوں سے بھی آزمایا جاتا ہے۔ مصیبت سے آزمائش یہ ہوتی ہے کہ مصیبت میں گھر کر آیا آدمی مصیبت ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے، واویلا، جزع فزع اور پریشانی ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے یا اس کی نگاہ مصیبت کے بھیجنے والے پر بھی ہوتی ہے کہ اس نے میری کسی مصلحت کے سبب اسے بھیجا ہے۔ اگر مصیبت پر نگاہ ہے مصیبت بھیجنے والے پر نہیں تو اس کا ثمرہ یہ ہے کہ آدمی کا بے صبراپن ظاہر ہوگا۔ اللہ کی شکایت ظاہر ہوگی کہ میں ہی آزمائش کے لئے رہ گیا تھا۔ اور میں ہی مبتلا کرنے کے لئے رہ گیا تھا۔ لیکن اگر مصیبت میں گھر کا ثابت قدم رہے اور یہ نہ دیکھے کہ مصیبت تو بے شک سخت ہے مگر بھیجنے والا ماں باپ سے زیادہ شفیق ہے اس لئے یہ مصیبت میرے ستانے کے لئے نہیں بھیجی گئی ہے، ایمان کی جانچ کے لئے بھیجی گئی ہے۔ پھر بندہ صبر کرے گا اور صبر کے امتحان میں کامیابی حاصل کرے گا۔ تو نعمت سے آدمی کی شکر گزاری کا امتحان ہوتا ہے اور

مصیبت سے آدمی کے صبر وتحمل کا امتحان ہوتا ہے کہ کون بندہ ثابت قدم ہے اور کون ضعیف القلب۔ جو نعمت اور مصیبت کے امتحان میں کامیاب ثابت ہوا وہی بندہ فی الحقیقت بندہ ہے۔ اور جو کامیاب نہ ہو وہ بندہ نہیں۔ یا نعمت کا بندہ ہے یا مصیبت کا بندہ ہے جو انہی دو کی طرف جھکتا ہے۔

مقامِ آدمیّت...... ہمارے آپ کے ہندوستان کے آخری بادشاہ ظفر، اس نے اس حقیقت کے ظاہر کرنے کے لئے ایک قطعہ کہا ہے، کچھ تو ظفر بادشاہ مزاج ہی صوفیانہ رکھتا تھا اور کچھ حالات نے اس کو درویش بنا دیا تھا۔ جس کی سلطنت چھنتی ہے وہی جانتا ہے کہ اس کے قلب پر کیا گزری ہے۔ تو اس نے ایک قطعہ کہا ہے اور خوب کہا ہے کہتا ہے کہ۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا

کتنا ہی عقلمند اور ہوشیار ہو مگر آدمی نہ سمجھنا

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا

جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

تو دینے والے کو نہ بھولے نہ اسے عیش اللہ سے غافل کرے، نہ طیش اسے اللہ سے غافل کرے۔ ایک حالت میں خوف پیش نظر رہے اور ایک حالت میں رجاء وامید اور شکر گزاری پیش نظر رہے۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اس دنیا میں انسان کو جانچنے اور آزمائش کے دو سلسلے رکھے ہیں۔ ایک نعمتوں کا سلسلہ اور ایک مصیبتوں کا سلسلہ۔

مقدارِ امتحان...... اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی ہے کہ جتنی زیادہ نعمت دی جاتی ہے۔ اتنی ہی زیادہ جانچ کی جاتی ہے، جس پر زیادہ مصیبت آتی ہے، اس کے قلب کی اتنی ہی زیادہ جانچ کی جاتی ہے۔ چھوٹی موٹی مصیبت کو آدمی جھیل جاتا ہے۔ صبر بھی کر جاتا ہے۔ جب بڑی مصیبت آئے، اس وقت ثابت قدم رہے تو کہا جائے گا کہ ایمان بھی مضبوط قلب بھی مضبوط۔ بڑی نعمت دیدی جائے پھر ثابت قدم رہے اور نعمت دینے والے کو نہ بھولے تو کہا جائے گا کہ یہ قوی القلب ہے اور امتحان میں کامیاب ہے۔

امتحان کی عمومی روش...... پھر اس کے ساتھ مصائب میں آدمی کی زیادہ جانچ ہوتی ہے نعمتوں میں اتنی نہیں ہوتی۔ اللہ نے اس عالم میں مصیبتیں بے شمار رکھی ہیں۔ اور نعمتیں کم رکھی ہیں۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ: آدم علیہ السلام کا پتلا جب اللہ نے بنایا اور مٹی کو پانی میں بھگویا ہے تو چالیس دن اس پر پانی پڑا ہے۔ اور چالیس دن اس پر مینہ برسایا گیا۔ تو روایات میں ہے کہ اس مٹی پر انتالیس دن غم کا مینہ برسا ہے اور ایک دن خوشی کا۔ اس لئے دنیا میں خوشی کم ہے اور مصیبت زیادہ۔ زیادہ تر انسان پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ زیادہ تر عیش اور بے فکری میں کم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ﴾ ①

ہم نے آدمی کو مصائب ہی کے اندر پیدا کیا ہے۔ تو زیادہ تر مصیبتیں انسان پر آتی ہیں، اس لیے جانچ بھی

① پارہ: ۳۰، سورۃ البلد، الآیۃ: ۴.

زیادہ مصیبتوں میں ہوتی ہے اور اوّل سے لے کر اخیر تک مصائب کا ایک سلسلہ ہے۔ جس آن انسان پیدا ہوتا ہے تو پیدائش کی گھڑی مصیبت ہی کی ہوتی ہے۔ آدمی روتا ہوا آتا ہے۔ چلاتا ہوا آتا ہے۔ کوئی بچہ بھی دنیا کے اندر ہنستا ہوا نہیں آتا۔ تو دنیا میں پریشانی کی حالت میں آیا۔ پھر جوں جوں عمر بڑھتی چلی جاتی ہے مصائب کا سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ انسان تمنائیں بہت باندھتا ہے، سو تمناؤں میں سے ایک پوری ہوتی ہے ننانوے میں ناکامیاب رہتا ہے۔ یہ ننانوے میں جو ناکامیابی ہے یہی اس کے حق میں مصیبت ہے تو اس کی تمنا اور طبیعت کے خلاف ہونا یہی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ اور یہ انسان کے لئے لازم ہے۔

مقصدِ نعمت ومُصیبت......اس دنیا کو حق تعالیٰ نے نہ فقط عیش کی جگہ بنایا نہ فقط مصیبت کی جگہ بنایا عیش بھی ہے مصیبت بھی ہے۔ گو عیش کم ہے مصیبت زیادہ ہے۔ جہاں فقط عیش ہے۔ مصیبت کا نام نہیں، اسی عالم کو ہم جنت کہتے ہیں اور جس جہان میں مصیبت ہی مصیبت ہے عیش کا نشان نہیں اسی کو ہم جہنم کہتے ہیں جہاں عیش کا کوئی تخیل بھی نہیں باندھ سکتا تو دونوں کی عیش اور مصیبت سے ملا کر دنیا کو بنایا گیا جس میں عیش بھی ہے مصیبت بھی ہے تو کچھ جنت کی نعمتوں کے نمونے ہیں اور کچھ جہنم کی مصیبتوں کے نمونے ہیں تاکہ انسان جب عالم آخرت میں پہنچے تو جب تک دنیا میں گزارے اسے اس عالم کا تصور ہو جہاں سے عیش آئی ہے اگر اسے عیش پسند ہے تو اس عالم کے لئے سامان کرلے اور اگر مصیبت ناپسند ہے تو اس جہان کی مصیبتوں سے ڈرنے اور بچنے کا آدمی اہتمام کرے۔ تو دنیا میں عیش اور مصیبت اس لئے رکھی ہے تاکہ انجام پر نظر رہے عیش کی جگہ کی طلب میں رہے اور مصیبت کی جگہ سے بچنے کا بندوبست کرتا رہے گا اس لئے اللہ نے یہ دونوں سلسلے جاری کئے۔

موت وحیات کی کشمکش......مصیبتوں کی انتہا موت پر ہوتی ہے اور نعمتوں کی انتہاء زندگی پر جا کر ہوتی ہے، زندگی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور موت مصیبتوں کا سرچشمہ ہے، موت کے معنی درحقیقت سلب حیات ہے۔ یعنی زندگی چھین لی جائے بس یہ موت ہے تو عیش کو چھین لیا جائے یہ عیش کی مصیبت یہ بھی موت ہے صحت کو چھین لیا جائے بیماری آجائے تو یہ صحت کی موت ہے مرض اور بیماری کی مصیبت مسلط ہوگئی تو جس طرح انسان کی ذات پر موت آتی ہے اسی طرح سے اس کے احوال پر موت آتی ہے ایک حال آتا ہے ایک جاتا ہے جو حال جاتا ہے اس کی موت واقع ہوگئی۔ جو حال آیا اس کی زندگی ہوگئی صحت گئی تو صحت کی موت آگئی عیش چلا گیا تو عیش کی موت آئی تو اس طرح ہر قدم پر انسان موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ نعمتیں آتی بھی ہیں، جاتی بھی ہیں۔

پھر ایک وقت آتا ہے کہ یہ خود ہی چلا جاتا ہے، اس کے احوال پر روزانہ موت طاری ہوتی رہتی تھی مگر خود اس کی ذات پر طاری نہیں ہوتی تھی۔ یہ جو آخری سانس ہے اس کی ذات کی موت ہے، وہ بھی بالآخر چلا جاتا ہے تو پوری دنیا موت وحیات کے درمیان کشمکش میں مبتلا ہے۔

ذرائعِ امتحان......تو اس آیت کریمہ کے اندر اس سلسلے کو بتلایا گیا ہے کہ ہم نے انسان کا مصائب سے امتحان

لیا۔اوراس کے صبر وتحمّل کا ہم نے امتحان لیا تو فرمایا گیا:﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ﴾

یہاں عربیت کے قاعدہ کے مطابق سب سے پہلے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ میں واولائے، جوتاکید کے لئے ہوتا ہے، لام لائے جوتاکید کے لئے ہوتا ہے۔ پھر صیغہ جمع کالائے جوخود تاکید کے لیے ہوتا ہے، پھر نون ثقیلہ تاکید لائے جو خودتاکید کے لئے ہوتا ہے، پھراس کوضمیر خطاب یعنی کم کی طرف منسوب کیا۔ تو کئی تاکیدیں لائی گئیں۔اس کے معنی یہ نکلے کہ ہم ضرور بالضرور تمہاری جانچ کرر ہے ہیں۔ یہ خیال مت کرنا کہ نعمتیں دیکر تمہاری جانچ اور آزمائش چھوڑ دیں گے لازمی طور پر تمہیں آزمائیں گے، تاکید کے الفاظ لائے گئے ہیں، اس لئے آدمی احتمالی بات نہ سمجھے۔ جانچ ضرور واقع ہوگی۔

پہلا ذریعہ ''خوف'' ......کا ہے سے واقع ہوگی۔تو فرمایا﴿ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ کبھی تو ہم دشمنوں کا خوف مسلط کریں گے، چہار طرف سے خطرہ ہے کہ ادھر سے نہ جان چلی جائے۔ ادھر سے کوئی حملہ نہ کردے۔ ادھر سے کوئی غنیم نہ چڑھ آئے۔کوئی دشمن نہ آجائے ہروقت ایک فکر لگی رہتی ہے۔

خوف سے آزمانے کی غرض کیا ہوتی ہے؟ تاکہ انسان چوکنا رہے، وہ جوتدبیر کرنے کا مادہ ہے وہ معطل نہ ہونے پائے۔ اگر بے خوف ہوکر آدمی بیٹھا رہے گا تو وہ جو بچاؤ کی تدبیروں کے جوہر رکھے گئے ہیں وہ سب ملیامیٹ ہوجائیں گے اورسب آدمی میں چھپے رہ جائیں گے،اس لئے خوف مسلط کرتے ہیں تاکہ بیداری اور تیقظ سے آدمی کام لے اوروہ تدابیر اختیار کرے جن سے بچا جاتا ہے تاکہ دل کے جوہر کھلیں کہ یہ کتنا مدبّر اوردانا تھا۔اور کتنا اس نے بچاؤ کا ثبوت دیا۔

دوسرا ذریعہ ''فقر'' ......﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ﴾ اورکبھی ہم بھوک دے کرآزماتے ہیں، کبھی اس طرح سے آزمائش ہوتی ہے کہ فقروفاقہ مسلط کردیا۔ایمان کی جانچ کرنا منظور ہے اور قلب کی قوت کی جانچ کرنا منظور ہے۔اس کے لئے کبھی خوف دیا کہ خوف اورگھبراہٹ میں آدمی ہمارا نام لیتا ہے یامحض پامال ہو کررہ جاتا ہے۔اگر ہمارا نام لیا تو فرماتے ہیں کہ ہم مدد کے لئے تیار ہیں ہم اس کی مدد کے لئے آئیں گے۔

﴿إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ ①

''اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا''۔اوراللہ کی مدد کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کے دین کی مدد کی جائے۔اوردین کی سب سے پہلی مدد یہ ہے کہ خود آدمی دین پر ثابت قدم رہے۔دین کوئی تصویر یا مجسمہ تو نہیں ہے کہ اس کی مدد کی جائے۔دین کی مدد کے یہ معنی ہیں کہ دین کو اپنے میں سمولے ہر حالت میں دین کو پیش نظر رکھے،دین کی مدد ہے۔اوراللہ کی مدد ہے۔﴿ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ﴾ ② ''مجھے یاد کروگے تو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔'' تم مجھے بھلادوگے تو میں بھی تمہیں بھلادوں گا۔

① پارہ:۲۶،سورۃ محمد،الآیۃ:۷۔ ② پارہ:۲،سورۃ البقرۃ،الآیۃ:۱۵۲۔

بندۂ تسلیم و رضا...... غرض کبھی تو آدمی خوف سے آزمایا جاتا ہے۔ اور کبھی فقر و فاقے سے آزمایا جاتا ہے کہ تنگ دستی مسلط کر دی لیکن تنگدستی کے باوجود بندہ یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے، تو جس حالت میں رکھے، میں تو بندہ ہوں بندگی کے معنی یہ ہیں کہ جو حال بھی آجائے آدمی شاکر اور صابر رہے، تسلیم و رضا کے ساتھ گردن جھکا دے۔ اگر اپنی تجویز پیش کرنے لگا کہ آپ نے میرے اوپر غم بھیج دیا۔ آپ کو تو خوشی بھیجنی چاہیے تھی۔ آپ نے میرے اوپر بھلا خوف کیوں مسلط کیا۔ میرے اوپر تو اطمینان بھیجنا چاہیے تھا۔ تو یہ تجویز ہے، بندہ بندگی کے لئے آیا ہے۔ بندگی کے معنی تفویض یعنی سونپ دینے کے ہیں کہ جس حالت میں آپ رکھیں میں راضی ہوں۔ اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ آدمی تجویز چھوڑ دے خود اپنے لیے کچھ تجویز نہ کرے، جو ادھر سے آجائے اس کے لئے راضی رہے، تو آزماتے ہیں کہ اس میں تفویض یعنی سونپ دینے کا اس کے قلب میں مضمون ہے یا اپنی تجویز اور خود رائی کا مضمون ہے۔ خود رائی اگر ہوئی تو یہ بندگی کے خلاف ہے رائے کو ترک کر دیا تو یہ بندگی ہے۔ کہ جو حق تعالیٰ چاہیں میں اسی پر راضی ہوں۔ گویا اس طرح سے آدمی بن جائے جیسا کے نہلانے والے کے ہاتھ میں میت ہوتی ہے کہ جدھر کو چاہے کروٹ دیدے جدھر کو چاہے پلٹ دے، میت یہ نہیں کہتا کہ ادھر مجھے کیوں کروٹ دی ادھر کو کیوں نہ دی؟ بس بالکل غسال کے ہاتھ میں ہے۔ یہی شان بندے کی اپنے پروردگار کے ہاتھ میں ہونی چاہیے کہ ادھر سے جو حالت آئے اسی پر لگ جائے اور کہے اے اللہ تیرا شکر ہے، میں اسی کے اندر راضی ہوں اگر خوف آئے تو راضی ہو جائے۔ مانگتا تو رہے اطمینان، مگر پیش جو کچھ آئے اس پر رضامندی کا اظہار کرے، بندگی اسی کا نام ہے۔

کسی غلام سے کسی نے پوچھا تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا تھا جو آقا کھلا دے۔ کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے۔ کام کیا کرے گا؟ جو آقا کام دے دے۔ تو اس نے کہا کہ آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو میں غلام ہی کیوں ہوتا۔ میرے غلام ہونے کے معنی یہ ہیں کہ میرا ارادہ بھی غلام، میری خواہش بھی غلام، میری مرضی بھی غلام، جو کچھ مرضی ہے وہ آقا کی، جو کچھ ارادہ ہے وہ آقا کا۔ وہ آقا ہے اور میں غلام ہوں۔ تو ایک انسان جب ایک انسان کا خادم اور غلام بن جاتا ہے، حالانکہ اس آقا نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ اس کی زندگی اور نعمت و مصیبت آقا کے ہاتھ میں نہیں۔ مگر بہر حال نام کا تو غلام بن گیا۔ تو آدمی اس درجہ اپنے کو جھکا دیتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ نہ میری مرضی نہ میری خواہش نہ میرا ارادہ۔ تو اللہ رب العزت کا بندہ جس کے ہاتھ میں جان بھی ہے اور جس کے ہاتھ میں اس کا ایمان بھی ہے۔ اور جس کے ہاتھ میں اس کی عزت و آبرو ہے۔ اس کے سامنے کوئی تجویز رکھے اور دعویٰ کرے کہ میں بندہ ہوں تو یہ دعویٰ غلط ہوگا۔ بندگی کے معنی یہ ہیں کہ جو آپ چاہیں وہی ٹھیک ہے اسی میں میری رضا ہے۔ تو اس تسلیم و رضا کا پیدا ہو جانا اور بندۂ رضا بن جانا یہی فی الحقیقت بندگی ہے تو اس غلام نے کر کے دکھلایا کہ اس سے کہا گیا کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو آقا کھلا دے کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے۔

جوہرِ قلب کا امتحان...... یہی حال بندے کا ہونا چاہیے کہ اگر پوچھا جائے ایک انسان سے کیا تو خدا کا بندہ

ہے؟ کیا معنی ہیں تیرے بندہ ہونے کے؟ وہ یوں کہے کہ اگر عیش میں رکھے تو میں اس کا بندہ اگر وہ مصیبت میں رکھے تو میں اس کا بندہ۔ اگر وہ اطمینان دے تب بھی میں اس کا بندہ اگر وہ فکر میں مبتلا کردے تب بھی میں اس کا بندہ تب تو ہے بندگی۔ اگر یوں کہے کہ نعمت آتی تب تو میں خدا کا بندہ اور نعمت چھین لی تو پھر میں بندہ نہیں پھر تو شکایت کروں گا۔ تو وہ خدا کا بندہ نہیں ہے وہ نعمت کا بندہ ہے۔ نعمت اس کا معبود ہے۔ اگر وہ آ گیا ہے تو یہ راضی ہے نعمت چلی گئی وہ ناراض ہوگیا۔ اس دنیا میں آدمی خدا کی بندگی کرنے آیا ہے۔ نعمت کی بندگی کرنے نہیں آیا۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ ہم آدمی کے اس جوہر کو جانچتے ہیں کہ یہ کس حد تک ہمارا بندہ ہے۔ مصیبت ہو یا نعمت ہو کس حد تک ہماری طرف جھکتا ہے اس لئے نعمت ومصیبت کا یہ سلسلہ قائم کردیا۔

طہارت روح...... حدیث میں ہے کہ اگر ایک انسان کے گناہ زیادہ ہوں اور حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اس کو اعلیٰ مقام اور مقام کریم عطاء کریں۔ اس کے اعمال میں سکت نہیں۔ معاصی اور گناہوں کی کثرت ہے تو اس کو اس مقام کے لائق بنانے کے لئے ہم اس پر بیماری مسلط کردیتے ہیں۔ جوں جوں بیماری بڑھتی ہے وہ صبر وتحمل کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اے اللہ! تو جس حالت میں رکھے میں راضی ہوں۔ اس بیماری کی مصیبت سے اس کے گناہ کا کفارہ ہو رہا ہے۔ اور مقامِ کریم کے قریب پہنچ رہا ہے۔

اگر اس کے گناہ نپٹ گئے اور اس مقام تک پہنچ گیا تو بہتر، اور پھر بھی اگر اس کے گناہ باقی رہ گئے تو بیماری کے ساتھ میں ناداری بھی مسلط کردیتا ہوں۔ بیمار پہلے سے تھا، مفلس اب ہوگیا۔ ہاتھ میں پیسہ نہیں کہ غذا استعمال کرے، دوا استعمال کرے۔ تو بیماری بھی ہے مگر علاج کے لئے پیسہ نہیں۔ اور فاقہ بھی ہے مگر غذا کے لئے پیسہ نہیں لیکن اس حالت میں بھی ثابت قدم ہے۔ کہتا یہی ہے کہ اے اللہ! تو جس حالت میں رکھے میں راضی ہوں۔ فرماتے ہیں کہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو رہا ہے۔ اس کے قلب میں جو گناہوں کا میل کچیل بھرا ہوا تھا وہ اب مٹ رہا ہے۔ اگر گناہ نمٹ گئے فبہا، نہ نمٹے تو فرماتے ہیں کہ اس پر موت مسلط کردیتا ہوں کہ اس کا کوئی عزیز میں چھین لیتا ہوں۔ بیماری پہلے سے تھی، ناداری بعد میں آئی، موت اب مسلط ہوگئی۔ عزیز قریب چلے ہوئے جارہے ہیں۔ یہ بھی اس کے لیے کفارہ سیئات ہے جتنا اس پر غم پڑے گا۔ اتنا ہی اس کے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ اتنا ہی اس کو قرب خداوندی نصیب ہوگا۔ اتنا ہی اجر ملے گا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ایک انسان کو ایک کانٹا بھی چبھ جاتا ہے اور اس سے تکلیف پہنچی ہے تو اس چبھن پر ایک نیکی نامہ اعمال میں لکھ دیتے ہیں اور ایک بدی مٹا دیتے ہیں۔ اگر دس دفعہ کانٹا چبھا تو دس نیکیاں مل گئیں اور دس بدیاں مٹ گئیں۔ اور یہ ادنیٰ مصیبت پر ہے۔ اندازہ کیجئے کہ اگر بڑی مصیبت پڑے تو نیکی بھی بڑی دی جائے گی اور بڑی سے بڑی مصیبت کا کفارہ بھی کیا جائے گا۔ تو یہ مصائب کا سلسلہ کفارہ کے لئے ہے کہ مصیبتیں گھٹ جائیں اور نیکیاں بڑھ جائیں اس کے درجات بلند ہوجائیں اور اس مقام کریم کے قابل ہوجائے۔ اگر یہ بدیاں

نمٹ گئیں اور روح میل کچیل سے صاف ہوگئی تو فبہا۔ اور اگر پھر بھی صاف نہ ہوئی تو حدیث میں فرمایا گیا کہ میں نزع میں شدت کر دیتا ہوں۔ جان کنی شدید ہوتی ہے۔ یہ خود ایک مستقل مجاہدہ انسان کو ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس میں بھی بندۂ صبر و رضا بنا ہوا ہے۔ جانتا ہے کہ میں قاہر و جابر کے ہاتھ میں ہوں، مجھے راضی رہنا چاہئے وہی میرا مالک ہے۔ اس سے اگر برائیاں نمٹ گئیں اور کفارہ ہوگیا تو فبہا۔ اور اگر نہ ہوا تو پھر قبر کی اندر کچھ ہولناک حالات پیش آتے ہیں۔ قبر کا فتنہ ہے، قبر کا دبانا ہے منکر نکیر کا آنا ہے، سوال و جواب ہے۔ آزمائش اور امتحان ہے۔ یہ بھی در حقیقت کفارے کے لئے ہے۔ اگر یہاں بھی گناہ نہ نمٹے تو پھر میدان محشر کے ہولناک حالات سے گزرنا پڑے گا۔ دھوپ کی تیزی ہوگی، سرگردانی ہوگی، اللہ رب العزت کے سامنے کھڑے ہونے کا ایک دہشت ناک مقام ہوگا۔ اگر وہاں گناہ نمٹ گئے تو فبہا۔ اگر نہ نمٹے تو آگے پل صراط ہوگا، وہ ایک مصیبت ہے۔

حدیث میں ہے کہ پل صراط جو جہنم کے اوپر باندھا جائے گا۔ پندرہ ہزار سال کا اس کا راستہ ہوگا۔ پانچ ہزار برس چڑھائی کے، پانچ ہزار برس اترائی کے اور پانچ ہزار برس برابر چلنے کے۔ اس کے اوپر سے انسان کو گزارا جائے گا۔ یہ خود ایک مستقل مصیبت ہوگی۔ یہ دراصل کفارہ کے لئے ہوگا کہ جو کچھ روح کا میل کچیل ہے وہ نکل جائے۔ پھر بھی اگر نہ نکلا اور معصیتیں باقی رہ گئیں تو اس پل سے کٹ کر آدمی جہنم میں جا گرے گا۔ مومن کو جہنم میں کفارہ سیئات کے لئے ڈالا جائے گا۔ کافر کو تو ایندھن کے طور پر ڈالا جائے گا۔ مومن کو صاف کرنے کے لئے ڈالا جائے گا۔ جیسا کہ سونار بھٹی میں کوئلہ بھی ڈالتا ہے اور سونا بھی ڈالتا ہے۔ کوئلہ ڈالتا ہے تا کہ آگ روشن ہو اور سونا اس لئے ڈالتا ہے۔ کہ اس کا میل کچیل جل کر سونا کندن ہو کر نکل آئے، مومن کو اس لئے ڈالتے ہیں کہ اس کے ایمان پر جو معصیتوں کا خس وخاشاک رہ گیا تھا۔ اور اس کی روح میں میل کچیل رہ گیا تھا۔ وہ جل جلا کر روح صاف ہو جائے، اور کندن بن کر نکلے اور اس مقام کریم کے لئے لائق ہو جائے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ غرض اس مقام تک پہنچانے کے مصیبتوں کا ایک سلسلہ ہے۔ پیدائش سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے لے کر بڑھاپے تک اور بڑھاپے سے لے کر موت تک اور موت سے لے کر قبر تک اور قبر سے لے کر حشر تک اور حشر سے لے کر پل صراط تک ایک مصیبتوں کا سلسلہ ہے، سارا سلسلہ اس لئے ہے۔ کہ انسان جل جلا کر کندن ثابت ہو۔ اس کے اندر جو غل وغیظ کی کدورتیں بھری ہوئی ہیں۔ اعمال بد اور معصیتوں کی کدورتیں ہیں وہ سب جل جلا کر صاف ہو جائیں۔ اور وہ کسی اعلیٰ مقام کے لائق ہو۔

مصائب کفارۂ سیئات ہیں...... اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آپ نے ایک بہت عمدہ صاف ستھرا لباس پہن رکھا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس پر میل کچیل آنا شروع ہوا۔ ہفتہ بھر میں اتنا میلا ہوگیا کہ وہ برا معلوم ہونے لگا تو آپ اسے بیزاری کے ساتھ اتار کر غسل خانے میں پھینک دیتے ہیں۔ اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ ہاتھ بھی لگائیں بلکہ نفرت سے دیکھتے ہیں۔ اگر مکان میں سامنے میلے کپڑے ڈال دیئے جائیں۔ اگر چہ وہ آپ ہی کے ہوں۔ آپ

گھر والوں سے کہیں گے کیا حماقت ہے میلی کچیلی چیزیں سامنے ڈال دیں۔ ان کو کہیں ایک طرف کونے میں ڈالو۔ تو آپ کو خود نفرت ہو جاتی ہے اس لئے کہ ان پر میل آ گیا۔ کپڑا تو وہی ہے، قیمت بھی اس کی وہی ہے۔ اتنا ہی تو فرق ہوا کہ میل اس پر آ گیا بد بو اٹھنے لگی۔ آپ کو نفرت ہو گئی۔

اب دھوبی اس کپڑے کے ساتھ کیا سلوک کرگا؟ سب سے پہلے اسے ایک نہر یا تالاب کے کنارے ایک لکڑی کا پٹڑا بچھا کر زور زور دے کر مارنا شروع کرے گا۔ اتنی اس کپڑے کو سزا مل رہی ہے کہ بھگو بھگو کر مارا جارہا ہے، اگر کپڑے کے زبان ہو اور وہ دھوبی سے یوں کہے کہ ظالم میں نے تیرا کیا قصور کیا تھا؟ تو مجھے پٹخ پٹخ کر مار رہا ہے۔ تجھے ذرا ترس نہیں آتا۔ تو دھوبی کہے گا کہ احمق تیرے ہی نفع کے لئے دے دے کر مار رہا ہوں۔ تیرا میل کچیل نہیں نکل سکتا۔ جب تک تجھے اس طرح دے دے کر نہ مارا جائے، تو پڑے پر دے دے کر اسے مارا تو پوری سزا دی۔

اسی پر بس نہیں کی، بھٹی چڑھا کر اس کے نیچے آگ جلا کر اس میں کپڑے کو ڈال دیا۔ پانی آگ کی وجہ سے ساں ساں کر رہا ہے۔ گویا زبان حال سے کپڑا چلا رہا ہے۔ کہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہوا کہ اب تک تو مجھے پٹخ کر مارا گیا تھا، اب مجھے بھٹی میں آگ کے اوپر رکھ دیا۔ وہ جل رہا ہے یہاں تک کہ اسے بھٹی میں نکالا گیا اور اسے نچوڑا گیا۔ اس میں سے بہت سا میل نکلا۔ پھر دھوبی اس پر قناعت نہیں کرتا۔ یہاں سے جانے کے بعد اس پر استری کرتا ہے، ایک لوہے یا پتیل میں آگ ڈال کر اسے تپا کر پھیرتا ہے۔ تا کہ اس کپڑے کے بل بھی نکل جائیں۔ جو رسل پڑے ہوئے تھے وہ بھی باقی نہ رہیں۔ پھر اس پر ابرک کوٹ کر جمایا گیا۔ جس سے اس میں چمک پیدا ہوئی۔ پھول سا بنا کر مالک کے پاس وہ کپڑے کو لایا، تو اب یہ مالک کا سلوک نہیں ہوگا کہ وہ کہے اسے پرے پھینکو۔ اب عزت کے ساتھ اگر عمامہ ہو تو سر پر جگہ دی جائی گی، چوغہ ہے تو اسے بغل میں ڈال دیا جائے گا، کرتہ ہے تو اس کو گلے میں پہنیں گے۔

اور جس مجلس میں بیٹھیں گے اس کے مناقب بیان ہوں گے کہ بڑا نفیس کپڑا ہے اس کی کتنی قیمت ہے، لوگ پوچھیں گے کہ کہاں سے منگوایا ہے تو آپ منہ بھر کر کہیں گے کہ فلاں کارخانہ کا بنا ہوا ہے، اتنا بہتر ہے اس کے اوصاف یہ ہیں، دھلنے، کے بعد ایسا ہوتا ہے، ایسا ہوتا ہے، تو مجلس میں اس کے مناقب بیان کئے جارہے ہیں، اس کی خوبیاں بیان کی جارہی ہیں۔ مالک کے سر پر جگہ ملی اور وہ عمامہ بن کر سر پر پہنچا! یہ کاہے کا نتیجہ تھا کہ اس میں سے میل کچیل نکل گیا میل کچیل نکالنے کے لئے مصیبتوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا، دے دے کر الگ مارا گیا۔ بھٹی میں الگ جلایا گیا۔ استری جلتی ہوئی گرم الگ اس پر پھیری گئی۔ دھوپ میں الگ تپایا گیا۔ ان مصیبتوں سے گزرنے کے بعد اب وہ مقام عزت پر پہنچا۔ اور اس کی تعریفیں کی جانے لگیں۔

اب اگر اس کپڑے کو عقل ہو تو وہ دھوبی کا شکریہ ادا کرے گا کہ میری بڑی خیر خواہی کی کہ مجھے ان مصیبتوں سے گزارا۔ اگر میں نہ گزرتا تو یہ عزت کا مقام نہ پاتا۔ بعینہ یہی صورت انسان کی بھی ہے کہ اللہ نے اس کو صاف

ستھرا کر کے دنیا میں بھیجا تھا۔ "كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ" ①

ہر انسان صاف، صحیح فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے۔ گناہ گار بن کر نہیں آتا لیکن جوں جوں جوانی چڑھتی ہے اور اسبابِ عیش مہیا ہوتے ہیں، معصیتوں میں اور نفسانی جذبات میں مبتلا ہوتا ہے۔ ان کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔ اس کو بھول کر یہ خیال نہیں آتا کہ یہ نعمتیں کس نے مجھے دی تھیں۔ یہ انعامات کس نے کیے؟ اگر ایک غریب آدمی ایک سجدہ کرتا ہے، تو مجھ کو اللہ نے اتنی نعمتیں دی ہیں کہ مجھ کو ایک ہزار سجدے کرنے چاہئیں۔ جس کے پاس جتنی نعمت ہو اتنا ہی اس کو شکر ادا کرنا چاہئے، مگر اس کو یہ خیال نہیں آتا۔ معصیتوں اور گناہوں کا میل کچیل اس کی روح میں بھرا رہتا ہے۔

مالک الملک کی طرف سے اسے تکلیف دی جاتی ہے لیکن متنبہ نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ مصائب کے سلسلہ میں ڈالتے ہیں، جیسے دھوبی نے کپڑے کو مصیبتوں کے سلسلہ میں ڈالا تھا، لیکن دھوبی کا منشا کپڑے کو ستانا نہیں تھا، مقام بلند تک پہنچانا تھا۔ اسی طرح سے حق تعالیٰ کا منشاء ان مصیبتوں سے بندے کو بلند مقام تک پہنچانا ہے۔ اس کو مصیبتوں کی بھٹیوں میں ڈالتے ہیں۔ کبھی ناداری مسلط کر کے، کبھی دشمنوں کا خوف مسلط کر کے کبھی فقر و فاقہ مسلط کر کے کبھی غم والم مسلط کر کے، کبھی عزیزوں کو چھین کر کے اور کبھی موت کو مسلط کر کے، یہ سب چیزیں اسلئے ہیں کہ اس کے قلب میں جو میل کچیل ہے وہ نکلے اور قلب میں توجہ الی اللہ اور نورانیت پیدا ہو۔ جب یہ پیدا ہو جائے گی تو مقام کریم پر پہنچا دیا جائے گا۔

تو حاصل یہ نکلا کہ نعمتیں ہوں یا مصیبتیں۔ دونوں سلسلے جانچ کے لئے ہیں اور جانچ اس لئے نہیں کہ حق تعالیٰ کو علم نہیں تھا (معاذ اللہ) بلکہ علم تھا۔ اس علم کو ظاہر کرنے کے لئے کہ بندہ بھی محسوس کرے کہ میں نے کیا کیا تھا اور اللہ نے میرے ساتھ کیا کیا۔ مصیبتوں کو دیکھ کر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ شاید میرے ساتھ برائی کی جارہی ہے، لیکن اگر اس کے دل میں فکر ہے اور دماغ میں عقل کی خوبی ہے تو وہ کہے گا کہ میرے ساتھ برائی نہیں کی جارہی ہے۔ میرے ساتھ بھلائی کا سامان کیا جارہا ہے۔ حق تعالیٰ کو مجھے مقام عزت تک پہنچانا مقصود ہے، اسی لئے مجھے مصیبتوں کی بھٹی میں ڈالا ہے۔

عملِ جراحی...... بالکل اس کی مثال یہی ہے جیسا کہ کسی بچے کو کوئی پھوڑا پھنسی نکل آئے تو آپ ڈاکٹر کو بلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب علاج کیجئے۔ اگر ڈاکٹر نے مرہم لگایا تو معمولی پھوڑا پھنسی اس سے درست ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر بڑا دنبل نکلا ہوا ہے۔ تو ڈاکٹر کہتا ہے آپریشن کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ آپ کہتے ہیں کہ آپریشن کیجئے۔ ڈاکٹر نے نشتر لگایا، بچہ روتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میرے باپ کو شاید میرے ساتھ دشمنی پیدا ہوگئی۔ جیتی جاگتی کھال کٹوا دی اور باپ ہے کہ ڈاکٹر سے کہہ رہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب! دیکھئے ذرا گہرا نشتر لگائیے ایسا نہ ہو کہ مادۂ فاسد باقی رہ جائے، پھر کل کو ابھرے، ایسا آپریشن کیجئے کہ صاف ہو جائے۔ اس نے چبھا چبھا کر گہرا نشتر لگایا۔ اور بچہ چلا رہا ہے کہ باپ تو قصائی ہو گیا، اس کے اندر رحم و کرم باقی نہیں رہا مگر باپ بچے کی کوئی فریاد نہیں سنتا۔

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب ماقیل فی اولاد المشرکین، ج: ۱ ص: ۴۶۵ رقم: ۱۳۱۹.

اور جب ڈاکٹر نشتر لگا کر فارغ ہو چکتا ہے تو ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ بچہ اور ناخوش ہوتا ہے کہ ایک تو اس نے میری کھال کاٹ دی اوپر سے اس کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔

لیکن جب زخم درست ہو جاتا ہے اور عقل درست ہوتی ہے تو اب وہ بچہ باپ کا شکر گزار ہوتا ہے۔ کہ اگر آپ نشتر نہ لگواتے تو زندگی خطرہ میں رہتی اگر نشتر نہ لگتا اور مادہ فاسد باقی رہ جاتا تو وہ پھیل کر تمام اعضاء کو خراب کر دیتا جڑیں بڑھ جاتیں اور موت واقع ہو جاتی اس سے بچاؤ کی یہی تدبیر تھی کہ آپریشن کیا جائے۔

ٹھیک اسی طرح۔ جب ہماری روح میں مصیبتوں اور گناہوں کے پھوڑے پھنسیاں اور بری حرکات کے دنبل نکل آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپریشن کرتے ہیں اور نشتر لگاتے ہیں۔ یہ مصیبتیں درحقیقت آپریشن ہیں۔ کہ ان سے مادہ فاسدہ نکالنا ہوتا ہے۔

مصائب کے ذریعہ اصلاحِ اخلاق...... یہی وجہ ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے تو آدمی کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ جب عیش وطرب کی کثرت ہوتی ہے تو آدمی میں غنا پیدا ہوتا ہے اور سرکشی بڑھ جاتی ہے، حق تعالیٰ اس کا علاج کرتے ہیں کہ کچھ نعمتیں چھین کر بتاتے ہیں۔ اگر دانشمند ہو تو فوراً متوجہ ہو کر توبہ کی طرف لگ جاتا ہے، تو نتیجہ نکل آتا ہے کہ اسے متوجہ کیا گیا تو یہ متوجہ ہو گیا تو نعمت دوبارہ واپس کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر نہیں مانتا تو پھر دوسرا آپریشن کرتے ہیں۔ یہ ساری مصیبتیں درحقیقت بندے کے حق میں آپریشن ہیں۔ اس لئے مصلحت ہیں اور خوبی کا ذریعہ ہیں اس کے انجام کی بھلائی پیش نظر ہوتی ہے، اس لئے حق تعالیٰ شانہ، ان مصائب کے نشتر کے ذریعہ سے جو مادۂ فاسدہ بھرا ہوا ہے اس کو خارج کرتے ہیں۔

میرا مقصد یہ ہے کہ اگر مصیبتیں آئیں اور مصیبتوں میں سب سے بڑی مصیبت موت کی ہے۔ اگر کسی کے گھر میں آئے تو آدمی یہ نہ سمجھے کہ یہ میرے ستانے کا سامان کیا گیا ہے۔ یہ منجانب اللہ خیر و برکت کا سامان اور عبرت دلانے کا سامان ہے۔

آپ غور کر کے دیکھیں ہر شخص کو اس کا تجربہ ہوگا کہ جس گھر میں میت ہوتی ہے، قلوب میں اس درجہ توجہ الی اللہ پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیا کی بے ثباتی ہر شخص کے سامنے ہوتی ہے۔ اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہی کچھ میرے لئے بھی درپیش ہے، مجھے بھی اس راستہ سے جانا ہے وہ جو ایک بے فکری طغیانی اور سرکشی تھی وہ خود بخود گھٹ جاتی ہے، برسوں کے مجاہدے کے بعد وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی جو ایک جنازہ سامنے آنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ نے موت وحیات کا سلسلہ اس لئے رکھا ہے تاکہ انابت کا مضمون پیدا ہو اور قلوب کی بے فکری ہٹ جائے۔

مقصدِ موت...... اور اگر یہ شخص رونے دھونے میں لگ جائے اور رات دن میت کو یاد کر کے روئے تو اس سے نہ میت کو فائدہ ہوگا اور نہ خود اس کو۔ موت اس لئے بھیجی گئی تھی کہ اس کو دیکھ کر آدمی اپنی موت کو یاد کرے، نہ یہ کہ دوسرے کی موت میں الجھ کر رہ جائے۔ تو اصل مقصد موت کا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے عبرت حاصل کی جائے اور

اپنے اخیر وقت کو یاد کیا جائے اور ایسے سامان پیدا کئے جائیں کہ ہمارے لئے بھی نافع ہو اور میت کے لئے بھی نافع ہو۔اس لئے مثلاً تلاوت قرآن کریم بتلائی گئی کہ ایصال ثواب کریں، ایصال ثواب سے اس کو بھی راحت پہنچے گی اور آپ کے قلب کو بھی تسکین ہوگی۔

اور اس کے لئے بہترین تدبیر یہ دعاء ہے جو اس آیت کریمہ میں بتلائی گئی اور فرمایا گیا:﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ﴾ ''ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کبھی دشمنوں کا خوف مسلط کر کے، کبھی بھوک اور فقر و فاقہ مسلّط کر کے، کبھی مال گھٹا کر اور خسارہ دے کر اور کبھی جانوں کو کم کر کے، یعنی موت مسلّط کر کے، تو مختلف طریقوں سے آزمائیں گے''۔

دعاءِ تسکین......لیکن فرماتے ہیں ان مصیبتوں کے بعد جو صبر کر گیا اور تحمل سے کام لیا کہ اپنے پرورگار پر نگاہ رکھی۔تو فرماتے ہیں:﴿ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ ''بشارت دے دو صبر کرنیوالوں کو'' کہ جب ان پر مصیبت آتی ہے وہ تسکین کی یہ دعاء پڑھتے ہیں۔وہ دعاء یہ ہے:﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ ''ہم سب اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں''۔

تسکینِ عقل......اس میں تسلی کس طرح سے دی گئی دو جملے فرمائے گئے:ایک اِنَّا لِلّٰهِ. اور ایک اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ . اِنَّا لِلّٰهِ. کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب اللہ کی ملک ہیں۔جب ذہن میں یہ تصور آ گیا تو آدمی سمجھے گا کہ مالک کو اختیار ہے اپنی ملک میں جیسا چاہے تصرف کرے، مالک اگر یہ چاہے کہ میں اپنی چیز کو اوپر رکھ دوں تو حق ہے اگر یہ چاہے کہ میں اسے نیچے کے کمرے میں رکھ دوں یہ بھی اس کا حق ہے اور اگر وہ یہ چاہے کہ زمین سے نیچے رکھ دوں یہ بھی اس کو حق ہے۔

جب ہم اللہ کی ملک ہیں، زمین کے اوپر رکھنا چاہے، یہ بھی اس کو اختیار ہے، زمین کی تہہ میں قبر میں پہنچانا چاہئے۔یہ بھی اس کو اختیار ہے، قبر سے آگے کسی اور عالم میں بھیج دے یہ بھی اس کو اختیار ہے، تو اس۔کا مطلب اللہ کی مالکیت کا تصور ہے کہ وہ مالک اور ہم مملوک ہیں، وہ ہمارا آقا اور ہم اس کے خادم۔اور مالک کو اپنی ملک میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے تو عقلی طور پر انسان میں صبر آ گیا۔عقل نے سمجھا دیا کہ جب تو ملک ہے تو تجھے واویلا کرنے سے کیا مطلب؟ حق تعالیٰ مالک ہیں۔اور مالک کو اپنی ملک میں تصرف کرنے کا اختیار حاصل ہے، تو عقلی طور پر صبر آ گیا۔

تسکینِ طبع......لیکن طبعی طور پر ابھی غم مسلّط ہے، عقل بے شک سمجھا رہی ہے کہ مالک نے اپنی ملک میں تصرف کیا ہے، یہ بندہ اس کی ملکیت تھا۔اس نے اس کو اٹھا لیا۔بہر حال طبعی طور پر رونے کا جذبہ موجود ہے تو دوسرے جملہ میں اس کا علاج کر دیا گیا۔

﴿وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ ہم سب لوٹ کر اس کی طرف جانے والے ہیں، اس میں یہ بتلا دیا گیا کہ جہاں یہ گیا

وہاں تم بھی پہنچو گے۔ گھبرانے کی کیا بات ہے؟ یہ تو چند دن کی جدائی ہے۔ اس کے بعد جہاں یہ ہوگا وہاں تم ہو گے۔

اگر ہمارا کوئی عزیز سفر پر چلا جائے یا ملازمت پر ایک ہزار میل کے فاصلے پر چلا جائے۔ بعض دفعہ دس دس برس ملاقات نہیں ہوتی، لیکن آدمی یوں نہیں گھبراتا کہ جب موقع ہوگا وہ چلا آئے گا۔ ملنے کا امکان ہے، تو اس امکان کی وجہ سے جدائی کا غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہاں امکان نہیں بلکہ قوت یقین سے یہ چیز حاصل ہے کہ جہاں یہ گیا وہاں ہم بھی پہنچنے والے ہیں۔ امکان پر اگر صبر آجاتا تھا تو یقین سے صبر کیوں نہیں آئے گا؟ تو ''اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ'' سے انسان کو طبعی طور پر بھی صبر آجاتا ہے تو ''اِنَّا لِلّٰهِ'' سے عقلی طور پر اور ''وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ'' سے طبعی طور پر صدمہ گھٹ جاتا ہے۔ طبیعت اور عقل دونوں بتلا دیتی ہیں کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، جو واقعہ پیش آیا ہے وہ تمہارے لئے بھی پیش آنا ہے۔ تو اس آیت کریمہ اور دعاء میں سبق دیا گیا۔ اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ: اگر کوئی ادنیٰ بھی مصیبت آئے تو فوراً کہو ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

صرف میت ہی پر یہ دعا نہیں پڑھی جاتی بلکہ اگر یہ ایک پیسہ بھی گم ہو جائے تو بھی پڑھی جائے۔ کوئی کپڑا بھی گم ہو جائے جب بھی پڑھو۔

تاثیر دعاء تسکین...... اس دعا کی برکت سے صبر بھی حاصل ہوتا ہے۔ مالک کی طرف توجہ بھی ہوتی ہے اور بدل بھی مل جاتا ہے۔ نعم البدل ہاتھ آجاتا ہے۔ یہ اس دعا کی خاصیت ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ مصائب کے سلسلہ میں جزع فزع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ صبر ہی کرنے سے سب کچھ ملتا ہے صبر و تحمل سے اپنے کو بھی ملتا ہے دوسرے کو بھی ملتا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کا بیٹا آٹھ نو سال کا تھا بہت خوبصورت اور ہونہار تھا۔ اور ظاہر بات ہے کہ ماں باپ کی توقعات اولاد ہی سے وابستہ ہوتی ہیں، اولاد ان کی زندگی کا سہارا ہوتی ہے۔ غرض ان کو بہت زیادہ محبت تھی اور توقعات بھی تھیں اور صورت شکل سے ہونہار معلوم ہوتا تھا۔ یہ بچہ بیمار ہوا۔ اس زمانے میں جو علاج ہوتا تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ لیکن بیماری بڑھتی گئی اسی حالت میں انہیں ایک دو دن کا سفر پیش آیا اور سفر بھی کوئی ضروری تھا۔ اس لئے جانے پر مجبور ہوئے تو بیوی سے یہ فرمایا کہ بچے کی تیمارداری پوری کی جائے اور علاج معالجے میں کوئی کمی نہ کی جائے اور میں پرسوں تک آجاؤں گا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روانہ ہو گئے۔ ان کی غیبت میں ان کے آنے کا دن تھا کہ بچے کا انتقال ہو گیا۔ تو بیوی بھی صحابیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ صاحب نسبت اولیاء میں سے تھیں انہوں نے بچے کی لاش کمرے میں رکھی اور چادر سے ڈھانک دی اور باہر آکر بیٹھ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ پہنچے تو عرب کے قاعدے کے مطابق بیوی نے آگے بڑھ کر خاوند کا استقبال کیا۔ مصافحہ کر کے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ چومے۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا کہ بچہ کیسا ہے؟ تو فرمایا کہ: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بِعَافِیَةٍ وَخَیْرٍ'' خدا کا شکر ہے بڑی عافیت اور خیریت میں ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات

نہیں، وہ مطمئن ہو گئے۔ ان کو کھانا کھلایا۔

کھانا کھلاتے ہوئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے آپ سے شریعت کا ایک مسئلہ پوچھنا ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہمارے پاس امانت رکھوائے، اور اس کی ایک میعاد مقرر کرے کہ برس دن کے بعد میں اپنی یہ چیز یا پیسہ واپس لے لوں گا۔ پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ٹھیک مقرر وقت پر ادا کر دینا چاہئے۔ تو کہا کہ ہم دیر لگائیں اور ٹال مٹول شروع کر دیں۔ فرمایا کہ: ہمیں کوئی حق نہیں۔ اگر ایسا ہوگا تو یہ خیانت ہے اور امانت داری کے خلاف ہے۔ کہا اگر ہم نے وقت پر ادا کر دیا۔ مگر دل میں گھٹن پیدا ہوئی کہ ہم نے کیوں ادا کیا رکھ ہی لیتے۔ فرمایا گھٹنے کا تمہیں کیا حق ہے، وہ چیز تمہاری کب ہے۔ اپنی چیز پر آدمی گھٹے۔ دوسرے کی چیز پر گھٹن لانے کا کیا حق ہے؟ بلکہ فرمایا کہ: شکر یہ ادا کرنا چاہے کہ ٹھیک وقت پر امانت سے ادا ہو گئے۔ کوئی خیانت نہیں ہوئی۔ جس کی چیز تھی اسے پہنچ گئی۔ کہا کہ شریعت کا مسئلہ یہ ہے۔ فرمایا: مسئلہ تو یہی ہے اس کے بعد فرمایا کہ:

''وہ جو آپ کا بیٹا تھا وہ اللہ کی امانت تھی۔ اس نے ٹھیک آٹھ برس دو مہینے کے لئے ہمارے پاس بھیجا تھا۔ جب میعاد پوری ہو گئی تو قاصد آیا اور کہا کہ میری امانت میرے حوالے کرو۔ ہم نے حوالے کر دی۔ اب ہمیں بیٹھ کر گھٹنا چاہئے؟ ہمیں غم میں مبتلا ہونا چاہئے؟''۔

بیوی کے ہاتھ چومے، اور فرمایا کہ: خدا تجھے جزائے خیر دے تو نے میرے دل کو ایسا صبر دیا کہ بجائے غم کے مجھے خوشی ہے کہ امانت، امانت داری کے ساتھ ادا کر دی گئی۔ وقت مقررہ پر ہم سبکدوش ہو گئے۔ اور امانت مالک کو پہنچا دی۔

حقیقت حال یہی ہے کہ اللہ جب کسی نفس کو واپس لیتا ہے۔ تو طبعی طور پر صدمہ اور غم ضرور ہوتا ہے۔ مگر عقل اور طبیعت دونوں بتلاتی ہیں کہ مالک کو اپنی ملک میں تصرف کا حق تھا طبعیت کہتی ہے کہ جدائی کا غم ہے یہ تو چند روزہ جدائی ہے پھر ہم بھی وہیں جانے والے ہیں، اس سے آدمی کے اندر صبر اور سکون پیدا ہوتا ہے۔

اجرِ صبر...... اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے لئے اجر شروع ہو جاتا ہے۔ تو دنیا بھی بنتی ہے آخرت بھی بنتی ہے اس لئے میت ہو جانے کے بعد گھٹن میں رہنا یا غم والم میں رہنا یا میت کا اس لئے تذکرہ کرنا کہ غم تازہ ہو۔ یہ منشاء شریعت کے خلاف ہے۔ صورت یہ ہونی چاہے کہ جب غم تازہ ہو تو وہ افعال انجام دینے چاہئیں جن سے ہمیں نفع ہو۔ اور میت کو بھی نفع ہو۔ تو پہلی چیز یہ ہے کہ یہ دعاء پڑھے: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ دوسری چیز پھر ایصال ثواب ہے۔ قرآن شریف کی تلاوت میں آدمی لگے تو قلب کو تسکین الگ ہوگی۔ میت کو ثواب پہنچے گا اور اس کے درجات الگ بلند ہوں گے۔

حدیث میں ہے کہ: میت عالم برزخ میں پہنچ کر ہر ہر رشتہ دار، عزیز اور پس ماندہ کی طرف متوجہ رہتا ہے کہ کون میرے لئے کیا کرتا ہے۔ اس کی مثال دی گئی کہ جیسے دریا میں کوئی ڈوبتا ہوا ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے

کہ شاید میں اس کی وجہ سے ڈوبنے سے بچ جاؤں، میت کی یہی کیفیت رہتی ہے۔ تو عزیز واقارب کی طرف اس کی آس لگی رہتی ہے کہ کوئی مجھے یاد کرتا ہے یا نہیں؟ کوئی اجر پہنچاتا ہے یا نہیں؟

برزخ میں آثارِ نعمت...... حدیث میں فرمایا گیا کہ: مردوں کو اجتماع کا کچھ وقت دیا جاتا ہے تو جب وہ جمع ہوتے ہیں تو اگر کسی کے پاس زیادہ ثواب پہنچتا ہے تو وہ دوسرے مردوں کے اوپر فخر کرتا ہے کہ میرے عزیز تھے جو مجھے یاد کرتے تھے اور اگر کسی کا کوئی عزیز نہیں ہوتا تو وہ کہتا ہے کہ میرا بھی کوئی عزیز ہوتا تو مجھے یاد کرتا تو اس کو خجالت اور ندامت ہوتی ہے۔ اور اس کا سر اونچا نہیں ہوتا۔ تو جو دنیا میں کیفیت تھی کہ نعمت زیادہ ہوتی ہے تو آدمی کا سر اونچا ہوتا تھا۔ مصیبت آپڑتی تھی تو سرنگوں ہو جاتے تھے۔ یہی کیفیت برزخ میں بھی رہتی ہے۔

فرق اتنا ہے کہ وہاں راحت اور مصیبت کمائی نہیں جاتی۔ یہاں سے بھیجی جاتی ہے، یا یہاں کا کیا ہوا اس کے ساتھ رہتا ہے۔ تو اگر کوئی ثواب پہنچا دیتا ہے تو اس کا سر فخر سے اونچا ہوتا ہے اور وہ دوسروں سے کہتا ہے کہ تمہارے عزیز قریب تو کچھ نہیں بھیج رہے تو یہ ہے وہ چیز جس سے اپنے قلب کو بھی تسکین ہوتی ہے اور میّت کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن محض رونا یا غم میں مبتلا رہنا ہمارے لئے بھی تکلیف دہ ہے اور میّت کے لئے بھی تکلیف دہ ہے نہ اس کے لئے فائدہ نہ ہمارے لئے فائدہ۔

میّت اور پس ماندگان کا باہمی نفع...... تو یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ: اس گھرانے پر جو ایک سال میں دو صدمات واقع ہوئے۔ ایک باوانی صاحب مرحوم کی وفات اور ایک ان کے داماد ستار بھائی صاحب کی وفات حقیقت میں یہ دو بڑے صدمات ہیں۔ ایک سال کے اندر اتنے بڑے صدمات کا پڑنا کہ دو گھروں کے دو وارث اٹھ جائیں یہ کوئی کم صدمہ نہیں ہوتا۔ لیکن جتنا بڑا صدمہ ہوتا ہے اس سے اگر آدمی چاہے تو اتنی ہی بڑی آخرت کمائی جاسکتی جتنا دل میں غم ہو اور صدمہ ہو، اتنا ہی بڑا صبر ہوگا اور اتنا ہی بڑا اجر ہوگا۔

وقتِ صبر...... اور صبر اپنے وقت پر ہوتا ہے مدت کے گزر جانے پر تو ہر ایک کو صبر آجاتا ہے۔ وہ باعثِ اجر نہیں ہوتا۔ صبر وہی باعثِ اجر ہے جو ارادہ واختیار سے مصیبت کو دبانے کے لئے کیا جائے۔

حدیث میں ہے کہ: ایک بڑھیا کا جوان بیٹا مر گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے۔ بڑھیا واویلا فریاد اور بین کر کر کے رو رہی تھی۔ آپے سے باہر تھی۔ آپ نے فرمایا: بڑی بی! صبر کرو۔ حق تعالیٰ کو یہی منظور تھا تحمل کرو۔ ①

اس نے جذبے میں کہا کہ: تمہارے اوپر گزرتی، جب میں جانتی۔ میرا تو جوان بیٹا مر گیا تم مجھے کہہ رہے ہو صبر کرو۔ اسے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ غرض جواب دے دیا اور کہا کہ: مجھ سے نہیں صبر ہوتا۔ فرمایا: اچھا تو جان۔ تیری مرضی۔ اور آپ آگے گزر گئے۔

اسے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ تو بے چاری پریشان اور نادم ہو کر نبی کریم صلی

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب زیارۃ القبور، ج: ۱، ص: ۴۳۰ رقم: ۱۲۲۳.

اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑی اور مسجد نبوی میں جا کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ صبر کی تلقین فرما رہے تھے۔ اب میں صبر کرتی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُوْلٰى" "جب صدمہ پڑ رہا ہو جب صبر کیا جائے وہ صبر ہے"۔

وقت گزر جانے کے بعد مجبوری کا صبر ہوتا ہے۔ اس پر اجر و ثواب مرتب نہیں ہوتا۔ جب آدمی غم میں ڈوبا ہوا ہو۔ اس وقت آدمی تحمل کرے اور اپنے پروردگار کی طرف توجہ کرے تو یہ صبر ہے تو اتنے بڑے صدموں کا یقیناً غم بھی زیادہ ہوگا اس غم میں جتنا صبر کیا جائے گا اتنا ہی اجر بھی زیادہ ملے گا۔

مشترکہ غم ......اور پھر اس پر غور کیا جائے کہ کوئی بڑی شخصیت گزرتی ہے تو وہ کسی ایک گھرانے کا صدمہ نہیں ہوتا۔ وہ ہزاروں کا صدمہ ہوتا ہے۔ باوانی صاحب مرحوم، ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ بہت سے لوگوں کے وارث بنے ہوئے تھے۔ بہت سوں کے باپ بنے ہوئے تھے۔ ہزاروں کو ان سے فائدہ تھا۔

ہزاروں کو ان سے نفع ہو رہا تھا۔ یہی وجہ ہے جیسا کہ سننے میں آیا جنازے میں اتنا ہجوم تھا کہ باید و شاید ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ہر شخص ان کا مرہون منت تھا۔ کوئی اخلاق کا کوئی دولت کا کوئی انعام کا کوئی اکرام کا اپنے اپنے غم میں ہر کوئی رو رہا تھا۔ تو ایسی شخصیت کا غم کسی ایک خاندان کا غم نہیں ہوتا۔ کسی ایک گھرانے کا غم نہیں ہوتا، یہ پورے ملک کا غم ہوتا ہے۔ پورے شہر کا غم ہوتا ہے۔

تو جب غم اٹھانے والے بہت سے ہوں تو دو چار گھر والوں کو ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ زیادہ غم کے اندر ڈوبیں۔ وہ تو کہیں گے ہمارا غم تو سب نے مٹا دیا۔ سب کے اندر بٹ گیا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ سب غم زدہ ہیں۔

خیر الناس...... ایسی شخصیتوں کے گزرنے سے جو خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ ہوں جن سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہو۔ وہ بہترین خلائق سمجھے گئے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَنْفَعُ النَّاسَ ترجمہ: بہترین انسان وہ ہے جس سے دوسروں کو نفع پہنچے۔ فرمایا گیا بہترین انسان وہ ہے جو مِفْتَاحٌ لِلْخَيْرِ ہو اور مِغْلَاقٌ لِلشَّرِّ ہو۔ یعنی اس کے ذریعے خیر کے دروازے کھلتے ہوں اور شر کے دروازے بند ہوتے ہوں۔ دنیا کے اوپر برائیوں کے دروازے بند کرتا ہو اور بھلائیوں کے دروازے کھولتا ہو۔ وہ درحقیقت پوری دنیا کا وارث اور والی بن جاتا ہے۔ اس لئے اس کا غم بھی ساری دنیا کا غم ہوتا ہے۔

تو باوانی صاحب مرحوم یا ستار بھائی مرحوم درحقیقت ایسے لوگ تھے جو اپنی دولت سے بھی لوگوں کو نفع پہنچاتے تھے۔ اپنے دین سے بھی لوگوں کو نفع پہنچاتے تھے۔ ستار بھائی کو میں نے دیکھا کہ تبلیغی سلسلے میں رات دن منہمک کبھی ڈھاکہ جا رہے ہیں۔ اور کبھی ادھر ادھر گویا دین پھیلانے کا ان کے دل کے اندر ایک جذبہ موجود تھا۔ تو جس جس تک ان کی آواز پہنچی، انہوں نے اس کو دین کا فائدہ پہنچایا۔ تو کوئی دین کا نفع پہنچانے والا تھا۔ کوئی دنیا کا یہ خَيْرُ النَّاسِ میں داخل تھے۔ یقیناً ایسے لوگوں کا صدمہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ مگر ایسے صدمے میں جتنا تحمل اور

صبر کیا جائے اتنا ہی بڑا اجر بھی ہوتا ہے، کسی شاعر نے کہا ہے ۔

یاد داری وقت زادن تو ہمہ خنداں تو گریاں

شاعر انسان کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ تجھے یاد ہے جب تیری پیدائش کا وقت تھا کہ تو تو روتا ہوا آیا تھا اور ساری دنیا خوشی خوشی ہنس رہی تھی۔

آنچناں زی کہ وقت مردن تو ہمہ گریاں خنداں

ایسی زندگی گزار کہ تو ہنستا ہوا جائے اور دنیا تیرے لئے رو رہی ہے تو نیک لوگ جب جاتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ وہ تو ہنستے ہوئے جاتے ہیں اور رونے والے پیچھے سے روتے ہیں۔

رونے کی حقیقت...... لیکن یہ رونا درحقیقت ان کی موت کا رونا نہیں ہوتا۔ اپنے نفع کے گم ہو جانے پر رونا ہوتا ہے۔ ورنہ میت تو اپنے اعلیٰ مقام پر پہنچتی ہے، تو اعلیٰ مقام پر پہنچنے کی وجہ سے کسی کو غم تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کا انتقال کسی مقدس زمانے میں مثلاً رمضان میں ہو تو یہ کہہ کر تسلی دیا کرتے ہیں کہ میاں! غم کرنے کی کیا بات ہے خوش ہونا چاہئے کہ موت کا کتنا اچھا زمانہ ملا۔ اگر کسی کا انتقال کسی مقدس مقام پر مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ "زَادَهُمَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً" میں ہو جائے لوگ وارثوں کو تسلی دیتے ہیں کہ غم کرنے کی بات نہیں خوش ہو جاؤ کہ پاک مقام مل گیا۔ مدینہ طیبہ کی زمین نے اسے قبول کر لیا معلوم ہوا کہ موت غم کی چیز نہیں نہ کوئی موت پر غم کرتا ہے نہ روتا ہے۔ رونا اپنی جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے یہ شخص چھن گیا۔ خود تو وہ بہت اچھے مقام پر پہنچ گیا کہ آج باوانی صاحب مرحوم اگر نہیں ہیں کہ موت واقع ہو گئی۔

موت تو ہمیں بھی آئے گی، جتنے ہم ہیں ہم سب کو آئے گی، اس پر کیا رونا؟ بلکہ اس بارے میں تو خوش ہونا چاہئے کہ ایک اعلیٰ ترین زندگی گزار کر ایک اچھے مقام پر انشاء اللہ پہنچ گئے تو ہمارے لئے خوشی کی بات ہے۔ یہ جو غم اور رونا ہے یہ ان کی جدائی پر ہے کہ ہم سے ایک ذات چھن گئی۔ حقیقت میں آدمی اپنی غرض اور اپنے منافع کو روتا ہے نہ کہ مرنے والے کو تو مرنے والے کے انجام کو جب دیکھتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ بڑا اچھا خاتمہ ہوا۔

اچانک موت...... اب جیسے باوانی صاحب مرحوم کا میں نے سنا کہ۔ اچانک موت واقع ہوئی اور ہارٹ فیل ہوا۔ حدیث میں فرمایا گیا مَوْتُ الْفُجَآءَةِ الخ ① اچانک کی موت کافر کے لئے عذاب ہے اور مومن کے لئے رحمت ہے۔ تو اللہ کی فرمائی چیز ہے تو یہ یقینی ہے کہ ان کے لئے رحمت واقع ہوئی۔ اس لئے کہ بحمد اللہ وہ مومن تھے اور مسلم تھے اور مسلم پر جب اچانک موت آتی ہے وہ رحمت بنتی ہے۔ تو موت تو خوشی کی چیز ثابت ہوئی کہ رحمت نے انہیں قبول کر لیا۔ آگے غم اپنا ہے کہ وہ ہم سے چھین لئے گئے۔ ہم سے وہ جدا ہو گئے تو اس جدائی۔ کی تسکین یہ ہے کہ ہم ایصالِ ثواب کریں۔ ان کو یاد رکھیں تو وہ ہم سے قریب رہیں ہم ان کے قریب رہیں۔ کبھی کبھی ان کے

① مصنف ابن ابی شیبة، كتاب الجنائز، باب في موت الفجاءة وماذكر فيه، ج:٣، ص:٣٨ رقم١٢٠٠٥.

مزار پر جا کر زیارت کرلیں۔

آدابِ زیارت..... حدیث میں ہے کہ جب قبر کی زیارت کی جاتی ہے تو آدابِ زیارت میں سے فرمایا گیا کہ آدمی قبلہ کی طرف پشت اور میّت کی طرف منہ کرے، اس لئے کہ میّت اسے دیکھتا ہے اور پہچانتا ہے، جو پہچان دنیا میں تھی وہی برزخ میں جا کر رہتی ہے، پچھلا علم سلب نہیں ہوتا۔ چھن نہیں جاتا۔ جو جذبات اور جان پہچان دنیا میں تھی وہ وہاں بھی باقی رہتی ہے تو جس سے جتنا تعلق ہوتا ہے وہاں بھی قائم رہتا ہے، جس سے جتنی جان پہچان تھی وہ قائم رہتی ہے، تو اس تعلق کو نبھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے مرنے والوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھا جائے اور ایصال ثواب کے جائز طریقے اختیار کر کے ان کو نفع پہنچایا جائے۔ اس میں مرنے والوں کا بھی نفع ہے اور پس ماندگان کے لئے بھی تسکین ہے۔ انہی چند کلمات پر تقریر ختم کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، اور نافع فرمائے۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. اَللّٰهُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِی الْاُمُوْرِ كُلِّهَا وَاَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْاٰخِرَةِ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِکَ يَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

افاداتِ بخاری نمبرا

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِ ہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِ یْرًا ، وَّدَ اعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا."

اَمَّـا بَعْـدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّ جِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ربط بین الابواب...... یہ بخاری کی آخری حدیث ہے۔جس پر امام ہمام نے اپنی کتاب کو ختم کیا۔ پہلے تو امام کی اس صنعت پر غور کیا جائے، کہ ابتداء بھی عجیب انداز سے فرمائی اور انتہاء بھی عجیب انداز سے کی، محدثین کرام کا طریق یہ ہے کہ اگر کسی نے جامع لکھی تو ''کتاب الایمان'' سے ابتداء کرتے ہیں اور اسکے بعد دوسرے ابواب لاتے ہیں، اور اگر سنن کی کتاب ہے، تو عموماً ابتداء ''کتاب الطہارت'' سے کی جاتی ہے اور پھر نماز، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے ابواب لاتے ہیں۔تو سنن کا بھی ایک طریقہ ہے، اور جوامع کا بھی ایک طریقہ ہے

وحی سے ابتداء کی وجہ......لیکن مصنف نے ''کتَابُ الْاِیْمَان'' سے ابتداء کرنے کے بجائے، بَـابُ بَدْءِ الْـوَحْـيِ سے کی ہے کہ وحی کی ابتداء جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح ہوئی۔اسکی وجہ یہ ہے کہ جتنے دین کے ابواب ہیں، ان کا مادہ درحقیقت وحی ہے۔وحی مادہ شریعت ہے، اور اس مادہ کی بھی شاخیں ہیں۔کوئی شاخ کتاب الایمان ہے کوئی شاخ کتاب الصلوٰۃ ہے۔کوئی شاخ کتاب الزکوٰۃ ہے۔تو ان سب میں وحی جلوہ گر ہے۔ قدر مشترک وحی ہے اور اس کی شکلیں مختلف ہیں۔اور وہی وحی کبھی نماز کی صورت میں نمایاں ہوئی اور وہی وحی کبھی حج کی صورت میں نمایاں ہوئی۔اور وہی وحی کبھی دوسرے ابواب کی صورت میں ''ظہور پذیر ہوئی'' تو مادہ شریعت کا وحی خداوندی ہے، اس لئے مصنف نے ابتداً مادۂ شریعت کو ذکر کیا۔اس کے بعد پھر اس کی شکلوں کو ذکر کیا'' اور ظاہر بات ہے کہ مادہ کا وجود شکل پر مقدم ہوتا ہے''۔

بنیادِ علم ایمان ہے......تو سب سے پہلے کتاب الایمان کو لاتے ہیں۔اس لئے کہ تمام اعمال کی مقبولیت کا دارومدار ایمان پر ہے۔ایمان نہ ہو تو کوئی عمل مقبول نہیں ہوسکتا، گویا ایمان تمام علوم کا مدار علیہ اور موقوف علیہ تھا۔ اس لئے پہلے کتاب الایمان لائے اب آدمی کو ایمان حاصل ہوگیا اعتقاد حاصل ہوگیا۔حق تعالیٰ کی یکتائی پر، نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت پر، تو سب چیزوں پر یقین ہو گیا۔

ضرورتِ علم...... لیکن یقین کے بعد علم کی ضرورت پڑتی ہے، کہ اس یقینی چیز کو ہم کس طرح انجام دیں، ظاہر ہے کہ اس کیلئے علم کی ضرورت ہے، جہالت سے کوئی چیز انجام نہیں دی جا سکتی تو کتاب الایمان کے بعد کتاب العلم لائے ہیں تاکہ علم کی عظمت اور علم کی نوعیت واضح ہو جائے۔ گویا اب آدمی میں ایمان بھی ہے اور علم بھی حاصل ہو گیا۔

مقصدِ تخلیق...... اس کے بعد پھر عبادات شروع کئے ہیں جو انسان کی پیدائش کا اصل مقصد ہے ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ ① تو مقصد اصلی یہ ہے کہ انسان عبادت کرے۔ عبادت کے معنی ہیں کہ بندے کا ربط اللہ سے اور عبد کا معبود سے رابطہ کیا ہے؟ اس رابطے اور جوڑ کو عبادت کہتے ہیں۔ کہ جس سے بندہ قربت حق حاصل کر سکے۔ اور حق تعالیٰ سے تقرب پیدا کر سکے۔

عبادات کے بعد معاملات...... جب بندے اور خدا کا رشتہ جڑ گیا۔ اس کے بعد بندوں سے بندوں کا کیا واسطہ ہے۔ تو معاملات (کے ابواب) لائے جس میں نکاح بھی ہے، جس میں بیع و شراء بھی ہے، ہبہ اور میراث بھی ہے، اوقاف بھی ہیں یہ تمام معاملات لائے ان تمام کو جب بیان کر لیا۔ اس کے بعد ان تمام چیزوں کو فتنوں سے بچانے کی کیا صورت ہے؟ ساری معلومات حاصل ہیں۔ سارے ابواب سامنے ہیں مگر فتنہ اتنا ہے کہ ان پر عمل کرنا مشکل ہے۔

ضرورتِ جہاد...... تو پھر کتاب المغازی لائے اس کے ذریعے جہاد فی سبیل اللہ ہے تا کہ دین کو فتنوں سے محفوظ رکھا جائے اور فتنہ مرتفع ہو، پھر اس کے بعد جب جہاد بھی آ گیا تو ان مجاہدین کی نوعیت کیا ہونی چاہئے؟ تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال انبیاء علیہم السلام کی سیرتیں ذکر کیں کہ اصل مجاہد تو یہ حضرات تھے، ان کی پیروی میں دوسرے جہاد کریں گے۔

طریقِ عمل...... لیکن طریق عمل کیا ہو گا؟ جس سے علم پر عمل کرے، ظاہر ہے کہ وہ طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے، اس لئے اس کے بعد "بَابُ اتِّبَاعِ السُّنَّةِ" لاتے ہیں کہ سنت کی پیروی ہو گی تب اس علم پر عمل نصیب ہو گا۔ اور علم پر عمل نصیب ہو جانا جب موثر ہو گا۔ جب پہلے ایمان ہو گا تو پہلے کتاب الایمان لائے، پھر کتاب العلم لائے اور پھر کتاب اتباع السنۃ لائے۔

فضیلتِ امّت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم...... ان تمام ابواب کو اس امت کی فضیلت پر لا کر ختم کیا اور آخر میں یہ حدیث لائے جس کی آپ نے تلاوت کی ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ مصنف نے دنیا سے ابتداء کی اور آخرت پر لا کر کتاب کو ختم کیا۔

ندرتِ سند...... دنیا میں انسان ایمان کا مکلف تھا، پھر اسلام کا، پھر اعمال کا، پھر معاملات کا، ساری چیزیں انجام دیں تو سوال یہ ہے کہ بھائی اس کا ثمرہ کیا نکلے گا؟ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ ہمیں کوئی اجر ملے گا؟ کوئی صلہ ملے گا؟ کوئی

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

مقبولیت پیدا ہوگی؟ تو اس حدیث پر لاکر ختم کیا کہ تسبیح و تہلیل پر کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور بندہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے تو نیا سے ابتداء کی اور آخرت پر لاکر ختم کیا یہ ایک عجیب وغریب صنعت ہوگئی کہ آغاز میں اللہ کا نام اور انتہاء میں قیامت اور یوم حشر، اس کے ثمرات اور بیچ میں سارا معاملہ اسلام اور ساری زندگی کا بیان ہے۔

عظمتِ سند...... تو جیسے کتاب جلیل القدر ہے، اور جیسے مصنف جلالت والے ہیں، اسی طرح سے ان کی صنعت بھی جلالت قدر رکھتی ہے، کہ مصنف علام نے عجیب وغریب صنعت اختیار کی ہے۔ یہ تو میں نے ابتداء بخاری کے بارے میں عرض کر دیا۔

اوصافِ حدیثِ متعلقہ...... اب اس کے بعد یہ حدیث آئی جو تلاوت کی گئی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے: "كَلِمَتَانِ خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ حَبِيبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيمِ" ① اس میں تسبیح "سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيمِ" کا ذکر ہے۔ حدیث میں اس کے تین اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں، ایک تو حسی صورت ہے جو کانوں سے محفوظ ہوتی ہے اور آدمی دیکھ سکتا ہے، ایک معنوی چیز ہے اور ایک اخروی چیز ہے تو تین صفات بیان کی گئی ہیں۔

حسی وصفِ اول...... پہلی صف یہ بیان کی گئی ہے کہ "خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ" یہ کلمے زبان پر بہت ہلکے ہیں۔ ان کے پڑھنے میں کوئی دشواری اور پیچیدگی نہیں کہ زبان کو اینچنا پڑے، "بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ" عربی زبان جیسی خفیف اور اخف زبان کے یہ کلمات ہیں، زبان بھی ہلکی پھلکی ہے اور یہ کلمات "خاص طور پر" اس میں اور ہلکے پھلکے ہیں، جن کے ادا کرنے میں نہ زبان کو کوئی دشواری پیش آئے اور نہ اینچنا پڑے، بہت ہی ہلکے پھلکے ہیں۔

سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيمِ

فضیلتِ عربی...... اور بناء اس کی یہ ہے کہ خود عربی زبان بہت ہی خفیف اور ہلکی بھی ہے، اس کے کلمات جن معانی کو ادا کرتے ہیں وہ کلمات ایسے لطیف ہیں کہ ان کے بغیر وہ حقیقت ادا نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہی کلمہ نہ پڑھا جائے، ان کلمات کو دوسری زبان میں ادا کرنا ہو تو دوسری زبانوں میں کلمات نہیں ملتے جو اس پوری حقیقت کو ادا کر دیں۔ تو زبان پاکیزہ اور نہایت خفیف ہے، لسان اللہ بھی ہے، حق تعالیٰ اسی میں کلام فرماتے ہیں، اللہ نے اسی زبان کو اپنے معجزے کے اظہار کے لئے منتخب فرمایا۔ قرآن ایسا معجزہ ہے کہ اللہ کے سوا دوسرا یہ کلام نہیں کر سکتا۔ تو اس شانِ اعجاز کا کوئی دوسری زبان تحمل نہیں کر سکتی، نہ انگریزی نہ ترکی زبانیں نہ پنجابی، اعجاز اور معجزے کا تحمل اگر کسی زبان نے کیا ہے تو وہ عربی زبان ہے کہ کلمات بہت تھوڑے اور حقائق اس میں بہت زیادہ بھرے ہوئے ہیں، تو زبان کے لحاظ سے خفیف بھی اور لطیف بھی ہے اور معجزے کا تحمل کرنے والی ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے کلام کیا۔ اسی لئے فرمایا گیا کہ: لِسَانُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی"

---

① الصحيح للبخاري، كتاب التوحيد، باب قول الله تعالىٰ ونضع الموازين القسط، ج: ٦، ص: ٩٤٩، رقم: ٧٥٦٣.

اہل برزخ کی زبان...... برزخ کی زبان تو سریانی ہے۔جس میں میّت کلام کرے گا اور ملائکہ علیہم السلام اس سے خطاب کریں گے، وہ زبان تو سریانی ہے، لیکن میدان محشر سے جو زبان شروع ہوگی تو وہ عربی زبان ہوگی۔ پھر جنت کی وہی زبان رہے گی۔ اور ابدالآباد تک وہی زبان رہے گی۔ تو قرآن کی زبان عربی حق تعالیٰ شانہ کا کلام عربی، اہل جنت کی زبان عربی تو یہ عربی زبان کی فضلیت دخفت اور اسکا ہلکا پھلکا ہونا دلیل سے واضح ہوگیا۔

سابقہ کتب کی زبان...... ابتداء میں حق تعالیٰ کی کتابیں عبرانی اور سریانی زبانوں میں نازل ہوئیں تو عبرانی ثقیل زبان ہے، جب اس کو ہلکا پھلکا کیا گیا تو اس کی شکل عربی ہوگئی، ورنہ ابتداً وہ ثقیل تھی، مثلاً توراۃ عبرانی زبان میں اتری ہے، ایک آیت ہے اس سے اندازا کیجئے کہ اس میں زبان کو کتنا اینچنا پڑتا ہے۔حق تعالیٰ شانہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جہاں پیشن گوئی کی تو فرمایا کہ: "نابی بخر بحاما خوخا یا خیم نی یخو خاد جسمهم" اس میں سوائے خا "خ" کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا جب اس کو عربی میں منتقل کیا گیا۔ معنی نہیں بلکہ لفظاً تو یوں ہوگیا نابی سے نبی تو ہوگیا۔ یعنی "خر بحنا یعنی من قربک بخر بخا کی جگہ آگیا: من تربک ماخوخا یعنی من اخیک یا خیم لخا یعنی یقیم لک یخوخا الهک فتسمون."

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیشن گوئی فرمائی گئی کہ نبی آئیں گے تمہارے قریب کے ہوں گے، تم بنی اسرائیل ہو وہ بنی اسماعیل ہوں گے، چچا تائے کے بھائی ہوں گے۔

"نابی بخر بخا یعنی نبی من قوبک ما خوخاً یعنی من اخیک" تمہارے بھائی ہوں گے "یا خیم لخا یعنی یقیم لک" وہ اللہ کی الوھیت کو قائم کریں گے، اور اللہ کی عظمت و بزرگی اور اس کی عبادات کو قائم کریں گے، تو اب کہاں نابی بخو خایا خیم لخا یاخوخا ہے۔ اور کہاں نَبِیٌّ مِّنْ قُرْبِکَ مِنْ اَخِیْکَ یُقِیْمُ لَکَ اِلٰھَکَ.

تو لطافت کا فرق نمایاں معلوم ہوتا ہے کہ ایک میں تو زبان کو ذرا اینچنا پڑتا ہے اور ایک میں زبان ہلکی پھلکی چلتی ہے، چوں کہ زبان خود خفیف تھی اور اس میں یہ کلمات اور بھی زیادہ خفیف اور اخف ہیں تو فرمایا: خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ ان دو کلموں کو ادا کرو تو زبان پر بھاری نہیں ہیں، بہت ہلکے پھلکے ہیں نہ کچھ وقت لگتا ہے نہ کوئی پیچیدگی بلکہ پل بھر میں کلمات ادا ہو جاتے ہیں۔ تو ایک صفت تو یہ بیان کی گئی کہ یہ دو کلمے زبان پر ہلکے ہیں، یہ صفت حسی، یعنی جب آپ سنیں گے تو کان محسوس کریں گے کہ بڑی ہلکی پھلکی چیز ہے۔

وصفِ ثانی وزنِ اعمال اور ان کی کیفیت...... دوسری صفت "ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ" زبان پر ہلکے اور میزان عمل میں وزنی اور بھاری اجر اتنا بڑا ہوگا کہ آدمی بظاہر کتنا ہی پڑھے اتنا اجر نہیں ملے گا جتنا ان دو کلموں کے پڑھنے سے ملے گا تو میزان عمل میں وزنی اور ثقیل ہوں گے۔

وزنِ اعمال کی کیفیت...... وزن دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک جسمانی وزن اور ایک معنوی ہے جسمانی وزن تو

اجسام کا یہ ہے کہ سیر بھر کا وزن کم ہے دو سیر کا زیادہ اور تین سیر کا اس سے زیادہ اور دھڑی بھر کا اس سے زیادہ اور من کا اس سے زیادہ۔ تو ایک تو مادی ہے جو مادیات سے متعلق ہے جتنی مادی چیز ضخیم ہوگی اور بڑی ہوتی جائے گی وزن بڑھتا جائے گا۔ اور ایک معنوی وزن ہے تو ان دو کلمات میں معنوی وزن ہے۔ ترازو میں تو لنے لگو تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن اس کے معنی پر غور کرو تو نہایت باعظمت معنی ہیں جس کا بوجھ پڑتا ہے۔ بوجھ فقط مادی نہیں ہوتا بلکہ روحانی بھی ہوتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ فلاں عالم آئے تو میرے دل پر بوجھ پڑا۔ ان کے آنے سے کیا بوجھ؟

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ پانچ سیر کا وزن رکھا گیا؟ نہیں بلکہ ان کی عظمت کا بوجھ پڑا۔ ان کے اندر جو روحانی قوت تھی اس کی ہیبت پڑی اور میرا دل بیٹھنے لگا اور انکی عظمت کو مان لیا۔ تو حق تعالیٰ کی عظمت جو دلوں میں ہے وہ معنوی عظمت ہے کہ بوجھ ہے اور وہ بوجھ معنوی ہے، حق تعالیٰ مادیات سے بری ہیں۔ اسی طرح ان کا کلام بھی مادیات سے بری ہے۔ روحانی اور لطیف ہے اس کا بوجھ قلوب کے اوپر پڑتا ہے۔ اگر کوئی جاہل کلام کہے تو آپ کے دل میں قطعی احسان نہیں ہوگا کہ بھائی یہ بھی کوئی سننے کی چیز ہے اگر کوئی عالم کلام کرے تو آپ غور کریں گے اور کہیں گے کہ بڑا وزنی کلام ہے دل میں بیٹھتا نہیں، ایک دفعہ اور سنا دو ایک دفعہ اور سنا دو تا کہ دل میں پوری طرح بیٹھ جائے۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جب حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تشریف لائے، تو فرمایا کہ ان کے آنے سے میرے دل پر ان کی عظمت کا بوجھ پڑا، یہ بوجھ مادی وزن نہیں تھا روحانی وزن تھا، جو باعظمت ہوتا ہے اس کے اثر کو روح قبول کرتی ہے، دل قبول کرتے ہیں، کاغذ کے اوپر اگر آپ یہ کلمہ لکھ دیں تو کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ لیکن جب پڑھنے لگیں۔ اور عظمت خداوندی سامنے آئے تو جی لرزنے لگے گا جیسے کسی چیز کو اٹھایا نہیں جا سکتا تو یہ معنوی بوجھ ہوتا ہے، تو یہاں مراد معنوی بوجھ ہے، کہ میزان عمل میں جب اس کلمے کو تولا جائے گا تو میزان عمل اس کی عظمت کے بوجھ سے جھک جائے گی۔

وزنِ روحانی...... جیسا کہ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: قیامت کے دن ایک بندہ حاضر ہوگا اور اس کے ساتھ اس کی بدکاریوں کے انبار ہوں گے۔ ایک دفتر کو پھیلاؤ تو زمین و آسمان جھک جائیں۔ وہ حاضر ہوگا تو حق تعالیٰ شانہ فرمائیں گے۔ کہ اے بندے اپنے اعمال کو تلواؤ۔ وہ عرض کرے گا۔ کہ اللہ میں کاہے کو تلواؤں میرے پاس تو بدیاں ہی بدیاں ہیں۔ تولنے کی ضرورت تو تب ہو جب ایک طرف نیکی ہو اور دوسری طرف بدیاں ہوں۔ یہ تو بدیاں ہی بدیاں ہیں۔ فرمایا کہ نہیں تیری ایک نیکی بھی ہمارے پاس ہے۔ تو ننانوے دفتروں میں ایک پرچی نکلے گی کہ پوری عمر میں ایک مرتبہ ل "آالٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ" کلمہ طیبہ پڑھا ہوگا تو وہ عرض کرے گا کہ اے اللہ ان ننانوے دفتروں کے مقابلہ میں اس پرچی کی کیا حیثیت ہوگی؟ میں تو جہنم کا مستحق ہوں۔ مجھے جہنم میں بھیج دیا جائے، میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ مقام کریم تک پہنچ سکوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ ﴿ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ ہمارے ہاں ظلم نہیں ہے، ذرّے ذرّے کا حساب ہوگا تم تلواؤ اور اپنی نگرانی میں تلواؤ کہیں تو

یوں نہ کہے کہ ملائکہ علیہم السلام نے کوئی زیادتی کردی ہے کم تول دیا یا زیادہ تول دیا۔ وہ ننانوے دفتر ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اس کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾

اللہ کے نام سے زیادہ وزنی نام کون سا ہو سکتا ہے جس کی اندر عظمت کا بوجھ ہو تو اسی کے نام پاک کا یہ کلمہ بھی ہے ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ'' کہ اس کی عظمت سے میزان کا پلڑا جھک جائے گا اگر چہ لاکھوں بدیاں اور برائیاں ہوں مگر اس کی عظمت غالب آجائے گی اور وہ جھک جائے گا، تو مطلب یہ کہ ایک وزن مادی ہوتا ہے اور ایک وزن روحانی اور علمی ہوتا ہے۔ یہاں روحانی اور علمی وزن مراد ہے۔

درود شریف کی برکت...... نیز حدیث میں جیسے فرمایا گیا کہ اس امت کے ایک فرد کو جہنم کا حکم دے دیا جائے گا اور ملائکہ علیہم السلام اس کو جہنم کی طرف لے جارہے ہوں گے اور وہ حیرانی سے ادھر ادھر دیکھتا ہوگا کہ کوئی مددگار ہے یا نہیں؟ تو حضرت آدم علیہ السلام کی نگاہ اس پر پڑے گی تو حضرت آدم علیہ السلام پکاریں گے کہ یَا اَحْمَدُ! یَا اَحْمَدُ! آپ عرض کریں گے: لَبَّیْکَ یَا اَبَا الْبَشَرِ حاضر ہوں۔ تو وہ فرمائیں گے آپ کی امت کا ایک آدمی ہے۔ جسے جہنم کی طرف لے جایا جارہا ہے تو آپ ملائکہ کا پیچھا کریں گے اور ان سے فرمائیں گے رک جاؤ، وہ کہیں گے ہمارا نام زبانیہ ہے ہم جہنم کے ملائکہ ہیں اور ہم امر خداوندی کے مامور ہیں ہم آپ کا حکم نہیں مان سکتے، امر خداوندی آچکا ہے، تو آپ بہت ہی تاسف سے اپنی ریش مبارک پر ہاتھ پھیریں گے، اور جاکر عرش کے نیچے سجدہ کریں گے اور عرض کریں گے کہ:

اے اللہ! میرا ایک امتی ہے، بے شک گنہگار ہے مگر آپ کی رحمت وسیع ہے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم آپ کو رسوا نہیں کریں اور ادھر سے آواز دی جائے گی: لَا تَعْجَلُوْا جلدی مت کرو، ملائکہ رک جائیں گے، آپ تشریف لائیں گے اور اپنی جیب میں سے ایک پرچہ نکالیں گے جیسے اس وقت کی جیب ہوگی، جیسا لباس ہوگا، خدا بہتر جانتا ہے پرچہ نکالیں گے، اور بِسْمِ اللّٰهِ کہہ کر آپ اس کو میزان عمل میں ڈالیں گے، ایک دم نیکیوں کا پلڑا جھک جائے گا اور اس کی نجات ہو جائے گی۔ وہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہچانتا نہیں ہوگا تو آکر عرض کرے گا اے نیک نہاد! آپ کون ہیں جو اس آڑے وقت میں میری امداد کی اور مجھے جہنم سے بچایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے: اَنَا اَحْمَدُ میں تیرا نبی ہوں میرا نام احمد ہے تو وہ جھک جائے گا اور کہے گا، سبحان اللہ یہ آپ نے آکے کیا کیا۔ میرا تو پلڑا ہلکا پڑ گیا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ تو نے ایک دفعہ نہایت ہی کمال اخلاص کے ساتھ درود بھیجا تھا وہ درود کی پرچی میرے پاس جیب میں محفوظ تھی۔ وہ اتنے اخلاص سے بھرا ہوا تھا کہ جب میں نے وہ پلڑے میں ڈالی تو اس اخلاص کی برکت سے وہ ساری بدیاں ہلکی پڑ گئیں۔

ظاہر بات ہے کہ درود شریف کو اگر پرچی پر لکھ کر جیب میں ڈال لیں تو کوئی وزن محسوس نہیں ہوگا لیکن روح اس کے وزن کو محسوس کرے گی۔ اس میں جو اخلاص کا وزن ہے وہ روح محسوس کرے گی تو حق تعالیٰ شانہ قیامت

کے دن اعمال کے ڈھانچوں کو نہیں دیکھیں گے بلکہ یہ دیکھیں گے کہ ان کے اندر اخلاص کتنا ہے سچائی کتنی ہے محبت خداوندی کتنی ہے درحقیقت اس کا وزن ہوگا حدیث میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ یہ دو کلمے زبان پر ہلکے اور میزانِ عمل میں اپنی معنوّیت کی وجہ سے بھاری ہیں تو یہ دوسرا وصف ہوا یہ وصف حسّی نہیں ہے بلکہ وصف روحانی ہے اس کو ارواح وقلوب محسوس کریں گے۔

تیسرا وصف...... تیسرا وصف ذکر کیا کہ: ''حَبِیْبَتَانِ اِلَی الرَّحْمٰنِ'' یہ دونوں کلمے وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہیں ظاہر بات ہے کہ جب کسی کے پاس اس کی پسندیدہ چیز ہدیے میں لے جائیں گے تو توجہ بہت ہوگی۔ فطرت کا تقاضہ ہے کہ کوئی ایسا ہدیہ لے جائیں جس سے اگلا کراہت محسوس کرے تو پسند نہیں کرے گا قبول نہیں کرے گا کوئی ایسی چیز لے جائیں جو مرغوب ہے تو شکریہ بھی ادا کرے گا اور خوش بھی ہوگا، تو یہ کلمات حق تعالیٰ شانہ کو محبوب ہیں، محبوب چیز کا جب ہدیہ پیش ہوگا تو عنایات متوجہ ہو جائیں گی۔ محبوب کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کلمات میں الوہیت کے مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔

مقامِ الوہیّت...... مقاماتِ الوہیّت چار ہیں جو خصوصیات خداوندی ہیں اور ظاہر بات ہے کہ اس میں شرک کی گنجائش نہیں ہے۔

پہلا مقام...... سب سے پہلی چیز تنزیہہ ہے، تنزیہہ کے معنی ہیں۔ اللہ کی پاکی بیان کرنا ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے پاک ہر نقص سے بری وبالا۔ کوئی ادنیٰ درجے کے نقص کا شائبہ یا عیب کا شائبہ ممکن نہیں۔ تصور میں بھی نہیں آسکتا تو سب سے پہلی چیز حق تعالیٰ کی تنزیہہ اور اس کی پاکی کہ وہ تمام عیوب سے پاک ہے، اللہ ہر عیب سے ہر ذم سے یعنی برائی اور کوتاہی سے پاک ہے تو تسبیح کے معنی درحقیقت تنزیہہ کے ہیں کہ وہ ہر برائی سے منزہ ہے اور سب چیزوں سے بالا ہے جس کو قرآن حکیم میں مختلف عنوانات میں بیان فرمایا گیا ہے۔ کہیں فرمایا گیا: ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ﴾ ① نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے اس لئے کہ یہ تھکن کی علامت ہے اور تھکن ضعف کی علامت ہے اور وہ قوی ہے اس کا ضعف سے کیا کام کہیں فرمایا: ﴿لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسٰى﴾ ②

میرا پروردگار نہ بہکتا ہے اور نہ بھولتا ہے بھول اور بہک ضعف کے سبب سے ہوتی ہے اور حافظہ قوی نہ ہو۔ اور وہ تو قوی ہے وہاں بھول چوک کا کیا کام؟ تو یہ آیتیں تنزیہہ کے لئے ہیں۔ ﴿لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسٰى﴾ ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ﴾ نہ وہاں نیند ہے نہ وہاں اونگھ ہے اور نہ وہاں معاذ اللہ بہکنا ہے اور نہ وہاں نسیان ہے۔ ہر چیز سے وہ بری و بالا ہے اس کا علم قطعی اور محیط ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں تو ساری چیزیں ''سبحان'' کے نیچے آتی ہیں کہ اللہ نوم سے، اونگھنے سے، بہکنے سے اور بے راہ چلنے سے بھی پاک ہے تو سبحان کا کلمہ تنزیہہ کے لئے رکھا گیا ہے اور جگہ جگہ قرآن کریم نے اس کی طرف دعوت دی ہے، کہیں فرمایا: ﴿فَسُبْحَانَ

① پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۵۔ ② پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۲۔

اللهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ﴾ " اللہ پاک ہے تم صبح کرو یا شام کرو"یعنی صبح وشام تغیر کی علامت اور تغیر ضعف کی علامت ہے اور وہ ان سب سے بری ہے سارے تغیرات تمہارے اندر ہیں۔ ﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى﴾ ① "پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے مختصر حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی اور مسجد اقصیٰ سے سمٰوٰت کی طرف رجوع فرمایا"۔ کہیں فرمایا: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ ② "اپنے رب کی پاکی بیان کرو" اور کہیں فرمایا: ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ﴾ ③ ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ﴾ ④

تو جگہ جگہ قرآن کریم نے تسبیح کا لفظ استعمال کیا ہے، جہاں تنزیہہ بیان کرنی مقصود ہے کہ وہ ہر کوتاہی، ہر عیب، ہر شی سے منزہ ہے تو حق تعالیٰ شانہ، کی ذات کا پہلا مقام تنزیہہ ہے کہ وہ ہر عیب سے بری و بالا ہے۔

دوسرا مقام...... اس کے بعد دوسرا مقام اس کی عظمت شان کا ہے کہ اس کی شان سب سے بڑی اور نرالی ہے اور لامحدود عظمتوں کا وہ مالک ہے اس کے لئے شریعت نے حمد کا کلمہ رکھا ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ⑤

حمد کے معنی یہ ہیں کہ ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں اور تعریف کبھی برائی پر تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ کمال پر ہوتی ہے تو جب ساری تعریفیں اسی کے لئے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سارے کمالات اسی کے لئے ہیں وہ سارے کمالات کا مصدر ہے۔ ہر خیر اور ہر برکت اس کی طرف سے ہے، ہر کمال اس کا۔ ہر علم اس کا ہے، ہر خوبی اس کی ہے وہ تمام کمالات کا سرچشمہ ہے۔ تو کمالات کا سرچشمہ ہونے سے ظاہر کیا ہے کہ ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں اور جب ساری تعریفیں اسی کے لیے ہیں تو سارے کمالات بھی اس کے لئے ہیں اس لئے کہ حمد کسی جمیل اختیاری پر ہوتی ہے کہ کوئی عمل اور کام ارادی اور اختیاری اتنا اعلیٰ ہو کہ جی چاہتا ہو کہ اس (کے صانع) کی تعریف اور حمد کریں۔ تو اس حمد کے ظاہر کرنے کے لئے شریعت اسلامیہ نے حمد کا کلمہ رکھا ہے۔ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ ⑥ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ﴾ ⑦ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ﴾ ⑧

تو جگہ جگہ حمد کا کلمہ استعمال کیا ہے۔ بعض سورتیں کلمہ حمد سے شروع ہوتی ہیں تو عرض تنزیہہ ہے کہ پاکی بیان کی جائے اس کے لئے سبحان کا کلمہ ہے اور تحمید ہے، یہ الوہیت کا دوسرا مقام ہے۔

① پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۱۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ الاعلی، الآیۃ: ۱۔
③ پارہ: ۳۰، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۱۔ ④ پارہ: ۳۰، سورۃ الصف، الآیۃ: ۱۔
⑤ سورۃ الفاتحۃ، الآیۃ: ۱۔ ⑥ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۱۔
⑦ پارہ: ۵، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۔ ⑧ پارہ: ۲۲، سورۃ السباء، الآیۃ: ۱۔

تیسرا مقام......اور ظاہر بات ہے کہ جو ذات ایسی ہو۔ ہر عیب سے پاک اور کمال کا سرچشمہ ہو تو عظمت اور بڑائی اس کے سوا کس کی ہوسکتی ہے؟ ساری برکتیں اس کی ساری عظمتیں اس کی اسی لئے فرمایا گیا: ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ساری بڑائیاں اس کے لئے ہیں اس کو ظاہر کرنے کے لئے اسلام میں تکبیر کا حکم ہے وہ اکبر ہے یعنی ہر چیز سے بالا ﴿ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالُ ﴾

وہی بڑا، وہی عالی اور بلند ہے اس کیلئے تکبیر کا حکم ہے اَللّٰہُ اَکْبَر یعنی اللہ ہر چیز سے بڑا ہے۔ ہر بڑائی اس کے سامنے حقیر ہے ہر عظمت اس کی عظمت کے سامنے چھوٹی ہے۔ اب کوئی انڈے کے سامنے چراغ جلا دے تو چراغ کی کیا حقیقت ہوگی؟ اور سورج کے سامنے انڈا جلا دے تو انڈے کی کیا حقیقت ہوگی؟ اس کا سارا نور سورج کے نور میں گم ہو کر رہ جائے گا، سورج کے سامنے چراغ جلا دے تو چراغ کی کیا حقیقت ہوگی؟ تو انوار ربانی کے سامنے کوئی نور نہیں چلتا سب مدہم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انوار ربانی کے سامنے کوئی ہستی باقی نہیں رہتی۔ تو کبیر کے معنی یہ ہیں کہ بلندی، برتری اور بالائی سب اسی کے واسطے ہیں جس کو ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ سے تعبیر کیا کہ آسمانوں اور زمینوں میں اسی کے واسطے بڑائی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''اَلْكِبْرِيَآءُ رِدَآئِيْ وَالْعَظَمَةُ اِزَارِيْ فَمَنْ نَّازَعَنِيْ فِيْهِمَاقَصَمْتُهٗ.'' تکبر اور بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری لنگی ہے۔ جو اس میں کھینچا تانی کرے گا تو میں یقیناً اس کی گردن توڑ دوں گا اور اسے نیچے دکھاؤں گا۔ اس لئے جو بھی کسی مجلس میں بڑا بول بولتا ہے تو یقیناً اسی مجلس میں اس کی حقارت کرنے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ ہر گناہ کے لئے کچھ نہ کچھ سہائی (معافی) ہے۔ لیکن کبر اور نخوت جب ہوگی تو ہاتھ کے ہاتھ اس کو جواب ملے گا۔ اس کی مغفرت نہیں یہ قابل برداشت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ گناہ بندے کا اپنا فعل ہے، اور اپنی صفت ہے اور کبریائی و بڑائی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جو اس کی بڑائی میں حصہ دار بننا چاہے گا وہ باقی نہیں رہ سکتا اس کو نیچا دکھایا جائے گا۔ ذلیل و رسوا کیا جائے گا تو عظمت و کبریائی تیسرا وصف ہے۔

چوتھا مقام......حق تعالیٰ کی تمجید یعنی اس کی عظمت اس کی بزرگی اور اس کی بڑائی کے لئے تکبیر کا کلمہ رکھا گیا ہے کہ: ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ'' اللہ ہر چیز سے بڑا ہے، اب ظاہر بات کہ جو ہر عیب سے پاک ہے، اور خوبی کا سرچشمہ ہو، بڑائی بھی اسی کے لیے ہو تو اس کے علاوہ یکتائی کے لائق اور کون ہوسکتا ہے۔ اس سے توحید پیدا ہوتی ہے، اس کے لئے تہلیل کا حکم رکھا گیا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کے آگے جھکیں گے، اسی کے آگے فریاد کریں گے اسی سے مدد مانگیں گے اور اسی کی طرف رجوع کریں گے وہی دافع امراض ہے ہر عبادت اسی کے لئے ہوگی۔ تو یہ دعویٰ توحید چوتھا مقام ہے۔

دعویٰ توحید کی تکمیل......اس سے اتنی بات واضح ہوگئی کہ توحید کا دعویٰ کبھی مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ یہ تین مقام سامنے نہ ہوں تنزیہہ مکمل ہو کہ ہر عیب سے پاک ہو تنویہہ ہو کہ ہر خوبی کا مالک ہو، تکبیر مکمل ہو کہ ہر عظمت اس

کی ہو، جب یہ تین چیزیں ثابت ہوں گی تب توحید کا وجود ہوگا۔ اگر کوئی اللہ کی تنزیہہ نہ کرے اس میں مخلوق کی صفات مان لے یا مخلوق میں خالق کی صفات مان لے تو وہ کبھی بھی توحید کا دعویٰ نہیں کر سکتا اگر دعویٰ کرے گا تو جھوٹا دعویٰ ہوگا توحید کا پہلا قدم تنزیہہ کہ ہر عیب سے اس کی پاکی بیان کرو ۔ ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ ①

نہ وہ کسی سے جنا گیا اور نہ اس کی کوئی اصل ہے، وہ خود اصل ہے نہ وہ کسی کو جنے گا کہ اس کا کوئی بیٹا ہو یا کوئی اس کی بیوی ہو یا کوئی کفو اور برابر ہو۔ تو ان سب چیزوں سے آدمی پاکی بیان کرے گا، تب توحید کے مقام پر پہنچے گا۔ اللہ کے باپ ہونے کا قائل ہو جائے، اللہ کے لیے بیوی ہونے کا قائل ہو جائے، اس کے لئے کسی برابری کا قائل ہو جائے، اس کیلئے کسی شریک ہونے کا قائل ہو جائے۔ وہ کبھی توحید کا مدعی نہیں بن سکتا اگر دعویٰ کرے گا تو جھوٹا ہوگا، اس لئے کہ توحید کا پہلا قدم تنزیہہ ہے۔ تو چاہے نصاریٰ توحید کا دعویٰ کریں، چاہے مشرکین کریں مگر وہ زبانی دعویٰ ہے حقیقت اس میں کچھ نہیں، کیوں کہ ان کے پاس تنزیہہ نہیں اس طرح سے تنویہ یعنی ساری عظمتیں اور بڑائیاں اس کی ذرہ برابر اس میں نقص نہیں، اگر حق تعالیٰ کی ذات میں ادنیٰ درجے کا نقص مان لے گا تو وہ تنویہ کے خلاف ہوگا اور توحید کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔

جیسے یہود نے بندوں کی ناقص صفات اللہ میں تسلیم کیں اور کہا کہ جب طوفان نوح آیا تو حق تعالیٰ بیٹھ کر رونے لگے۔ ہائے میری مخلوق ڈوب رہی ہے تو معاذ اللہ اس کی اتنی قدرت نہیں تھی کہ بچالے تو رونے بیٹھ گئے۔ اتنے روئے کے آنکھیں دکھنے آ گئیں اور فرشتے مزاج پرسی کو پہنچ گئے کہ حضرت اب آپ کی آنکھیں کیسی ہیں؟ تو معاذ اللہ معاذ اللہ یہود نے خالق کے اندر مخلوق کی ناقص صفات مان لیں اور نصاریٰ نے خالق کی مخصوص صفات مخلوق میں مان لیں، حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں تین معبودوں میں سے ایک ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام علم غیب کلی رکھتے ہیں۔ کہ سب سے پہلا دعویٰ نصاریٰ کا ہے کہ وہ محیط الکل ہیں، مقتدر اعلیٰ پیدا کرتے ہیں، چاہے موت دے دیں یا زندگی جو الوہیّت کی خصوصیات تھیں وہ بندے میں مان لیں جو بندے میں مانی نہیں جاسکتی تھیں اور یہود نے جو بندوں کی ناقص صفات تھیں وہ خدا میں مان لیں۔ تو انہوں نے جو حدود تھیں توڑ دیں۔ خالق اور مخلوق کا فرق اٹھا دیا تو جب اللہ کی تنزیہہ باقی نہ رہے تو بھی توحید کو آدمی نہیں پا سکتا۔

خصوصیّت الوہیّت ...... اس کے بعد تیسری چیز تکبیر ہے کہ ساری عظمتیں اس کی ہیں، جس میں بھی عظمت ہے تو وہ اس کی عظمت کا جلوہ اور پرتو ہے، فی ذاتہ کسی میں عظمت نہیں ہے بذاتہ عظمت صرف ذات حق میں ہے وہ کسی کو عظمت عطا کر دیں تو وہ عظمت والا بن جائے گا، عظمت چھین لیں تو وہ بے عظمت بن جائے گا، کسی کو حکومت دے دیں تو وہ حاکم کہلائے گا، حکومت چھین لیں تو حاکم باقی نہیں رہے گا۔ کسی کو ملک دے دیں تو وہ ملک کہلائے گا۔ کسی سے چھین لیں تو وہ ملک باقی نہیں رہے گا۔

① پارہ: ۳۰ سورۃ الاخلاص، الآیۃ: ۳۔

لیکن اللہ کا ملک ہونا ازل سے لے کر ابد تک ہے۔اس کی کسی کی دی ہوئی حکومت نہیں وہ بالذات ملک ہے، اس کی ملکیت بالذات ہے، یہ نہیں ہے کہ اس کی ملکیت کو اس سے کوئی چھین لے، ہر ایک ملکیّت چھن سکتی ہے ہر ایک کا ملک جا سکتا ہے ہر ایک کا اقتدار جا سکتا ہے وہ عارضی ہوتا ہے آتا بھی ہے جاتا بھی ہے۔لیکن ازل سے لے کر ابد تک جس کی قدرت محیط، جس کا اقتدار محیط، جس کا ملک محیط جس کی مِلک محیط۔وہ صرف حق سبحانہ وتعالیٰ ہیں، اس لئے عظمتوں کی مالک صرف اللہ کی ذات ہے، اسی لئے نمازوں میں سبحان ربی العظیم پڑھتے ہیں، تاکہ عظمت نمایاں ہو، یہ چار مقام ہوئے، یہ مقام توحید کا انتہائی درجہ ہے، ابتدائی درجہ تنزیہہ کا ہے، پھر تنویہ کا پھر تکبیر کا پھر جا کر توحید کا مقام آتا ہے، ان تینوں کو پھلانگ کر کوئی توحید تک نہیں پہنچ سکتا اور اگر دعویٰ کرے گا تو جھوٹا دعویٰ کرے گا۔

حدیثِ متعلقہ......حدیث مذکورہ میں یہ چاروں مقام بیان فرمائے گئے ہیں، ”سُبْحَانَ اللّٰہِ“ میں تنزیہہ آ گئی کہ ہر کمال کا وہ مالک ہے، ہر عظمت کا مالک وہ ہے، اس کے لیے حمد ہے، اور ”سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ“ کے اندر عظمت آ گئی کہ ساری بڑائیاں اس کے لئے ہیں، جب ساری بڑائیاں اس کے لیے ہیں تو سارے کمالات اس کے لئے ہیں، اس لئے وہ سارے عیبوں سے بری اور بالا ہے تو التزامی طور پر یکتا وہی ہوگا۔ ”لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ“ بھی اس سے نکل آیا۔ اور ایک حدیث میں تو ان چاروں باتوں کو عبارۃً بیان کیا گیا ہے جیسے فرمایا گیا کہ:” اَحَبُّ الْکَلِمَاتِ اِلَی اللّٰہِ اَرْبَعٌ“ سب سے زیادہ محبوب اللہ تعالیٰ کو چار کلمے ہیں:”سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ“ ان چاروں کلموں کو محبوب کہا گیا ہے۔تو یہاں عبارت کے اندر چاروں کلمے موجود ہیں۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ بھی، اَللّٰہُ اَکْبَرُ بھی اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ بھی۔تو اس کلمہ (یعنی حدیث مذکورہ فی الباب) میں تین عبارۃً موجود ہیں اور ایک اقتضاء ہے کہ عبارت از خود اس کا تقاضا کرتی ہے، اور وہ اس طرح کہ سبحان اللہ میں تو تسبیح آ گئی اور وبحمدہ میں حمد آ گئی۔العظیم میں عظمت آ گئی اور ان تینوں کے مجموعے سے لازم آ گیا کہ ایک ایسی ذات جو یکتا ہے تو اس سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ نکل آیا۔تو وہاں عبارت میں چاروں مقامات موجود ہیں اور یہاں تین تو عبارت النص میں موجود ہیں اور ایک اقتضاء النص سے نکلتا ہے، یہ چاروں کلمے اللہ کو محبوب ہیں۔

محبوب کیوں ہیں؟ اس لئے کہ یہ کلمات اس کے مقام کے ترجمان ہیں، اور فطرت ہے کہ جس میں کسی کی واقعیت بیان کی جائے تو وہ اس کو پسند ہوگی، آپ کسی کی بیٹھ کی تعریف کریں تو بڑے غور سے سنے گا اور بہت خوش ہوگا اور اگر برائی کریں تو رنجیدہ ہوگا، بھلائیاں بیان کریں خوش ہوگا، کیوں خوش ہوگا؟ اس لئے کہ وہ بھلائیاں اس کے اندر موجود ہیں، تو وہ خوش ہوگا کہ اس کے سنانے والے موجود ہیں۔اس کو بیان کرنے والے موجود ہیں۔تو فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کسی کی خوبی بیان کی جائے تو وہ خوبی والا فطرۃً خوش ہوتا رہے گا، اس کے لئے دلیل کی حاجت نہیں حق تعالیٰ کی خصوصیات جب کوئی بندہ بیان کرے گا، تو فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں وہ پسند ہوں گی۔وہ چیزیں ان کے سامنے محبوب بنیں گی یہ الوہیّت کی خصوصیات تھیں، اس لئے جب بندہ انہیں ادا کرے گا تو یہ کلمے

بھی محبوب بنیں گے اور ادا کرنے والا بھی محبوب بنے گا۔

حدیث میں مذکور اوصافِ ثلثہ اور صفتِ علم کی فوقیت.....تو اس سے میں نے عرض کیا کہ تین اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں۔ ایک حسّی وصف ہے ایک معنوی وصف ہے اور ایک غیبی وصف ہے حسّی وصف تو یہ ہے کہ زبان پر ہلکے پھلکے ہیں ہر ایک محسوس کرے گا۔ معنوی وصف یہ ہے کہ میزان عمل میں وزنی اور ان کی عظمت کا بوجھ پڑتا ہے اور غیبی وصف یہ ہے کہ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صنعت قابل داد ہے کہ سب سے پہلے وحی کا ذکر کیا کہ وہ پسندیدہ چیز ہے چوں کہ وحی کی حقیقتِ علم ہے اور علم سب سے بڑی صفت ہے تمام صفات سے، اس لئے کہ جتنی بھی صفات ہیں وہ اپنی کار گزاری میں علم کی محتاج ہیں لیکن علم اپنے کام کرنے میں کسی صفت کا محتاج نہیں بلکہ غنی ہے۔ سب سے اول ارادہ ہے ارادہ آپ جب کریں گے جب مراد کا علم ہو جائے گا۔ اگر مراد ہی معلوم نہیں تو آپ کس کا ارادہ کریں گے اسی طرح قدرت ہے۔ قدرت جب آپ استعمال کریں گے جب اس مقدور کا علم تو ہو کہ مجھے قدرت کا ہے میں صرف کرنی ہے اگر اس مقدور کا علم ہی نہ ہو تو آپ قدرت کا بے جا صرف کریں گے۔ تو قدرت اپنے کام کرنے میں علم کی محتاج ہوتی ہے۔ ارادہ اپنے کام لانے میں علم کا محتاج ہے۔ اسی طرح اقتدار ہے۔ یہ اس کا محتاج ہے کہ وہ مقتدر چیزیں جن پر آپ کو اقتدار حاصل ہوگا۔ پہلے سے معلوم ہوں ایک ملک پر آپ اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس ملک کا علم تو ہو کہ وہ کہاں ہے تاکہ میں جا کر اس پر اقتدار کو قائم کر سکوں تو اقتدار نہیں آ سکتا جب تک مقتدر کا علم نہ ہو تو ارادہ بھی علم کا محتاج قدرت بھی علم کی محتاج اور اقتدار بھی علم کا محتاج۔ اسی طرح آپ کسی چیز کی حفاظت کریں تو پہلے اس شئی کا علم تو ہو جس کی آپ حفاظت کر رہے ہیں اور اگر شئی معلوم نہ ہو تو آپ حفاظت کس کی کریں گے تو حفیظ کی صفت کام نہیں کرے گی جب تک کہ پہلے علیم کی صفت نہ ہو تو ہر صفت اپنے کام میں علم کی محتاج ہے لیکن علم نہ ارادے کا محتاج ہے نہ قدرت کا محتاج نہ اقتدار کا محتاج۔

آپ ریل میں جا رہے ہیں تالاب آ گیا، آپ ارادہ کریں یا نہ کریں آپ کو علم ہو جائے گا کہ یہ تالاب ہے یہ نہیں کہ آپ ارادہ کریں تو یہ معلوم ہو کہ یہ تالاب ہے اور اگر ارادہ نہ کریں تو کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ تو ارادہ کی احتیاج نہیں جب شی سامنے آ جائے گی تو آپ کو علم ہو جائے گا۔ آپ نے شہر دیکھ لیا علم ہو گیا کہ یہ شہر ہے۔ علم اس کا محتاج نہیں ہے کہ پہلے آپ شہر پر اقتدار حاصل کر لیں اور پھر معلوم ہو (کہ شہر ہے) تو آپ کو اس پر اقتدار حاصل ہو نہ ہو۔ جب شہر سامنے آئے گا تو آپ کو علم ہو جائے گا کہ یہ فلاں شہر ہے۔ تو علم نہ ارادے کا محتاج ہے نہ قدرت کا محتاج نہ اقتدار کا محتاج ورنہ ساری صفات علم کی محتاج ہیں تو علم اُم الصفات ہے سب سے اونچی صفت ہے اور ظاہر بات ہے۔ کہ جب علم سب سے زیادہ اونچی صفت ہے اور تمام صفات اس کی محتاج ہیں تو وحی بھی حقیقتِ علم ہی تو ہے۔ حق تعالیٰ اپنے پیغمبروں پر وحی فرمائیں اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہی ہے کہ اپنا علم القاء کر دیا۔ تو وحی کے دوسرے معنی

علم خداوندی کے ہیں تو وحی بھی محبوب چیز ہوئی کیوں کہ علم انسان کو محبوب ہے تو محبوب چیز سے اپنی کتاب کی ابتداء کی۔یعنی بدءالوحی سے اور محبوب ہی چیز پر کتاب کو ختم کیا''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ''

''اب ظاہر بات ہے کہ جو کتاب محبوبات سے شروع ہو اور محبوبات پر ختم ہو تو بیچ کی ساری باتیں محبوبات میں داخل ہو جائیں گی''۔''اول باآخر نسبت دارد'' ہر اوّل کو اپنے آخر سے نسبت ہوتی ہے اور بیچ کی چیزیں اوّل یا آخر کے تابع ہوتی ہیں۔کتاب کی ابتداء بھی محبوب چیز سے ہوئی وہ علم خداوندی ہے اور کتاب کی انتہا بھی ایک ایسے عمل سے ہوئی کہ وہ عمل محبوب خداوندی ہے یعنی ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ'' پڑھنا یہ عمل محبوب ہے،تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صنعت بھی واقعی نرالی اور انوکھی ہے جہاں ان کا دل اور قلب پہنچا دوسرے نہیں پہنچ سکے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی جلالت شان اور ان کا کمال وہ اسی کا مقتضی تھا کہ کتاب بھی اتنے ہی کمالات سے بھری ہوئی ہو۔

صحتِ بخاری......تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ روایت کرنے میں یکتا ہیں کہ صحیح بخاری کے اندر جو حدیثیں ہیں وہ ان کی شرائط پر منطبق ہیں وہ نہایت ہی اونچی حدیثیں ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صحیح حدیث کسی اور کتاب میں نہیں ہے مسلم میں بھی صحیح حدیثیں ہیں ترمذی میں بھی صحیح حدیثیں ہیں۔نسائی میں بھی صحیح حدیثیں ہیں۔جو صحیح حدیثیں اور کتابوں میں بھی ہیں مگر جن شرائط اور محتاط طریقے سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ قبول کرتے ہیں ان سب سے نیچے ہیں۔ان کی نہایت پکی شرطیں ہوتی ہیں۔ان میں کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں ہوتی۔تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی کڑی شرطیں راویت میں لگائی ہیں کہ وہ اور صحیحوں سے بڑھ کر روایت میں صحیح ہیں جن کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کر دیا۔اسی لئے امت کا اس پر اجماع ہے: ''اَصَحُّ الْكُتُبِ بَعْدَ كِتَابِ اللهِ'' کہ اللہ کی کتاب کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب بخاری ہے۔کتاب اللہ کے بعد اس کا درجہ رکھا گیا۔اول تو طبعًا بھی بعد میں اس کا مرتبہ ہونا چاہئے اس لئے کہ کتاب اللہ میں تو اللہ کا علم ہے۔کتاب اللہ کہتے ہیں جس میں حق تعالیٰ کا علم ہو،اور یہ صحیح بخاری درحقیقت کتاب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ظاہر بات ہے کہ رسول کا درجہ تو اللہ کے بعد ہی ہے اس لئے رسول کی کتاب کا درجہ بھی اللہ کی کتاب کے بعد ہوا۔تو اعلیٰ ترین صحت کتاب اللہ کی ہے کہ اس عالم میں کسی آسمانی کتاب کو وہ صحت نصیب نہیں ہوئی وہ فصیحت اور سندیت نصیب نہیں ہوئی، جو کتاب مبین کو ہوئی۔بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کلام اللہ درحقیت صرف یہی ہے۔

سابقہ کتب سماوی کی حیثیت......توراۃ حقیقی معنی میں کلام اللہ نہیں ہے انجیل بھی حقیقی معنی کے لحاظ سے کلام اللہ نہیں اس لئے کہ کلام کہتے ہیں مایتکلم بہ جس کو بولنے والا بولے وہ کلام کہلاتا ہے لکھ کر دے دے اس کو مجازاً کلام کہہ دیں گے اس کو خط تو کہیں گے لیکن کلام نہیں کہیں گے یوں مجازاً آپ کلام کہہ دیں گے۔

آپ نے کوئی مضمون اپنے دل کی حکمت سے دوسرے کے دل میں ڈال دیا تو اسے کلام نہیں کہیں گے۔اس لئے کہ آپ نے زبان سے تو وہ کلام نہیں کہا۔تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توراۃ دی گئی مگر پڑھ کر حق تعالیٰ نے نہیں

سنائی توراۃ کو الواح کے اوپر لکھ کر حوالے کر دیا تو توراۃ کتابِ خداوندی ہے کلامِ خداوندی نہیں ہے مجازی طور پر اس کو کلامِ خداوندی کہیں تو کہہ سکتے ہیں حقیقی معنی میں کلام نہیں ہے اسی طرح کتاب انجیل ہے۔

وہ حق تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر مضمون القا فرمایا۔ انہوں نے اپنے الفاظ میں اس کو ادا کیا جیسے حدیث ہے کہ یہ وحی ہے مضمون حق تعالیٰ کا ہے اور الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں، اس میں وحی متلو وہ ہے جو قرآن ہے اور وحی غیر متلو یہ حدیث رسول ہے، وہاں الفاظ بھی اللہ کے ہیں اور مضمون بھی، انجیل میں مضمون تو حق تعالیٰ کا ہے لیکن اس میں الفاظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہیں۔ اس لئے انجیل کو مضمون خداوندی کہا جائے گا کلام خداوندی نہیں کہیں گے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے تکلم نہیں کیا۔ مجازاً آپ کہہ دیں کہ یہ بھی کلام خداوندی ہے۔ لیکن قرآن حکیم حقیقی معنی میں کلام خداوندی ہے، حق تعالیٰ نے پڑھ کر سنایا بھی ہے تو مَا یَتَکَلَّمُ بھی ہے یعنی کلام بھی اللہ نے کیا اور مضمون تو اس کا ہے ہی اور لوح محفوظ میں لکھا بھی ہے تو یہ کتاب خداوندی بھی ہے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سامنے پڑھا بھی ہے اس لئے یہ کلام خداوندی بھی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں تذکرہ فرمایا گیا ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام پر وحی نازل ہوتی تھی تو اس کی عظمت سے تمام ملائکہ بے ہوش ہو جاتے تھے اور جب ہوش میں آتے تو پوچھتے: ﴿ مَاذَا قَالَ رَبُّنَا قَالَ الْحَقُّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴾ ہمارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام فرماتے کہ حق فرمایا ہے۔ اور وہ علی کبیر ہے۔ تو حق تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو پورا قرآن سنایا ہے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پورا قرآن لا کر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔

صرف قرآن ہی کلام خداوندی ہے...... تو قرآن کریم کتاب خداوندی بھی ہے کہ سب سے پہلے اس کو لوحِ محفوظ میں لکھا گیا اور اس کے بعد حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا کہ وہ حروف ذرا خفی تھے اور لوحِ محفوظ کے حروف جلی تھے بعض احادیث میں ہے کہ ایک ایک حرف کوہ قاف کے برابر تھا جیسا لکھنے والا، ویسا اس کا قلم، ویسے اس کے حروف ویسے ہی اس کی لوح۔ لکھنے والا لامحدود عظمت والا ہے اس کے کلامِ کی کتابت بھی ایسی ہوگی اور حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر چھوٹے حروف میں لکھا گیا۔

یہاں سے حمائل کا ماخذ نکل آیا مسلمان بڑی تختی میں بھی قرآن کریم لکھتے اور چھوٹی حمائل شریف بھی گلے میں ڈالتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے حمائل بھی لکھ دی اور لوحِ محفوظ پر جلی حروف میں بھی لکھا۔ اس کا ماخذ بھی موجود ہے، بہر حال یہ کتابِ خداوندی بھی ہے جس کو قرآن کہتے ہیں اور کلامِ خداوندی ہے جس کا باری تعالیٰ نے اولاً تکلم کیا پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضور علیہ الصلوۃ السلام کے سامنے تکلم کیا، احادیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر رمضان میں حضور علیہ السلام کے ساتھ دور کرتے تھے اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام پڑھتے، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام پڑھتے، وفات کا جو سال ہے جو آپ کا آخری رمضان تھا اس میں دو مرتبہ دور فرمایا تو تکلم واقع ہوا۔ نبی کی زبان سے بھی یہ کلام ادا ہوا اور فرشتے کی زبان سے بھی یہ تکلم ہوا اور حق تعالیٰ کی طرف سے بھی یہ تکلم

ہوا۔ تو کلام حقیقی صرف کلامِ خداوندی یہی قرآن ہے، دوسری چیزوں کا کلام مجازاً کہہ دیں گے حقیقتاً وہ یا کتابِ خداوندی ہے یا مضمونِ خداوندی ہے لیکن کلام اسی کو کہیں گے جس کے ساتھ تکلم واقع ہوا۔

قرآن وحدیث میں ما بہ الامتیاز...... تو یوں کہنا چاہئے کہ حدیث مضمونِ خداوندی لیکن الفاظ حضور علیہ السلام کے ہیں اور قرآن کلام خداوندی ہے کہ لفظ بھی اللہ کا اس لئے اس کو وحی متلو کہتے ہیں کہ وہ تلاوت میں آتی ہیں اور اس (حدیث) کو وحی غیر متلو کہتے ہیں کہ یہ ان معنوں میں تلاوت میں نہیں آتی۔ لیکن محبت اور استفادے کا تقاضا ہے کہ اس کی بھی تلاوت کی جائے۔

چناں چہ بعض علماء کا معمول رہا ہے کہ جہاں وہ دو چار پارے قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے تو وہاں وہ بخاری کا پارہ۔ یا نصف یا ربع یا ثلث مقرر کر لیتے تھے اور اس کی بھی تلاوت کرتے تھے تو اب بھی بعض علماء ایسے ہیں کہ وہ بخاری کی تلاوت کرتے ہیں دو تین سال میں ختم کر دیتے ہیں تو تلاوت کرنے میں ایک برکت حاصل ہوگئی دوسرا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت پیدا ہوتی ہے جتنا کسی کے کلام کو پڑھا جائے اس سے نسبت پیدا ہو جائے گی یعنی دل اٹک جاتا ہے اور لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر آدمی بامعنی پڑھے تو حقائق تک پہنچتا ہے اور اگر مراقبے کے ساتھ پڑھے تو کیفیات بھی طاری ہونے لگتی ہیں۔

شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: جب تلاوت کرنے بیٹھو تو یہ تصور کرو کہ دراصل تلاوت کنندہ حق تعالیٰ کی ذات ہے، میں تلاوت نہیں کر رہا۔ حق تعالیٰ تلاوت کر رہے ہیں زبان میری ہل رہی ہے زبان میری ہے کلام ان کا ہے تکلم ہو رہا ہے: ﴿وَمَايَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى ٥ اِنْ هُوَاِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾

ہمارا نبی جو کلام کرتا ہے کلام ہمارا ہے زبان ان کی ہے زبان مظہر بنی ہوئی ہے۔ تو شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ تلاوت کرنے بیٹھو تو اس لحاظ سے کرو کہ کلام حق تعالیٰ کا ہے۔ وہ پڑھ رہے ہیں زبان میری حرکت کر رہی ہے۔ اس پر عبور ہو رہا ہے۔ تو کہتے ہیں کہ جب یہ مراقبہ مضبوط ہو جائے گا تو صراحتہً غیب وکشف کے اندر سے آواز آنا بھی شروع ہو جائے گی کہ حقیقتاً تم تلاوت نہیں کر رہے ہو۔ حق تعالیٰ ہی تلاوت کر رہے ہیں اور جب وہ تلاوت کریں گے تو پورے عالم کا ذرّہ ذرّہ ناطق ہوگا۔ اس کلام کے ساتھ ہر درخت کے پتہ سے آواز آئے گی کہ تلاوت ہو رہی ہے۔

بہر حال یہ کلام خداوندی کی خصوصیت ہے کہ اس کی تلاوت کرو تو بڑھتا چلا جائے گا۔ تلاوت کثرت سے کرو گے تو حق تعالیٰ سے نسبت پیدا ہوگی اور اس کو مراقبہ سے کرو تو وہ کیفیات جو ان آیات میں بھری ہوئی ہیں وہ قلب پر طاری ہونا شروع ہو جائیں گی اور قلب وروح محسوس کریں گے اور قیامت میں جا کر آنکھوں کو محسوس ہوگا۔

عظمتِ قرآن اور پیغمبر کی جلالتِ شان...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: حق تعالیٰ لوحِ محفوظ کو (قیامت میں) خطاب کریں گے کہ قرآن لاؤ۔ وہ عرض کرے گی کہ قرآن تو جبرائیل امین لے گئے تھے جبرائیل علیہ السلام کو بلایا جائے گا تو وہ اس طرح آئیں گے کہ ان کے ہاتھ پیر کانپتے ہوں گے۔ اتنا مشکل ہوگا لرزتے ہوئے ہوں

گے کہ معلوم نہیں کیا ہوگا؟ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ قرآن لوحِ محفوظ سے تم لے کر آئے ہو؟ عرض کریں گے، میں لے کر آیا، کہاں لے کر گئے، میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اتارا۔

تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طلبی ہوگی۔ حق تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائیں گے کہ ہمارا قرآن آپ تک جبرائیل نے پہنچایا۔ آپ فرمائیں گے بلاشک پہنچایا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے آپ نے کیا کیا؟ میں نے اپنی امت کے سامنے تلاوت کیا اور اس کو پڑھا اور تعلیم بھی دی اس کی کیفیات بھی میں نے بتائیں ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾

حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا اب ہمارے سامنے اور ان امتوں کے سامنے بھی تلاوت کرو۔ حدیث میں ہے کہ آپ کا منبر اس مقام پر بچھا دیا جائے گا۔ جہاں آج آپ کا منبر بچھا ہوا ہے یعنی مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں۔ اس پر بیٹھ کر آپ تلاوت فرمائیں گے پوری ترتیل کے ساتھ اوّل سے لے کر آخر تک پورقرآن پڑھیں گے اور دنیا کی ساری امتیں سنیں گی۔ تو اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہیں گے کہ یہ قرآن تو ہم نے اب تک سنا ہی نہیں جو آج سن رہے ہیں اس لئے کہ وہ کیفیات جن کا ادراک روح کرتی تھی آج آنکھوں سے نظر آئیں گی اور قرآن ایک باغ و بہار کے رنگ میں ہوگا جس میں عجیب وغریب پھول کھلے ہوئے ہوں گے، عجیب عجیب خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں تو پورے قرآن کو مجسم کر دیا جائے گا۔ اور وہ کیفیات جو روحیں محسوس کرتی تھیں، قیامت کو آنکھیں محسوس کرنے لگیں گی۔ ظاہر بات ہے کہ جب حق تعالیٰ سامنے ہوں، تمام انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کا مجمع ہو اور سیّد اولین والآخرین پڑھ رہے ہوں تو ان کیفیات کا کیا ٹھکانہ ہوگا جو قلوب پر طاری ہونگی اور وہاں سے بڑھ کر آنکھوں کے سامنے آجائیں گی۔ تو درحقیقت قرآن کریم میں پہلی چیز لفظ اور دوسری چیز معنی ہیں اور تیسری چیز اس کے حقائق ہیں، اور چوتھی حقائق کے نیچے، اس کی کیفیات ہیں جو اروح پر طاری ہوتی ہے کبھی خوف کا غلبہ، کبھی خشیت کا غلبہ، کبھی رجاء کا غلبہ، کبھی امید کا غلبہ، کبھی رحمت سامنے، کبھی قہر سامنے، یہاں روح محسوس کرتی ہے وہاں آنکھیں محسوس کرنے لگیں گی۔

اس لئے میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم میں تو کیفیات الوہیّت جمع ہیں اور کلام رسول میں کیفیات نبوّت جمع ہیں۔ اگر آیت قرآن کو تلاوت کیا تو کیفیات الٰہیہ آپ کے باطن پر طاری ہوں گی اور اگر کلام نبوّت کو تلاوت کیا تو کوائف نبوّت آپ کے قلب کے اوپر طاری ہوں گے، اور پھر آپ محسوس کریں گے کہ یہ کیسا عجیب وغریب کلام ہے کہ کتنے سمندر اس میں چھپے ہوئے ہیں۔ تو بہرحال یہ داستان تو بڑی طویل ہے، میرا یہ مقصد تھا عرض کرنے کا کہ پہلی بات کتاب کی صنعت تھی اور دوسری چیز حدیث کی خصوصیات تھیں۔

احوال واقعی...... حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعوم دیوبند نے دارالعلوم حقانیہ میں اپنی تشریف آوری کے موقع پر طلباء واساتذہ، دارالعلوم کی خواہش پر بروز اتوار ۲۰ رجب ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۸ء دارالحدیث ہال میں بخاری شریف کی پہلی اور آخری حدیث پر نہایت حکیمانہ اور عالمانہ درس دیا۔

دارالحدیث اوراس کے باہر برآمدے۔اہل علم وفضل سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، ہال پر ایک عجیب نورانی فضاء چھائی ہوئی تھی۔علوم ومعارف قاسمیہ کا یہ فیضان نمازعصر تک جاری رہا۔یہ تقریب ایک گونہ دارالعلوم کی طرف سے استقبالیہ تقریب بھی تھی،اس لیے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی طرف سے دارالعلوم کے مدرس مولانا شیرعلی شاہ نے عربی زبان میں ایک فصیح و بلیغ سپاسنامہ بھی پیش کیا۔حضرت حکیم الاسلام مظہرانوارِقاسمیہ مدظلہ کی تقریر کے تمہیدی کلمات اپنے اندراکابرین دیو بندکی تواضع عجز،انکساری اور بےنفسی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔حضرت مدظلہ کا درس اس وقت ٹیپ ریکارڈ سے محفوظ کرلیا گیا۔اوراب اسے من عن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

ادارہ ''الحق'' دارالعلوم اکوڑہ خٹک

افادات بخاری نمبر۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّـا بَعْـدُ!.....حَدَّثَنَاالْحُمَيْدِيُّ (إِلٰى قَوْلِهٖ)سَمِعْتُ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ عَلَى الْمِنْبَرِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ :"إِنَّمَاالْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَانَوٰى،فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ،وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ إِلٰى دُنْيَايُصِيْبُهَاأَوْإِلَى امْرَأَةٍ يَّنْكِحُهَافَهِجْرَتُهٗ إِلٰى مَاهَاجَرَ إِلَيْهِ ."①

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ:"سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ"②

بجواب سپاس نامہ..... بزرگان محترم! یہ مجلس کسی وعظ وتلقین کی یا کوئی اجتماع عام نہیں ہے۔ بلکہ مجلس درس ہے اس لئے میں نے صحیح بخاری کی دوحدیثیں تلاوت کی ہیں۔ایک بالکل ابتدائی اور ایک بالکل انتہائی۔ابتداء اور انتہاء کے بیچ میں "وسط" کا حصہ ہوتا ہے۔تو اس اعتبار سے تقریباً پوری بخاری معنیً وحکماً آپ کے سامنے میں نے تلاوت کردی۔

سپاسنامہ میرے لئے دنیا و آخرت کی نجات کی دستاویز ہے۔اس لئے کہ پیش کرنے والے جن کا نام مبارک لیا گیا،حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ ہیں میں انہیں اپنے اساتذہ کے طبقے میں سمجھتا ہوں۔اس لئے ان کا سپاس نامہ درحقیقت شفقت نامہ ہے،سپاسنامہ تو کسی چھوٹے کی طرف سے ہوتا ہے،بڑوں کی طرف سے محض شفقت،

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول الله ﷺ، ج: ۱، ص: ۳.

② الصحیح للبخاری، کتاب التوحید،باب قول الله تعالیٰ :ونضع الموازین القسط،ج:۶، ص: ۷۴۹،رقم: ۷۱۲۴.

حوصلہ افزائی اور اظہار برکت کے لئے ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: اَنْتُمْ شُھَدَآءُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ ①
تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ اگر سرکاری گواہ کسی کی نسبت شہادت دے دے کہ وہ اچھا ہے تو وہ عنداللہ اچھا ہی ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان حضرات کی شہادت اگرچہ کریم النفسی یا حوصلہ افزائی ہے لیکن میں اسے یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اہل اللہ کی زبان ہے اور اہل اللہ کی زبان سے جو کچھ ادا ہو رہا ہے۔ وہ انشاء اللہ من اللہ ہے۔ اور میں کتنا بھی نالائق سہی لیکن جب ایسے پاکیزہ لوگ گواہی دیں گے تو اللہ کے ہاں کیا بڑی بات ہے کہ اللہ کسی نالائق کو لائق بنادے، کسی برے کو اچھا بنادے۔ سپاسنامہ درس کے مناسب حال نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میں یہاں دارالعلوم حقانیہ حاضر ہوا، تو میں اسے اپنا گھر سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند میں بیٹھا ہوا ہوں میں تو خود آپ کے گھر کا ایک جز ہوں۔ تو اپنے گھر میں کسی کو سپاس نامہ تھوڑا ہی دیا جاتا ہے۔ یہ تو غیر کو دیا جاتا ہے۔

برادری مختلف جگہوں پہ منتشر ہے لیکن افراد کے انتشار سے خاندان منتشر نہیں ہوتا۔ ہمارا علمی خاندان ایک ہی ہے اس کے اجزاء منتشر ہیں کچھ دیوبند میں، کچھ پاکستان میں، کچھ برما میں، اور کچھ افریقہ میں، یہ سارے افراد کنبہ ہیں جو مختلف جگہوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اصل ہم سب کی ایک ہے جس کو دارالعلوم دیوبند کہا جاتا ہے۔ اس واسطے جیسے آپ اس کی شاخیں ہیں، میں بھی ایک شاخ ہوں تو میں اپنی برداری میں آیا، بھائیوں میں آیا۔ تو بھائیوں میں سپاس نامہ عزت افزائی تو ہے مگر ایک رسمی سی چیز ہے۔ لیکن چوں کہ اہل حق پیش کر رہے ہیں میں اس لئے اسے رسم بھی نہیں سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ حقیقت ہے۔ جو کچھ ارشاد فرمایا گیا یہ اعماقِ قلب سے ارشاد فرمایا گیا یہ زبان اور قلم نے حرکت نہیں کی۔ بلکہ دل کی حرکت ہے اور دل سے جب ایک چھوٹے اور نالائق کو اچھا کہا گیا، تو انشاء اللہ تعالیٰ وہ عنداللہ اچھا بن جائے گا۔

تو میں نے اس وقت بجائے کسی تقریر کے جو جلسے کا موضوع ہوتا ہے صحیح بخاری کی دو حدیثیں تلاوت کی ہیں اور اسی سلسلے میں چند کلمات طالب علموں کے سامنے گزارش کروں گا۔ میرے مخاطب حضرات اساتذہ نہیں ہیں۔ یہ تو خود میرے استادوں کے طبقے میں ہیں۔ یہ میری بات چیت طلبہ سے ہے جو برادری کے بھائی ہیں۔

علم میں بے شک آپ مجھ سے افضل ہیں، آپ کا علم تازہ ہے۔ اور مجھے تو پڑھے ہوئے چالیس برس گزر گئے، بھول بھال بھی گیا کہ پڑھا تھا۔ انتظامی سلسلے کے جھگڑوں میں پھنس کر وہ نوعیت بھی نہیں رہی اس واسطے ایک بھائی تو ہوں مگر ایک جاہل قسم کا بھائی ہوں آپ بحمداللہ علماء ہیں علم تازہ ہے تاہم آپ نے چوں کہ اس جگہ بٹھلا دیا۔ اس واسطے اسی کے مناسب حال یہ روایتیں میں نے تلاوت کیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی کتاب کی عظمت...... امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان اور

① سنن الترمذی، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی الثناء الحسن علی المیت، ج: ۴، ص: ۲۱۸۔ حدیث صحیح ہے۔
دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی بحوالہ صحیح ابن ماجۃ ج: ۳ ص: ۵۸ رقم ۱۰۵۸۔

جلالتِ قدر سے کون مسلمان ناواقف ہے اہل علم میں کون ہے جو ناواقف ہے۔ان کی تصنیف یا تالیف صحیح بخاری کی عظمت وجلالت پوری امت پر واضح ہے۔امت نے اجتماعی طور پر تلقی بالقبول کی ہے اور "اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللہِ" ہونے کی شہادت دی ہے اس لئے مولف بھی جلیل القدر، کتاب بھی جلیل القدر اور کتاب کا جو موضوع ہے وہ حدیث ہے، یعنی "کَلَامُ النَّبِيِّ ﷺ وَ اَفْعَالُهٗ وَاَقْوَالُهٗ وَتَقْرِيْرَاتُهٗ."

اس لئے موضوع بھی مبارک، مصنف بھی مبارک، تصنیف بھی مبارک، حق تعالیٰ ہم سب کو بھی مبارک بنا دے کہ ان کے سلسلے سے ہم سامنے آ رہے ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ صفت تمام محدثین کرام میں امتیازی طور پر معروف ہے نسائی رحمۃ اللہ علیہ کو کہتے ہیں کہ انہوں نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا کچھ نقش قدم اختیار کیا ہے مگر بہر حال اصل اصل اور فرع فرع ہے صنع بخاری یہ بہت اونچی چیز ہے اور تراجم بخاری یہ تو فی الحقیقت فقہ کا ایک مستقل باب ہیں: "فِقْهُ الْبُخَارِيِّ فِيْ تَرَاجِمِهٖ" تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ محدث بھی ہیں اور فقیہ بھی ہیں۔ نیز اجتہاد کے رتبے کو پہنچے ہوئے ہیں اس لئے میں نے تبرکاً پہلی حدیث بھی تلاوت کی اور آخر کی بھی تلاوت کی۔

عملی دنیا کی دو چیزیں...... دونوں روایتوں کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں نہ وقت ہے نہ اب اتنی طاقت ہے لیکن اتنی بات بالاجمال عرض کئے دیتا ہوں کہ آدمی کے لئے عملی دنیا میں دو چیزیں ہیں، ایک مصدرِ عمل اور ایک مظہرِ عمل، وہ چیز ہے جس سے عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔اور مظہرِ عمل، عمل کی وہ ہیئت کذائی ہے جس میں رہ کر ہم اور آپ عمل انجام دیتے ہیں تو مصدرِ عمل درحقیقت انسان کی نیت ہے جس سے عمل سرزد ہوتا ہے، اور عمل کی قبولیت نا قبولیت ،نیّت پر موقوف ہے، اچھا سے اچھا عمل ہو، لیکن نیت خراب ہو وہ برا بن جاتا ہے، اور برے سے برا عمل ہو لیکن وہ نیت کی صحت سے انجام پائے تو آدمی کبھی موردِ ملامت نہیں ہوتا۔وہ عمل بھی مقبول ہو جاتا ہے، اس لئے سب سے بڑی چیز نیت ہے کہ جس سے عمل کا صدور ہو اور ایسے پاک عمل کا ثمرہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں جو میزانِ عمل ہے وہ بھاری پڑ جائے۔نیک اعمال ہی سے میزان میں وزن پیدا ہوگا۔ برے اعمال کا وزن نہیں ہے۔ بلکہ بروں کو تو تولنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جب اچھے اور برے جمع ہوں گے جبھی تو تولنے کی ضرورت پڑے گی۔تاکہ توازن قائم ہو جائے۔

اس عملی دنیا میں دو ہی چیزیں ہیں۔ایک مصدرِ عمل اور ایک ثمرۂ عمل۔تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدا میں "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" ① حدیث نقل کی ہے کہ گویا نیت بنیاد ہے عمل کا ظہور درحقیت اسی نیّت سے ہوتا ہے ،قبولیت بھی اسی نیت پر موقوف ہے یہ الگ چیز ہے کہ بعض اعمال بلا نیّت کے صحیح ہو جائیں اور شریعت ان کو معتبر مان لے، لیکن آخرت کا اجر و ثواب بغیر نیّت کے مرتّب نہیں ہوگا۔وضو اگر آپ بلا نیت بھی کریں تو مفتاح صلوٰۃ تو بن

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ج:۱، ص:۳، رقم:۱

جائے گا۔لیکن جب تک نیت نہ ہو، اجر مرتب نہیں ہوگا۔تو عنداللہ قبولیت کا معیار درحقیقت نیت پر ہے۔صحت کا معیار فتویٰ ہے۔اس لئے کہ بعض بغیر نیّت کے صحیح بھی نہیں ہوتے بعض صحیح تو ہوجاتے ہیں گوان پر اجر مرتب نہ ہو۔

نیت عمل کی بنیاد ہے...... بہر حال قدر مشترک کے طور پر نیت بنیادی چیز ہے۔حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''نِیَّةُ الْمَرْءِ خَیْرٌ مِنْ عَمَلِهٖ'' آدمی کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

بعض احادیث میں فرمایا گیا کہ یوم محشر میں بعض لوگ حاضر ہوں گے، حق تعالیٰ شانہ ملائکہ سے فرمائیں گے کہ لکھ دو انہوں نے عمر بھر تہجد پڑھی ہے۔ملائکہ عرض کریں گے کہ انہوں نے ایک دن بھی تہجد نہیں پڑھی۔حق تعالیٰ فرمائیں گے، روزانہ سوتے وقت نیت کرتے تھے کہ آج ہم تہجد پڑھیں گے، مگر آنکھ نہیں کھلتی تھی، لہٰذا لکھ دو کہ انہوں نے ساری عمر تہجد پڑھی تو انسان کی نیّت عمل کی بنیاد ہے۔

ربط بین الابواب...... دوسرے لفظوں میں اس کو یوں تعبیر کرنا چاہئے کہ آدمی پہلے دل سے عمل کرتا ہے پھر ہاتھ پاؤں سے۔ وہی دل کا عمل بنیاد ہے جس سے ہاتھ پیر کا عمل ظاہر ہوتا ہے۔تو قلب سے عمل کرنے کی صورت نیّت ہے اور قالب سے عمل کرنے کی ہیئت کذائیہ ہے جو شریعت نے ارشاد فرمائی۔تو پہلے ہر عمل قلب سے ہوتا ہے پھر قالب سے انجام پاتا ہے اور وہ قالبی عمل اس باطنی عمل پر منطبق ہوتا ہے۔تو رخ دو ہیں اور عمل درحقیقت ایک ہے باطنی رخ اس کا نیت ہے اور ظاہری رخ اس کی وہ ہیئت عمل ہے۔

تو امام ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے ایسی بنیادی حدیث نقل کی کہ کوئی عمل ایسا نہیں ہے جس میں نیت کا دخل نہ ہو۔اور اس کے اجر وثواب کا تعلق نیّت سے نہ ہو۔ترتیب یوں ہوگی کہ پہلے نیت درست کرادی۔اس کے بعد ابواب ایمان، ابواب علم، پھر ابواب زکوۃ، اور دیگر ابواب بیان کئے، ان سب کا مصدر ''نیت'' ہی بتلادیا۔تو حکماً وہ سارے ابواب اس کے نیچے آگئے۔

اعمال پر اجر کا ترتب...... اخیر میں جو چیز تھی وہ عنداللہ قبولیت اور اجر کا ترتب ہے۔تو آخر میں یہ حدیث نقل کی: کَلِمَتَانِ حَبِیْبَتَانِ إِلَی الرَّحْمٰنِ خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ ثَقِیْلَتَانِ فِي الْمِیْزَانِ: ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِیْمِ'' دو کلمے ہیں جو زبان پر نہایت ہلکے، ان کے ادا کرنے میں نہ وقت لگتا ہے نہ دشواری ہے۔ایک کلمہ ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ''

اور دوسرا کلمہ ''سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِیْمِ'' ہے۔یہ ہلکے ہلکے دو کلمے جو ادائیگی میں نہایت ہلکے زبان پر نہایت لطیف، لیکن بلحاظ اجر کے ثقیل ہیں۔میزان عمل کے اندر جو ان کا وزن ہوگا۔وہ دوسرے اعمال کا نہیں ہوگا۔کیوں ہیں یہ وزنی؟

وزنِ کلمات کی وجہ......ان کے ثقیل ہونے کی بنا درحقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں مقامات الوہیت کا بیان ہے۔اور ظاہر ہے کہ وہ اتنے عظیم ہیں کہ کائنات کی کوئی چیز اس کے لگ بھگ نہیں ہوسکتی۔تو انتہائی بات یہ ہے کہ

مقاماتِ الوہیت کو ان دوکلموں کے ذریعے بیان فرمایا گیا گویا یوں کہنا چاہئے کہ حق تعالیٰ اجزاء سے پاک ہیں۔ وہ نہ بسیط ہے نہ مرکب، ہر چیز سے وراء الوراء ہیں۔ لیکن حق تعالیٰ شانہ کی الوہیت کے مقامات، ظاہر بات ہے کہ وہ لامحدود ہیں حد کمال انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

مقام تنزیہہ...... حق تعالیٰ کے مقامات میں سب سے پہلی چیز تنزیہہ ہے، یعنی وہ ہر عیب سے بری۔ ہر نقص سے بالا اور تمام عیوب سے پاک تو حق تعالیٰ کی تنزیہہ اور اس کی پاکی بیان کرنا ظاہر بات ہے کہ یہ مقامات الوہیت میں ایک مقام ہے۔ خدا کہتے ہیں اس ذات کو جو ہر برائی سے پاک ہو "اَلْخَیْرُ کُلُّہٗ مِنْکَ وَاِلَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ" ہر خیر کا سرچشمہ وہ ہے، اسی سے خیر چلتی ہے، ہر شر سے بری و بالا ہے ذات بھی شر سے پاک ہے اور باہر کی شر بھی وہاں نہیں پہنچ سکتی۔ تو وہ ہر حیثیت سے وراء الوراء ہے۔ تو الوہیت کا پہلا مقام یہ ہے کہ وہ خدا ذات برتر ہر عیب سے پاک ہے، تو پہلی چیز مقامات الوہیت میں تنزیہہ ہے اور سبحان اللہ کہنا یہ گویا اشارہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی پاکی بیان کرر ہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب ایک ذات بابرکات وہ ہو جو ہر عیب سے پاک اور بری ہے (تو الوہیت اسی کے شایان شان ہو سکتی ہے۔ تو ایک مقام تو الوہیت کا یہ ہوا)۔

اب آگے خوبیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ تو جہاں بھی جو خوبی ہے وہ اسی ذات کی ہے اگر آپ علم دیکھیں گے تو اصل علم حق تعالیٰ کا ہے اس کا پرتو پڑتا ہے تو دوسرے عالم کہلانے لگتے ہیں۔ قدرت درحقیقت اس کی ہے اس کا پرتو پڑا۔ تو ملائکہ قادر کہلانے لگے۔ کہ پل بھر میں آسمان سے زمین اور زمین سے آسمان پر۔ ان کا علم حقیقی اور ذاتی ہے اس کا پرتو پڑا تو ہم آپ بھی عالم کہلانے لگے اور اور انسان کو مظہر علم بنا دیا۔ رفیع المرتبہ اور رفعت وعظمت ان کی شان ہے۔ اس کا پرتو آسمانوں پر پڑا تو وہ رفعت والے ہو گئے۔ وہ بھی اونچے بن گئے اور ان کی برتری ثابت ہوگئی۔ تو سرچشمۂ کمالات کا اللہ کی ذات بابرکات ہے اور ظاہر بات ہے کہ حمد وثناء کمال پر ہی کی جاتی ہے۔ نقص اور عیب پر کوئی کسی کی حمد وثناء نہیں کرتا تو حمد وثناء کے معنی یہ ہیں کہ جمیل اختیاری پر حمد کی جائے۔

مقام تحمید...... ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہ تمام کمالات کا سرچشمہ اور ساری برکتوں کا مصدر ہیں اس لئے تمام تعریفیں بھی انھی کے لئے ہونگی۔ حمد وثناء بھی انھی کے لئے ہوگی۔ جس کی بھی ثنا کی جائے گی وہ درحقیقت انجام کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ثناء ہوگی۔ کیوں کہ اسی کا کمال تھا جو کسی دوسرے میں ظاہر ہوا۔ تو حمد وثناء کے اظہار کا طریقہ درحقیقت تحمید ہے اور اس کے لئے الحمد للہ کا کلمہ رکھا گیا تو سبحان اللہ کا کلمہ تنزیہہ بیان کرنے کے لئے ہے۔

دوسرا مقام تنویہ اور عظمت بیان کرنے کا ہے اس لئے تحمید رکھی گئی اور اس کے لئے الحمد للہ کا کلمہ رکھا گیا ہے۔

اسی واسطے قرآن کریم میں جگہ جگہ مختلف عنوانوں سے ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿فَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا﴾ ﴿فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ﴾ ﴿وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾ وَغَيْرُ ذٰلِكَ. تو تسبیح وتحمید اور حمد وتسبیح کرنا جگہ جگہ ذکر کیا گیا۔ تو سبحان کا کلمہ مقام تنزیہہ کو

ظاہر کرتا ہے اور الحمد للہ کا کلمہ مقام تنویہ کو ظاہر کرتا ہے۔

اب ظاہر بات ہے جو ذات اقدس ہر عیب سے بری اور ہر کمال کا سرچشمہ ہو تو عظمت اور بڑائی بھی اسی کے لئے ہوگی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ عظمتوں کا سرچشمہ تو وہ ہو اور بڑائی کسی اور کی ہو جائے۔ عظمت اور کبریائی کسی اور کے لئے ہو جائے۔ جو در حقیقت کمال کا مصدر ہے وہی حمد و عظمت کا مستحق ہے کہ اسی کی کبریائی اور عظمت بیان کی جائے، اسی لئے اسلام نے تکبیر کا عنوان رکھا اور اس کے لئے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کا صیغہ رکھا۔ تاکہ اللہ کی عظمت بیان کی جائے کہ اَکْبَرُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ وہ ہر چیز سے وہ بڑا ہے۔

اور نہ صرف اضافۃً بڑا ہے بلکہ حقیقتاً بڑا ہے کہ بڑائی ہے ہی اس کے لئے جس میں کوئی بڑائی آتی ہے اسی کے نام کے ساتھ ملنے سے آتی ہے، اس کے نام سے جو کٹ گیا، اس میں بڑائی ختم ہوگئی۔ تو بڑائی، عظمت و کبریائی در حقیقت اسی کے لئے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ''اَلْکِبْرِیَآءُ رِدَآئِیْ وَالْعَظَمَۃُ اِزَارِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ فِیْھِمَا قَصَمْتُہٗ'' تکبر میری چادر ہے، بزرگی میری لنگی ہے جو بھی اس میں کھینچا تانی کرے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ اس کو نیچا دکھلاؤں گا۔ تو یہ برداشت نہیں کہ کبریاء و عظمت میں کوئی شریک ہو۔ وہ وحدہ لاشریک لہ کے لئے ہے۔ تو ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اس کے لئے بڑائی و عظمت ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب...... یہاں ذرا سا ایک طالب علمانہ شبہ پیدا ہوگا۔ یا ہوا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ حدیث میں حکم ہے تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ اللہ کے اخلاق سے متخلق بنو، وہ کریم ہے تو تم بھی کریم بنو۔ وہ رحیم ہے تو تم بھی رحیم القلب بنو وہ حافظ حفیظ ہے تو تم بھی اپنوں کی نگہداشت کرو وہ معطی حقیقی ہے تو تم بھی فقیروں کے ہاتھ پر رکھو اور اعطاء کی صفت اختیار کرو۔ تو اللہ تعالیٰ کے کمالات سے متکمل بھی بنو۔ اور اس کے اخلاق سے متخلق بھی بنو۔ تو شبہ یہ ہوتا ہے کہ متکبر بھی تو اس کی شان ہے، اس میں بھی تخلق ہونا چاہئے ہر شخص متکبر بنے ورنہ کریم النفس بننے سے روکا جائے۔ اس میں بھی شرک ہوگا تو پھر اگر ہم تکبر کریں تو ملامت کیوں کی جاتی ہیں تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (بموجب حدیث) اللہ کے اخلاق سے متخلق بننا تو عین کمال ہے۔؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تکبر کرنا معاذ اللہ بری بات نہیں ہے۔ نہ کبر بری چیز ہے۔ وہ تو صفت خداوندی ہے، تکبر کرنا برا نہیں ہے۔

جھوٹ بولنا بری بات ہے۔ جو اللہ کے سوا کہے گا میں بڑا ہوں جھوٹا ہوگا۔ جھوٹ بولے گا۔ تو جھوٹ بولنے سے روکا گیا ہے، اب ایک ہی ذات کے لئے تکبر سزا وار ہے تو اللہ ہی فرما سکتا ہے: ''اَنَا الْکَبِیْرُ، اَنَا الْمُتَعَالُ، لِیَ الْکِبْرِیَآءُ'' بڑائیاں میرے لئے ہیں اور عظمت میرے لئے ہے۔ اس کے سوا جو دعویٰ کرے گا کہ ''لِیَ الْکِبْرِیَآءُ، لِیَ الْعَظَمَۃُ'' ۔ وہ جھوٹا ہوگا تو جھوٹ بولنا بری عادت ہے تکبر کرنا بری عادت نہیں ہے۔ مگر حق تعالیٰ شانہ کے سوا جو متکبر بنے گا، جھوٹ بولے گا۔ اس واسطے روک دیا گیا۔

(دوسرا جواب یہ ہے کہ جو حقیقی جواب ہے، کیوں کہ آدمی تکبر تو نہیں کرتا کیوں کہ ہر متکبر حق تعالیٰ شانہ کے

علاوہ جھوٹا ہوگا۔لیکن پھر حدیث "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللهِ" کے پیش نظر"صفت کبریائی" کوملحوظ رکھتے ہوئے اس کے مفہوم کا تعین ضروری ہے تو فرماتے ہیں) پھر یہ کہ کبریائی وعظمت درحقیقت صفات ذات میں سے ہے۔ صفات افعال میں اگر ہم تخلق کریں تو وہ الگ بات ہے (اس کا تو حکم ہے) لیکن صفات ذات مثلاً خالقیت کی صفت میں کوئی تخلق کرنے لگے یا تکبر میں تو یہ ایسا ہے جیسے کوئی ذات کی برابری چاہتا ہو۔اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔اس واسطے روکا گیا کہ تکبر نہ کیا جائے اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔تکبر کرنے والا ہمیشہ محروم ہوتا ہے کیوں کہ وہ جھوٹا ہوتا ہے،کسی کو تکبر کی اجازت نہیں ہے۔

حقیقتِ توحید......تو جو ذات تمام عیوب سے پاک ہو،تنزیہہ اسی کے لئے ہے۔جو ذات ساری خوبیوں کا سرچشمہ ہو،تو یہ اسی کے لئے ہے۔جو ذات ساری خوبیوں کی مالک ہو،عظمت وکبریائی اس کے لئے ہے،اور ظاہر بات ہے کہ جب ذات وہ مان لی جو ہر عیب سے پاک اور ہر کمال سے متصف وموصوف اور ذاتی طور پر ہر برائی اور عظمت اس میں ہے،تو پھر یکتا بھی وہی ہوگا۔جب ایسی ذات کوئی دوسری نہیں ہے تو اس ذات کو یکتا کہا جائے گا۔ جس کا کوئی شریک نہیں برابر نہیں۔کوئی ند نہیں،کوئی ضد نہیں،کوئی اس کے لگ بھگ نہیں تن تنہا ایک ہی ذات بابرکات ہے جو ایک بھی ہے اور یکتا بھی نہ اس کی ذات جیسی ذات،نہ اس کے افعال جیسے افعال،نہ اس کی شیون جیسے شیون،تو ہر چیز کے اندر وہ یکتا ہے،اسی کا نام شریعت کی اصطلاح میں توحید ہے۔توحید کے معنی محض ایک ہونے کے نہیں ایک تو اپنی اپنی ذات میں،ہم اور آپ بھی ہیں،توحید کے معنی یکتا کے ہیں کہ اس کی کوئی مثل اور نظیر نہیں ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ تو درحقیقت توحید کی بنائیں تین ہیں،ایک تنزیہہ مطلق، ایک تنویہ مطلق،ایک تعظیم مطلق،عظمت بھی اس کی،پاکی بھی اس کی مصدر کمالات ہونا بھی اسی کی ذات کے شایان شان ہے تو جو ذات پاک بھی ہے۔جو ذات خوبیوں کا مصدر بھی ہے،جو عظمت والی بھی ہے تو معبودیت بھی اسی کی ہوگی یکتا بھی اسی کو کہا جائے گا۔پھر عبادت بھی اسی کی ہوگی،کسی دوسرے کی نہیں ہوسکتی۔یہی توحید کے معنی ہیں۔ کہ ذات کے لحاظ سے بھی یکتا ہو،صفات کے لحاظ سے بھی اور افعال کے لحاظ سے بھی کہ اس کا کوئی شریک نہ ہو اور شیون بھی اس کے بے مثل اور بے نظیر ہوں۔

تو مقامات الوہیّت چار نکل آئے،ایک تنزیہہ جو سُبْحَانَ اللهِ سے ادا ہوتی ہے،ایک تنویہ جو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے ادا ہوتی ہے ایک کبریائی وعظمت جو اَلْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ سے ادا ہوتی ہے اور ان تینوں کے مجموعے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ یکتا ہو تو یہ اس کے لئے توحید نکلی۔

تو اس حدیث پاک میں مقامات الوہیت بیان فرمائے گئے ہیں۔سُبْحَانَ اللهِ سے تسبیح وَبِحَمْدِهٖ سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ میں عظمت وکبریائی بیان کی گئی ہے اور ان تینوں کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ یکتا ہو تو توحید بطور ثمرہ ان پر مرتب ہو جاتی ہے۔جیسا کہ پہلی حدیث جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نیت کے بارے میں روایت

فرمائی''۔اس میں مقاماتِ عبدیّت ہیں،عبد کا کام یہ ہے کہ نیت سے بھی اس کی طرف رجوع کرے اور عمل سے بھی اس کی طرف رجوع کرے،قلب سے متوجہ ہوگا وہ نیت ہو جائے گی۔قالب سے متوجہ ہوگا،وہ عمل ہو جائے گا۔

تصحیح نیت اور حقیقت نیت......تو درحقیقت اس حدیث میں مقاماتِ عبدیّت بیان کئے گئے ہیں۔ بندے کا کام یہ ہے کہ نیت صحیح ہو۔نکاح کرے تو نیت صحیح ہو۔ہجرت کرے تو بھی اس کی نیّت صحیح ہو،دولت کمائے تو بھی نیّت صحیح ہو،اور نیّت صحیح کے معنیٰ ''حُبُّہٗ'' کے ہیں۔یعنی ہر عمل لِرِضَآءِ اللّٰہِ اور لِوَجْہِ اللّٰہِ ہو۔اور یہ کام بندے کا ہے۔حق تعالیٰ شانہ معاذ اللہ نیت کے پابند نہیں،وہاں نیّت کا کیا دخل۔؟وہ تو ہر چیز سے بری ہے۔کیوں کہ نیت تو درحقیقت عبادت ہے اور وہ عبادت سے بری ہے۔وہ تو معبود ہے(یہ کیسے ممکن ہے کہ معبود خود ہی اپنی عبادت شروع کردے)۔اس واسطے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ میں تو''مقاماتِ عبدیّت''بیان کئے اور اخیر حدیث میں مقاماتِ الوہیّت بیان فرمائے اور درمیان میں علم کے ابواب عمل کے ابوابُ،اور اعتقاد کے ابواب،تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان اعمال اور ان اعتقادات میں نیت صحیح کرو تا کہ قرب پیدا ہو۔اور جب قرب ہوگا تو ثمرات مرتب ہوں گے۔کہ تمہاری میزان عمل بھر جائے گی۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صنع بھی حد کمال تک ہیں لیکن یہ اول وآخر کی صنعت اس میں بھی حد کمال ہے کہ ابتدا میں بندے کو بندگی سمجھائی اور اخیر میں الوہیت کے مقامات کی طرف اشارہ کردیا اور بیچ کے اندر تمام ابواب آ گئے۔اس میں عبادات بھی ہیں،معاملات بھی ہیں،معاشرت بھی ہے،سیاسیات بھی ہیں،تو دین کے سارے ابواب درمیان میں آجاتے ہیں،اور اول وآخر کو نیّت اور میزان عمل سے گھیر دیا،اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ دو کنارے صحیح رہیں تو عبادت بھی قبول،معاشرت بھی قبول،سب رضائے خداوندی کا ذریعہ بن جائیں گے،اس واسطے میں نے اوّل کی حدیث بھی تلاوت کردی اور آخر کی حدیث بھی اور ۔ع۔اول باخر نسبتے دارد۔ان دونوں میں باہم ایک نسبت ہے اور وہ نسبت یہی ہے کہ بندہ ابتداء سے چلے اور انتہا تک پہنچ جائے اور امت میں علم وعمل اور عبادت سب کو لیتا ہوا چلے اور انجام کار میزان عمل تک پہنچ جائے،یہی آپ کے اعمال ہی درحقیقت تولے جائیں گے۔

اعمال میں وزن کیسے ہوگا؟......اور اعمال میں وزن نیّت سے ہوگا۔اگر نیت صحیح ہے،اخلاص صحیح ہے تو وہ عمل وزنی ہوگا،اگر العیاذ باللہ نیّت صحیح نہیں تو کتنا ہی بڑا عمل ہوگا،نامقبول ہوگا،تو اللہ کے ہاں صورت نہیں دیکھی جائے گی کہ ڈیل ڈول کتنا ہے؟ پھیلاؤ کتنا ہے؟ بڑا کتنا ہے،بلکہ وہاں وزن دیکھا جائے گا کہ اندر اخلاص کتنا ہے؟ کتنا حسنِ نیت ہے۔صدقِ دل کتنا ہے؟

''اِنَّ اللّٰہَ لَایَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ'' اللہ تعالیٰ شانہ،نہ تمہاری صورتیں دیکھتا ہے نہ تمہارے اعمال کی صورتیں دیکھتا ہے لیکن وہ تمہارے اندر دیکھتا ہے دلوں میں کیا ہے؟ اور عمل بھی دیکھتا ہے(کہ کتنا حسنِ نیت ہے)؟

بعض دفعہ چھوٹا سا عمل ہوتا ہے اور آدمی کمال اخلاص سے انجام دیتا ہے۔ وہی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے، اور بعض دفعہ صورت کے لحاظ سے سے عمل بہت بڑا ہوتا ہے مگر نیت درست نہیں تو وہی حبط اعمال کا ذریعہ بن جاتا ہے، اسی طرح ایک عمل چھوٹا ہوتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ کس کمال خلوص سے ادا کیا گیا کہ وہی مغفرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اخلاص کی قوّت...... امام ابوداؤد محدث جلیل، ان کی کتاب ''ابوداؤد شریف'' نصاب میں پڑھائی جاتی ہے۔ ان کے تراجم میں لکھا ہے کہ وہ کسی دریا کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے اور تقریباً سو پچاس قدم کے فاصلہ پر جہاز کھڑا ہوا تھا اس زمانے میں گودیاں تو تھی نہیں کہ جہاز پلیٹ فارم سے لگ جائے، تو جہاز پرے کھڑا ہوا تھا اور امام ابوداؤد کنارے پر تھے۔

جہاز میں کسی شخص کو چھینک آئی اس نے بہت زور سے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہا۔ ان کے کان میں آواز پڑی۔ تو مسئلہ آپ بھی جانتے ہیں کہ چھینک لینے والا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہے تو اس کے جواب میں یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہنا اخلاقی فرض ہے۔ مگر اس کے لئے مجلس شرط ہے یہ نہیں کہ کوئی بازار میں چھینک مار کر ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہے تو آپ سفر کر کے یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہنے کے لئے جائیں۔

امام ابوداؤد پر واجب نہیں تھا کہ وہ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہتے۔ وہ کنارے پر تھے اور جہاز آدھے فرلانگ کے فاصلے پر دور تھا۔ مگر یہ حضرات عمل کے بارے میں حریص ہوتے ہیں چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتے جیسے دنیا دار پیسے پیسے کے لئے حریص ہوتے ہیں کہ ہزار ہوں تو کہیں گے کہ دس ہزار ہو جائیں۔ دس ہزار ہو جائیں تو پھر کہیں گے کہ ایک لاکھ کے مالک ہو جائیں۔

اگر جنگل بھر کے بھی ان کو سونے کا دیں تو ضرور حرص کی وجہ سے دوسرا جنگل مانگیں گے ان اہل اللہ کو عملِ صالح کی حرص ہوتی ہے کہ جتنا ہو سکے کمالیں، گویا ساری جنت کو اپنے لئے سمیٹنا چاہتے ہیں۔

مگر اس کے معنی بخل کے نہیں (کہ کسی اور کو کچھ نہ ملے) بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ساری جنت پر قبضہ کر لیں اور اپنے ساتھ جو وابستہ ہیں۔ ان کو بھی ساتھ لے جائیں۔ معاذ اللہ خود غرضی لاحق نہیں کہ تنہا چلے جائیں بلکہ (بفضل خدا) اپنے سب متعلقین کو ساتھ پہنچائیں گے۔ بہر حال چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتے۔ تو کان میں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' پڑا، تین روپیہ میں کرایہ پر کشتی لی، اس میں بیٹھ گئے کہ جہاز کو پہنچ جائیں، وہاں جا کر یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہا۔ تو اہل تراجم لکھتے ہیں کہ غیب سے ایک آواز کان پڑی، بولنے والا تو نظر نہیں آتا تھا کہ اے ابوداؤد آج تین درہم میں تم نے جنت خرید لی۔

اب امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ، کتنے تو انہوں نے تہجد پڑھے ہوں گے، کتنی حدیثیں روایت کی ہوں گی۔ کتنے جہاد کئے ہوں گے، کتنے اعمال صالحہ کئے ہوں گے اور جنت کی خریداری میں صرف تین درہم لگے، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عمل کامل اخلاص سے کیا تھا، وہ اتنا وزنی بن گیا کہ وہی نجات کا ذریعہ بن گیا، تو اصل میں عمل کو مقبول بنا دینے

والی چیز وہ اخلاص کی قوت ہے، عمل تو بمنزلہ ڈھانچے کے ہے اور روح اس کے اندر حسنِ نیت ہے، اگر یہ روح نہ ہو تو عمل کا ڈھانچہ لاش کی مانند ہے۔ اور لاش کا انجام پھٹنا، پھولنا، سڑنا، گلنا ہے۔ اسی طرح عمل ہے۔ اس کے لئے اخلاص روح ہے۔ وہ آخرت تک پہنچے گا، اس پر ثمرات مرتب ہوں گے، تو امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے تین درہم میں جنت کمالی۔ اسی طرح جو بھی آپ حدیث پڑھ لیں اس کو کم درجے کا نہ سمجھیں ایک حدیث پڑھنے کی بھی توفیق ہوگئی تو دنیا و مافیہا ہمارے ہاتھ آ گئی۔ جنت میں تو ایک تنکے کے برابر ایک جوتے کے تسمے کے برابر بھی جگہ مل جائے تو سعادت ہے، دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

حقیقت جنت و عمل...... اور جنت یہ قرآن و حدیث ہی تو ہے بلکہ بعض روایات میں تو فرمایا گیا کہ قرآن مجید کی جتنی آیات ہیں اتنے ہی جنت میں درجات ہیں اور بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتیں خود جنت کے درجات ہیں، وہاں جا کر نعیم مقیم کی صورت میں متمثل ہونگی۔ یہاں ان کی عمل کی شکل ہے، وہاں جا کر ان کی شکل نعمت کی بن جائے گی تو چیز ایک ہی ہے، دار دنیا میں ان کا لباس عمل ہے اور دار آخرت میں ان کا لباس ثمرہ اور جزاء کا ہے۔ تو یہ اعمال بعینہ وہاں جا کر باغ و بہار کی صورت اختیار کریں گے۔

تمثل اعمال کی مثال...... ہمارے بچپن میں یورپ سے ایک کھلونا آیا کرتا تھا۔ ایک پیکٹ ہوتا۔ اس میں بارہ ٹکیاں ہوتیں۔ وہ دو آنے میں ملا کرتا تھا۔ ٹکیہ لے کر بچے بیٹھ جاتے اور کٹورے میں پانی ڈال لیتے تھے پھر ایک ٹکیہ اس میں ڈال لیتے تھے۔ منٹ بھر کے بعد ٹکیہ پھٹتی تو کسی سے پھول نکل آتا، کسی میں سے انجن۔ کسی میں ریل کا ڈبہ نکل آتا۔ بچے خوش ہوتے کہ گولی کا انجن بن گیا۔ گولی کا پھول بن گیا۔ گویا کاری گر نے اس گولی کو ایسی ساخت سے بنایا تھا کہ جب وہ کھلے تو کسی نہ کسی صورت میں نمایاں ہو جائے۔

آیات نعمت کی شکل میں ظاہر ہونے کی مثال...... آتش بازی آپ نے دیکھی ہوگی۔ آتش بازی میں ایک بانس کا چکر ہوتا ہے اس کے سر پر مصالحہ اور بارود وغیرہ لگا دیتے ہیں، لیکن جب اس کو آگ دے کر کھولتے ہیں تو کسی میں سے آگ کا بنا ہوا گھوڑا اور کسی میں سے سوار نکل آتا ہے۔

وہ فضا کے اندر دوڑ رہا ہے۔ یہ کاریگر کی صناعی ہوتی ہے کہ وہ ایسے انداز سے مصالحہ لپیٹتا ہے کہ جب وہ کھلے تو گھوڑے کی شکل بن جائے۔ تو ان گولیوں میں بھی صنعت ہے، اور یہ بندوں کی صنعت ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو کسی ایسی صورت سے ترتیب دیا ہے کہ جب وہ کھلیں گی تو باغ و بہار بن جائیں گی۔ یہاں ان کی شکل آیت کی ہے، وہاں ان کی شکل نعیم مقیم کی بن جائے گی۔ تو چیز ایک ہی ہے۔ دار بدلنے سے، وطن بدلنے سے، اس کی ہیئت بدل جاتی ہے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی انجینئر جب کوئی کوٹھی بناتا ہے۔ تو سب سے پہلے اس کے قلب میں وہ کوٹھی بنتی ہے۔ اتنی کھڑکیاں، دروازے، اور رنگ و روغن وہ سب دل میں ذہنی آئینے میں تصور میں دیکھتا ہے کہ

وہی کوٹھی بعینہ بنی بنائی تیار ہے۔ پھر وہ اس کا نقشہ کاغذ پر کھینچتا ہے۔ پنسل سے یا قلم سے، وہی کوٹھی کا نقشہ کاغذ پر آجاتا ہے۔ پھر اس کے مطابق زمین پر وہ اینٹ سے کوٹھی تیار کرتا ہے۔ تو کوٹھی درحقیقت ایک ہی ہے جو کاغذ اور زمین پر آئی ذہن کا ظرف لطیف ہے تو اس کی شکل بھی مادی نہیں تھی۔ کاغذ پر آئی تو اس کی شکل روشنائی اور لکیروں کی بن گئی۔ دنیا کے میدان میں زمین پر آئی تو اس کی شکل اینٹ پتھر کی بن گئی۔ مگر جو اصل نقشہ ہے وہ بعینہ وہی ہے جو انجینئر کے دل میں تھا، لباس بدلتے رہے لیکن وطن کے بدلتے رہنے کے باوجود شی ایک ہی رہی۔ اس طرح یہ آیات الٰہیہ اور اعمال صالحہ ہیں یہاں ان کی عمل کی شکل ہے۔ جب وطن بدل جائے گا۔ تو آخرت میں ان کی شکل نعیم مقیم کی بن جائے گی۔

تمثل اعمال کی حقیقت...... تو یہاں یہ جو آپ عمل کررہے ہیں۔ یہ عمل بھاری بھی ہے شاق بھی، مگر صبر وتحمل سے اطاعت کے طور پر انجام دے رہے ہیں۔ یہاں یہ عمل آپ کے سر پر سوار ہے۔ آپ پر بوجھ ہے مگر آخرت میں جائے گا تو آپ کا بوجھ اٹھائے گا۔

آخرت میں حمل ونقل کے قابل بن جائے گا۔ آپ اس پر سوار ہوں گے، بالکل اسی طرح جیسے آپ سفر کرتے ہیں تو ایک چھوٹا سا بستر باندھا اور ایک بکس لیا بکس سر پر رکھا، اور بستر کو بغل میں دابا، بکس بھی آپ کے سر پر سوار ہے اور بستر بھی آپ کے سر پر، تھکتے ہوئے، ہانپتے کانپتے ہوئے آپ جارہے ہیں جب آپ سرائے میں پہنچے تو بستر بچھایا، اب بستر نیچے ہے اور آپ اس کے اوپر اور وہ بکس آپ کے لئے تکیہ بن گیا۔ تو اثناء سفر میں سامان آپ کے اوپر بار تھا اور منزل پر پہنچ کر وہ آپ کے لیے تکیہ بن گیا، بعینہ یہ وہاں کی مثال ہے، یہاں اعمال بھاری ہیں۔ صبر وتحمل کرنا پڑتا ہے، مگر وہاں جا کر یہ عمل ہمارے لئے سواری بن جائے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''سَمِّنُوْا ضَحَايَاكُمْ فَإِنَّهَا عَلَى الصِّرَاطِ مَطَايَاكُمْ'' ''تم قربانیوں کو فربہ کیا کرو کہ یہی تمہارے لئے پل صراط پر سواریاں بنیں گی''۔ ①

تو یہاں قربانی گویا ہمارے پر سوار ہے، بوجھ ہے کہ سینکڑوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد دل کڑھ رہا ہے کہ ایسے محبوب جانور ذبح کر دیا۔ اپنے ہاتھوں سے کانٹ چھانٹ دیا۔ اور وہاں جا کر ہم اس کے اوپر بار ہو جائیں گے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''اَلسَّخَاءُ شَجَرَةٌ فِي الْجَنَّةِ'' ''یہ سخاوت جنت کے اندر ایک درخت کی صورت میں نمایاں ہوگی''۔

جیسے آپ نے سخاوت کی اور کسی غریب کی خبر گیری کی، کسی کو چار پیسے دیدیئے تو وہ آپ کی سخاوت کے زیر سایہ پل رہا ہے۔ سایہ اور راحت بھی ملی، یہی عمل وہاں جا کر درخت بنے گا۔ آپ اس کے پھلوں سے فائدہ اٹھائیں گے تو یہی سخاوت وہاں جا کر درخت کی صورت میں تمثل ہوگئی۔

---

① الحديث اخرجه الديلمي ولفظه: "استفرهوا" علامہ عجلونی فرماتے ہیں: رواه الديلمي بسند ضعيف جداً عن ابى هريرةؓ دیکھئے: كشف الخفاء ج: ١ ص: ١٢١.

اعمال متشکل کب ہوں گے؟......تو حق تعالیٰ قیامت کے دن ہر ایک عمل کو کوئی نہ کوئی صورت دیں گے۔ یہ اعمال متجسد اور متشکل بن جائیں گے اور یہ یوم حشر سے ہی شروع ہو جائے گا حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ عرصات حشر میں قیامت کے میدان میں ہر آدمی کے سامنے دو چیزیں ہوں گی۔ ایک جہنم جس سے ہیبت ناک آوازیں آتی ہوں گی اور ایک اس کے اعمال جو قطار باندھے ہوئے کھڑے ہوں گے۔ عمل کے مناسب ان کو شکلیں دے دی جائیں گی۔ گویاں پوری دنیا مجسم کر کے سامنے کردی جائے گی، ہر ایک آدمی بیٹھا ہوا اپنے کو دیکھے گا کہ میں فلاں برائی کر رہا ہوں۔ سات کوٹھڑیوں کے اندر، فلاں وقت، بعینہ وہی زمانہ، وہی ہیئت ہے۔ وہ زمانہ وہ مکان سب وہاں منتقل کیا جائے گا۔ اسے نظر آئے گا کہ میں اس زمانہ اور مکان میں بیٹھا ہوا اس حرکت میں مشغول ہوں۔ تو یہاں کا زمانہ، مکان ہر عمل اور اس کی ہر ہیئت کذائی بھی وہاں لوٹا دی جائے گی۔

سائنسی دنیا سے تمثیل اجساد کی تصدیق......اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ آج کی سائنس نے تو اسے بالکل آسان کر دیا ہے ہندوستان میں دلی میں ایک نمائش ہوئی، مختلف یورپین ممالک نے اپنے اپنے سٹال لگائے، اور اپنی اپنی ایجادات دکھلائیں۔ روس کی طرف سے ٹیلی ویژن آیا تھا تو اس نمائش میں ہم دیکھنے کے لئے گئے۔ تو ہم نے ان سے کہا کہ کوئی عجیب چیز اپنے روس کی دکھلاؤ۔ اس نے ایک ٹیلی ویژن دکھلایا۔ اس کے بعد اس نے کچھ مشینوں سے اور کام لیا۔ تو ہمیں یوں نظر آیا کہ چین کا ایک جنگل ہے، جس میں عورتیں دھان بو رہی ہیں۔ تو چینی عورتوں کا طریقہ یہ ہے کہ دھان بوتے بوتے کچھ گیت گاتی جاتی ہیں، تو ٹیلی ویژن کے اندر وہ کھیتوں میں دھان لگاتی جاتی ہیں، اور چینی زبان میں ان کی گانے کی آواز بھی آرہی ہے۔ ہم نے واقعی یہ عجیب چیز دیکھی تھی۔ پھر لطف یہ کہ ہم یہ رات کے وقت دیکھ رہے تھے، اور وہاں ظہر کا وقت تھا گویا بارہ ایک بجے ہوں گے، اس میں وہی وقت نظر آتا تھا، ویسی ہی دھوپ پھیلی ہوئی ہے، وہی وقت ہے۔

تو ٹیلی ویژن والوں کو تو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ ایک وقت کو متمثل کر کے دوسرے وقت میں دکھلا دیں۔ عشاء کے وقت میں ظہر کا وقت دکھلا دیں چین کا جنگل ہندوستان میں دکھلا دیں چینی عورتوں کا حرکت کرنا ہمیں نظر آجائے ان کے گانے کی آواز ہم سن سکیں، ایک وقت ایک مکان میں دوسرا وقت اور دوسرا مکان نمایاں کردیں۔ تو اللہ نے انسان کو یہ عقل وقدرت دی ہے تو اللہ کی قدرت کیا ایسا نہیں کرسکتی کہ دنیا کے سارے اعمال اور سارے زمانے اور سارے مکان آخرت میں سب کے سامنے پیش کردے۔ جو اس کو مان سکتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ وہ اسے نہیں مانے گا؟

جو یہاں کی ایجاد کو مانتا ہے وہ وہاں کی ایجاد کو بھی مانے گا، جبکہ یہاں کی ایجاد بھی انسان کی ذاتی نہیں۔ اللہ نے ہی تو عمل اور عقل دیا، جس سے یہ ایسی ایجاد کرتے ہیں تو جس کے دیئے سے ہم اس نہج پر پہنچ گئے، تو جو ان کمالات کا سرچشمہ ہے تو وہ اس سے کہیں زیادہ بنادے تو تعجب کی کونسی بات ہے؟

بہر حال یہ آیتیں، یہ اعمال۔ یہاں عمل کی صورت میں ہیں۔ وہاں جا کر نعیم مقیم اور باغ و بہار کی صورت بن جائے گی۔ ایک آدمی یہاں معاذ اللہ زنا کرتا ہے وہ گویا اپنے بدن سے سانپ اور بچھو لپیٹ رہا ہے مگر یہاں شکل نمایاں نہیں قیامت کے دن شکل نمایاں ہو جائے گی کہ وہ زنا نہیں تھا بلکہ سانپ اور بچھو تھا وہ چوری نہیں تھی بلکہ عذاب تھا۔ جو عذاب الیم وہاں لپیٹا تھا۔ یہاں آ کے وہ شکل بن گئی تھوڑے عرصہ میں شکل سامنے آ جائے گی۔

سردیوں میں بعض بچوں کو گڑ کھانے کی عادت ہوتی ہے اور اگر زمینداروں کا گھر ہو تو وہاں گڑ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں اور بچے کھاتے رہتے ہیں۔ ماں باپ روکتے ہیں کہ بھئی گرمی کرے گا، مگر چوں کہ مٹھاس ہوتی ہے، مزہ آتا ہے تو رکتے نہیں تو وہ انہوں نے پانچ مہینے کھایا اور خوب کھاتے رہے مگر جب گرمی کا موسم آیا اب وہ پھوٹ پھوٹ کر نکلنا شروع ہوا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں اور پیپ بہنے لگی۔ اب والد علاج کراتے کراتے تنگ آ گیا کہیں مرہم لگا رہا ہے۔ کہیں مصفیات پلا رہا ہے اور کہتا ہے کہ بچے! اسی دن کے لئے تو میں روکتا تھا کہ گرمی میں پھوٹ کر نکلے گا۔ تو یہی گڑ وہاں اس کی شکل مٹھاس کی تھی اور یہاں اس کی شکل پھوڑے کی ہوگئی تھوڑا سا موسم بدل گیا تو آثار ظاہر ہو گئے۔

آج جو بدعملی یہاں کی جا رہی ہے۔ وہ یہاں عمل کی شکل ہے، لیکن تھوڑا سا وقفہ گزرنے کے بعد جب موت کو پار کر کے آدمی قیامت میں پہنچے گا۔ وہی عذاب الیم کی صورت میں پھوٹ پھوٹ کر بدن سے نکلے گی۔ جو یہاں نکلا تھا، وہ وہاں سامنے آ جائے گا۔

جتنے بھی اعمال ہیں یہ محض سطحی نہیں ہیں بلکہ انسانی نفس ان کو نگلتا ہے اور جزو بدن بناتا ہے۔ نیکی ہو یا بدی جب جزو نفس بن گئیں تو جب اس میدان میں پہنچے گا تو وہی چیزیں جو جزو بدن بنالی تھیں نفس سے وہ نکل گئیں اور اللہ تعالیٰ اندر سے نمایاں کر دیں گے عمل کو۔ اور باہر سے بھی عمل کو مجسم بنا کر حجت تمام کریں گے۔

صحیح بخاری کے اوّل و آخر کی نسبت...... بہر حال امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابتداء میں عمل کا پہلا سرا بتلا دیا کہ: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ کہ نیت صحیح کرو تا کہ عمل صحیح ہو گویا: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ تو ایک اصول و کلیہ ہے کہ ہر چیز نیت سے معتبر ہوگی۔ شرعی وجود اور شرعی ثواب نیت حسنہ سے ہوگا۔ اب ہم اس کلیہ سے نفع کس طرح اٹھائیں تو انتفاع کے لئے دوسرا جملہ رکھا: وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوٰی آدمی جو نیت کرے گا اس کو وہی پھل ملے گا۔ محض اصول کے درجے میں بات نہیں رہ جائے گی بلکہ عمل کے میدان میں یا ضرر اٹھائے گا۔ یا نفع، تو یہ دوسرا اصول ہے، انتفاع کے لحاظ سے وہ اصول ہے عقلی اور کلی، کوئی آدمی کرے یا نہ کرے وہ اصول اپنی جگہ ہے اور جب کرے گا تو وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوٰی اب اس سے منتفع ہونے کا وقت آیا۔ تو یہ اصول درحقیقت عمل ہی ہے اور پہلا اصول نظری۔

اس کے بعد تیسری مثال جزوی دی کہ: ''فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوْ اِلَى امْرَاَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ.'' تو ایک

جزوی مثال۔ایک عملی اصول، ایک نظری اصول۔ یہ تینوں اس حدیث میں جمع کر دیئے گئے اور مجموعہ سے یہ بات نکلی کہ عمل بغیر نیت کے ہوتا ہی نہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔حتیٰ کہ اگر دنیا میں کوئی مجرم ہو تو بعض گورنمنٹ کا قانون بھی کہتا ہے اور وکیل بھی کہتا ہے کہ حالات کا تقاضہ ہے کہ اس کی نیت بری نہیں تھی، باقی عمل سرزد ہو گیا تو وہاں تو مدار ہی نیت پر ہے۔ اللہ کی حکومت میں تو اصل باطن ہی کو دیکھا جاتا ہے تو اس حدیث میں تین چیزیں بیان فرما دیں اور عمل کا مبداء بیان کر دیا۔ اور دوسری حدیث میں کلمات ارشاد فرمائے۔ اخیر میں کہ وہ ثمرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر نتیجہ کیا نکلے گا؟ تو اسے ظاہر فرمادیا کہ: ''كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ'' ''یہ دو کلمے ایسے ہیں کہ زبان پر ہلکے اور میزانِ عمل میں بھاری ہیں''۔

میں ہنسی میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں، کبھی آپ نے یہ پاپڑ تو کھائے ہوں گے باریک باریک بنتے ہیں، کبھی موم کے کبھی ویسے، تو میں کہا کرتا ہوں کہ: ''خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ''

زبان پر ہلکے مگر معدے میں گئے تو بھاری ہو جاتے ہیں۔ گڑبڑ پیدا کرتے ہیں تو یہ مادی غذاؤں میں اس کا مصداق ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمالِ شریعت میں یہ کلمات وہ ہین کہ زبان پر ہلکے، ادائیگی میں کوئی دشواری نہیں اور نہ ان میں وقت لگے، اور میزان کو دیکھو تو وہ پُر ہو جاتی ہے اجر و ثواب سے۔

تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صنعت سے مبداء بھی بیان کر دیا اور منتہا بھی، مصدر بھی اور مظہر بھی۔ اس واسطے میں نے یہ دو روایتیں پڑھیں کیوں کہ یہ مجلس وعظ اور تقریر کی نہ تھی درس کی تھی۔

تو ان دو احادیث کا کچھ ترجمہ پیش کر دیا اور اصل جو علوم ہیں اور کمالات ہیں، وہ تو ہمارے مولانا (حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مرحوم) ہی آپ کے سامنے بیان فرماویں گے۔ اور علماء ہی کا بیان کا حق ہے۔ میں نے تو چند باتیں طالب علمانہ عرض کر دیں کہ تعمیل حکم کے بغیر چارہ نہ تھا۔

دعاء......اب امید ہے کہ آپ حضرات میرے لئے بھی دعاء فرمائیں گے۔ اپنے لئے بھی اور حضرت مولانا (عبدالحق مرحوم) کے لئے بھی دعا فرماویں گے کہ، جن کی وجہ سے یہ ساری بہار قائم ہے اور یہ باغ و بہار آپ کے سامنے ہے، اور دارالعلوم دیوبند کے لیے بھی دعا فرماویں گے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ایک مادرِ علمی بنا دیا ہے وہاں سے یہ سب گل کھل رہے ہیں اور یہ پھل پھول نکل کر سامنے آ رہے ہیں حق تعالیٰ ہم سب کا انجام بخیر فرماوے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.